روسی ادب

۲

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۲۴

روسی ادب

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

اُستاد جامعۂ ملیہ اسلامیہ

دوسرا حصّہ

شایع کردہ

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۰ء

نئی مطبوعات

اضافیت یہ کتاب ڈاکٹر محمد رضی الدّین صدیقی صاحب پروفیسر ریاضیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی، جنھیں اس سال نوبل پرائز ملا ہے، تصنیف ہے - اِس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہے - جس نظریہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے سمجھنے والے دنیا میں صرف دو چار ہیں - اس کی تشریح ایسی سلیس زبان میں کی گئی ہے کہ معمولی ریاضی جاننے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے - ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے - قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲ار

معمارِ اعظم - یہ یورپ کے بلند پایہ ڈراما نگار ابسن کے نہایت ممتاز ڈرامے "ماسٹر بلڈرز" کا ترجمہ ہے - جس میں مصنف نے نفسیاتی نکات کے بیان کرنے میں بڑا کمال دکھایا ہے - اور جو بقول پروفیسر فرانسس بُل "جہاں تک بنیادی امور، اس کے مقصد اور بنی نوعِ انسان کے متعلق اس کے تصوّر کا تعلق ہے یہ ڈراما وقت اور مقام کی قیود سے آزاد ہے - اور دنیا کے دور دراز حصّے میں بھی جہاں انسان بستے ہیں یہ سب کی سمجھ میں آسکتا ہے" عزیز احمد صاحب بی-اے - آنرز (لندن) نے ایسی خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا لُطف آجاتا ہے - قیمت مجلّد ایک روپیہ چار آنے عہ غیر مجلّد بارہ آنے ۱۲ار

ملنے کا پتہ

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۳۴

روسی ادب

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

جامعۂ ملیہ اسلامیہ

دوسرا حصہ

شایع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

۱۹۴۰ء

خاں صاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین

سیاسی تحریکیں، سیاسی تصانیف اور ادبی تنقید

اٹھارویں صدی تک روس اور فرانس کے تعلقات ایسے ہو گئے تھے کہ روس پر فرانسیسی انقلاب کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ روس کی مشہور ملکہ کیتھرین (۱۷۶۲-۱۷۹۶) جس کے عہد کے آخری زمانے میں فرانسیسی انقلاب ہوا، ادب سے بڑی دلچسپی رکھتی تھی، مگر اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ روسی قوم فرانسیسیوں سے بغاوت کے طریقے سیکھے اور اس نے آزاد خیالی کا سر کچلنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ۱۸۰۵ سے ۱۸۱۵ تک فرانس کے شہنشاہ نپولین سے جو لڑائیاں ہوئیں انھوں نے روس میں سیاسی حوصلوں کو دوبارہ زندہ کر دیا اور وہ روسی وطن پرست جن کی جاں بازی نے روس کو نپولین کے پنجے سے بچایا تھا یہ امید کرنے لگے کہ ان کا ایثار قوم کی آزادی کا راستہ صاف کر دے گا۔ نپولین کے خوف نے روسی قوم اور حکومت کے درمیان جو ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا، مگر کامیابی کے بعد زار الکسانڈر اول کے رویے نے روشن خیال روسیوں کو بالکل مایوس کر دیا اور وہ زار کی مدح سرائیوں کی جگہ خفیہ انجمنیں قائم کر کے اپنی آزادی کی

تدبیریں آپ کرنے لگے۔ ان انجمنوں کے ممبر زیادہ تر فوجی افسر تھے اور وہ لوگ جنھوں نے یورپ کی سیر کرکے آزادی کی فضا کا لطف اٹھایا۔

حکومت ان انجمنوں کے خلاف شروع ہی سے کارروائی کرتی تو یہ تحریک اٹھنے ہی نہ پاتی، لیکن زار الکسانڈر نے اصل حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی کچھ کرنا مناسب نہ سمجھا، ان انجمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کی تعلیم اور حوصلوں نے روشن خیال روسیوں کو اپنا گرویدہ کرلیا۔ الکسانڈر کے مرنے پر جب زار نکولائی اول (۱۸۲۵ - ۱۸۵۵) تخت پر بیٹھا جو آزادی اور آزاد خیالی کا کٹر دشمن سمجھا جاتا تھا تو صوبہ یودولیا اور شہر پیٹر برگ کی انجمنوں نے بغاوت کردی۔ باغی صرف ایک مظاہرہ کرکے حکومت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے، انھیں اس کی امید نہ تھی کہ وہ ملک پر قبضہ کرلیں گے اور بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ پانچ باغیوں کو پھانسی اور قریب سو کو ساری عمر کے لیے سائبیریا میں جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ یہ سب کے سب ادب، تہذیب اور اخلاقی بلند آہنگی کے پھول تھے جو کھلنے سے پہلے توڑ لیے گئے اور قومی زندگی کا باغ مدتوں کے لیے بالکل بے رونق ہوگیا۔

اس بغاوت کے بعد جو دسمبر ۱۸۲۵ میں ہوئی اور اس سبب سے ڈیکابرِسْت، یا دسمبری، کہلاتی ہے، جبر اور تشدد کا ایک دور شروع ہوا جو ۱۸۵۵ تک جاری رہا۔ تمام اخباروں اور ہر قسم کی تصانیف کو ان خیالات سے پاک کرنے کے لیے جو حکومت کو مخدوش معلوم ہوتے تھے احتیا

کا ایک محکمہ قایم کیا گیا، ہر اخبار کو ضمانت داخل کرنے کے علاوہ ہر پرچے کو چھپنے سے پہلے دفتر احتساب میں بھیجنا پڑتا تھا، کتابیں بھی اسی وقت چھاپی جاسکتی تھیں جب دفتر احتساب اس کی اجازت دے دے، اور چونکہ احتساب میں کلیسا کو بھی دخل تھا اس لیے صرف وہ کتابیں یا وہ عبارتیں ہی نہیں جو سیاسی نقطۂ نظر سے اشتعال انگیز ثابت کی جاسکتی تھیں بلکہ وہ بھی جن پر بے دینی پھیلانے کا الزام لگایا جاسکتا تھا رد یا خارج کردی جاتیں اور محتسب کو اس کا بھی اختیار تھا کہ عبارتیں حسب مرضی ترمیم کردے۔ مصنفوں کے لیے ایک اور آفت یہ تھی کہ محکمۂ احتساب کا پولیس سے تعلق تھا اور جو اصلاح محتسب کے بس کی نہ ہوتی وہ پولیس کے سپرد کردی جاتی ۱۸۳۵ تک صرف نکولس کی ذات تھی کہ جس نے ادبی ذوق کو زندہ رکھا، مگر اس کا محتسب جیسا کہ بیان ہوچکا ہے، خود بادشاہ تھا اور دربار میں رکھ کر اسے اس طرح پابند اور مجبور کردیا گیا تھا کہ جس سے شاید جلاوطنی بھی بہتر ہوتی۔

اس دور میں جب کہ احتساب اور پولیس آزاد خیالی کا گلا دبائے ہوئے تھی، روسیوں کے غیر ملکوں سے تعلقات قایم رہے، تعلیم اور سیر کے لیے روسی فرانس اور جرمنی جاتے رہے اور فرانسیسی اور جرمن فلسفیوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ بھوکے کو سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی ایک نعمت معلوم ہوتا ہے، تعلیم یافتہ روسیوں میں فلسفے اور تہذیب کے مسائل پر غور اور بحث کرنے کا شوق پھیلا اور مباحثوں کے لیے مختلف حلقے قایم ہوئے جن میں

ستان کیے وچ (۱۸۱۷ - ۱۸۷۰) کا حلقہ بہت مشہور رہا ۔ ہاکو بن، ہرزن، بیلن سکی اور ان کے علاوہ اور بہت سے نوجوان جنھوں نے سیاست اور ادب میں نام پیدا کیا سب اس حلقے میں شامل تھے اور یہیں کے مباحثوں میں ان کے خیالات کی تشکیل ہوئی ۔ بعض خصوصاً طالب علموں کے حلقے ایسے تھے جن میں فرانس کی اشتراکی تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا، روس کے سیاسی مسائل پر آزادی کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوتا اور روس کو آزاد کرنے کی تدبیریں سوچی جاتیں ۔ ہرزن اور شاعر او گاریوف ایسے ایک حلقے کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور جب پولیس کو اس کا پتہ لگ گیا تو حلقے کے تمام اراکین کو پکڑ کر سخت سزائیں دی گئیں ۔ لیکن سزاؤں کے باوجود طالب علموں کے حلقے بنتے رہے، معاشی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر بحثیں ہوتی رہیں ۔ انشا پردازوں کو سزا کے خوف نے اپنی بات صاف صاف نہیں کہنے دی، یا محکمۂ احتساب نے ان کی تصانیف کو رد کر دیا، یا ان کی صورت بگاڑ دی، بہتیرے ایسے ہی تھے جنھوں نے چند سال کسی قید خانے میں گزارے مگر ادب نے وہ شمع کبھی بجھنے نہ دی جو جوانی کے ولولے جلاتے تھے ۔

۱۸۲۵ کی سزاؤں نے بارہ تیرہ برس تک روسیوں کو سہمائے رکھا، پھر ماسکو کے ایک اخبار "دوربین" میں چادائف (۱۷۹۳ - ۱۸۵۵) کا ایک خط چھپا جس نے تعلیم یافتہ لوگوں میں ہل چل مچادی ۔ چادائف نے لکھا تھا کہ "دنیا میں بس ہماری قوم ایک ایسی ہو کہ جس نے دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچایا نہ

دوسروں سے کچھ حاصل کیا، ہم نے انسانیت کے علمی خزانے میں ایک نئے خیال کا اضافہ نہیں کیا، انسانی عقل کو ترقی دینے میں ہم نے ذرا بھی مدد نہیں دی اور دوسروں کی حاصل کی ہوئی علم اور عقل کی دولت جو ہمارے ہاتھ لگی اس کی بھی ہم نے مٹی پلید کی۔۔۔ ہمارے خون میں کوئی مادّہ ہے جو ہم کو تہذیبی اثرات کا دشمن بنا دیتا ہے، ہم دنیا میں ناجائز اولاد کی طرح بھیجے گئے ہیں۔۔۔ ہماری نشو ونما ہوتی ہے مگر ہم پختگی سے محروم رہتے ہیں۔۔۔ ہم آگے بڑھتے ہیں مگر ہمارے قدم ٹیڑھے پڑتے ہیں، ہمارا سفر کسی منزل کی طرف نہیں ہوتا۔۔۔" چادائف یورپ میں ایک عرصے تک رہا اور وہاں کے بہترین عالموں کی صحبت میں بیٹھا تھا، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اسے روس کی حالت ایسی گری ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر بھی چادائف کا خیال تھا کہ اگر روسی کیتھلک رومی کلیسا کا مذہب اختیار کرکے عیسائی ملّت میں پورے طور پر شامل ہو جائیں تو ان کا مستقبل اتنا تاریک نہ ہوگا۔ اس خیال سے اتفاق کرنے والے بہت کم تھے، مگر چادائف نے جو الزام اپنی قوم پر لگائے تھے ان سے وطن پرست اور روشن خیال روسیوں نے بہت اثر لیا اور اس پر عام طور سے غور کیا جانے لگا کہ روس کی تاریخ سے کیا سبق حاصل کیا جا سکتا ہے اور آئندہ کے لیے روسی قوم کا مسلک کیا ہونا چاہیے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ روسی تاریخ کی خصوصیات کیا ہیں اور اس میں کون سے ایسے ادارے، قاعدے یا اصول ملتے ہیں جن کی بدولت روسی معاشرت نے

ایک خاص شکل پائی، جن کے سانچے میں روسی ذہنیت ڈھالی گئی۔ یہ معلوم کر لیا جاتا تو پھر طے کرنا تھا کہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لیے کیا کیا لازمی ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جائے۔ ۱۸۵۵ تک تو ان مسائل پر بحث کرنا صرف خاص حلقوں میں ممکن تھا، کیوں کہ تصنیف تالیف پر محکمۂ احتساب کو پورا اختیار تھا، اخبار وہی چل سکتے تھے جو اس محکمے کو راضی رکھنے کے لیے لغویات میں پڑے رہیں اور رسالے بھی سیاسی اور تاریخی مسائل سے دور بھاگتے تھے۔ اس کے باوجود غور و فکر کا ایسا چرچا رہا کہ ۱۸۵۰ تک ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں دو بڑی پارٹیاں بن گئی تھیں، جو "یورپ دوست" اور "سلاف دوست" کے ناموں سے مشہور ہوئیں۔

ان پارٹیوں کی بنا عقیدوں سے زیادہ رجحانات پر تھی اور اس طرح جو لوگ کسی ایک پارٹی میں شامل سمجھے جاتے تھے ان کے درمیان بھی خاصا اختلاف تھا۔ "یورپ دوست" وہ تمام لوگ تھے جو یورپی تہذیب سے اثر لینا اور یورپ کے سیاسی اور معاشی تصوروں اور تجربوں کے سبق لینا روس کی ترقی کے لیے لازمی سمجھتے تھے، کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ فطرتاً روسی یورپ کی قوموں سے مختلف نہیں اور انھیں بھی ان منزلوں کو طے کرنا ہوگا جن سے یورپ کی ترقی یافتہ قومیں گزر چکی ہیں۔ چنانچہ اس پارٹی میں انتہا پسند اشتراکی تھے اور وہ اشتراکیت کی تعلیم روس میں پھیلانا چاہتے تھے، جو میانہ روی کے قائل تھے وہ روس میں جمہوریت کا چراغ روشن کرنا، عام رائے پیدا کرنا اور قوم سے آپ اپنی اصلاح کرانا چاہتے تھے

بعضے اس پارٹی میں ایسے بھی تھے جو ریاست اور حکومت کی ہر طرح سے حمایت اور فرماں برداری کرتے تھے، اس خیال سے کہ ان کی قوم تہذیب سے بالکل ناآشنا تھی اور صرف حکومت ہی اسے اس لایق بنا سکتی تھی کہ وہ یورپی قوموں کی پیروی کر سکے۔ اسی طرح "سلاف دوستوں" میں اگرچہ یہ بات عام طور سے مانی جاتی تھی کہ روسی قوم ایک نرالی فطرت رکھتی ہے تو بعض یہ کہتے تھے کہ وہ تمام قوموں سے زیادہ آزاد ہے اور چونکہ وہ تاریخ کی رو سے کسی خاص سیاسی اور سماجی نظام کی پابند نہیں، وہ اپنی قومی زندگی کو جو شکل چاہے دے سکتی ہے، بعض کہتے تھے کہ نہیں، یہ خیال بالکل غلط ہے، قدیم روس میں ایسے تصورات اور اداروں کا پتہ چلتا ہے کہ جنھیں دوبارہ زندہ کیا جائے تو روس میں ایک ایسا نظام قایم کیا جا سکتا ہے جو یورپی قوموں کی تنظیم سے اصولاً بہتر اور بہت زیادہ پائدار ہوگا۔ بعضے ایسے بھی تھے جو زاری حکومت، بازنطینی کلیسا اور ان دونوں کی دل سے اطاعت کرنے والی روسی قوم کو بذاتِ خود مایۂ ناز سمجھتے تھے اور ان کی دعا تھی کہ روس یورپ کی تقلید اور آزادی اور آزاد خیالی کی وبا سے محفوظ رہے۔

"یورپ دوست" فرقے کے لوگ روس کی وحشی طبیعتوں اور غیر شائستہ زندگی پر افسوس کرتے تھے اور ان میں جو انشا پرداز اور ادیب تھے وہ بھی اپنی شکایتیں اور اپنے درد کو بیان کر کے رہ گئے۔ یورپ دوست ناول نویسوں میں ایوان تورگینیف (۱۸۱۸-۱۸۸۳) پیسم سکی (۱۸۲۰-۱۸۸۱) شیدرِین (۱۸۲۶-۱۸۸۹) سب سے زیادہ ممتاز ہیں، شاعروں میں

نکراسوف (۱۸۲۱-۱۸۷۷) اور اوگاریوف (۱۸۱۳-۱۸۷۷)۔ لیکن ان لوگوں کی قدر ادیب ہونے کے سبب سے تھی، روس کے نوجوانوں پر کہیں زیادہ اثر ان لوگوں کا تھا جنھیں ادبی شہرت حاصل کرنے کی نہیں بلکہ اپنے خیالات کے پرچار کی فکر تھی، ہرزین (۱۸۱۲-۱۸۷۰) باکونن (۱۸۱۴-۱۸۷۶) لافروف (۱۸۲۷-۱۹۰۱) چرنی شفسکی (۱۸۲۸-۱۸۸۹) اور پسارف (۱۸۴۰-۱۸۶۸)

ہرزن کو شروع جوانی سے سیاسی معاملات سے دلچسپی تھی اور ۱۸۳۴ میں وہ انقلاب پسند نوجوانوں کے ایک حلقے کے رکن ہونے کی سزا میں چھ سال کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس سزا کو بھگتنے کے فوراً بعد ہی وہ ایک ادنیٰ عہدے پر مامور کر کے ماسکو سے نوف گورود بھیج دیا گیا، مگر اس نے عہدے سے استعفے دے کر انشا پردازی کی مشق شروع کر دی۔ پہلے اس نے فلسفیانہ مسائل پر ایک کتاب لکھی اور پھر دو ناول، جن کے عنوان "کس کی خطا ہے؟" اور "ڈاکٹر کروپوف" تھے اور جن میں چند رسموں پر اعتراض کیے گئے تھے۔ ناول شایع ہونے کے دو سال کے بعد ہرزن نے روس چھوڑ دیا اور باقی عمر انگلستان، فرانس اور سوستان میں گزاری۔

شروع میں ہرزن سلاف دوستی کی طرف مائل ضرور تھا اور اپنی ایک کتاب میں اس نے پیشین گوئی کی کہ یورپ کو بہت جلد زوال آنے والا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ باکونن اور یورپی اشتراکیوں کا اثر اس کی سلاف دوستی پر غالب آگیا اور وہ بھی اشتراکی اور یورپ دوست

بن گیا۔ ۱۸۵۲ میں، جب اس نے مستقل طور پر لندن میں رہنے کا ارادہ کرلیا تھا، اس نے "قطب" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اسی میں اپنی سرگزشت "زمانہ اور خیالات" کے عنوان سے شایع کی۔ ہرزن کی ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں سے جان پہچان تھی، دنیا کی اونچ نیچ بھی اس نے خوب دیکھی تھی، زبان میں اسے بڑا ملکہ تھا، اس لیے اس کی یہ تصنیف دل چسپ واقعات، کیرکٹروں اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ایک کارنامہ مانی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ میں ہرزن نے ایک ہفتہ وار رسالہ "گھنٹی" کسانوں کو آزاد کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی اس میں حصہ لینے اور اسے تقویت پہنچانے کے لیے جاری کیا۔ ہرزن کا ایک دوست (اور مشہور ناول نویس تورگینیف کا رشتہ دار) نکولائی تورگینیف جو ایک بڑا رئیس تھا اور دربار اور حکام کے طبقے میں بہت رسوخ رکھتا تھا اسے ایسی خبریں پہنچا دیا کرتا تھا جن کا روسی اخباروں کو پتہ نہ ہوتا تھا اور ہوتا بھی تو وہ انھیں چھاپ نہ سکتے۔ دفتر احتساب اور پولیس کی طرف سے "گھنٹی" کو روس میں بھیجنے اور پڑھنے کی ممانعت تھی، لیکن چوں کہ زار الکساندر دوم (۱۸۵۵-۱۸۸۱) خود روشن خیال آدمی تھا، پولیس کی سختیاں اس زمانے میں ذرا کم ہو گئی تھیں اور ہرزن کا اخبار بہت چلا۔ لیکن جب ۱۸۶۱ میں کسان آزاد کر دیے گئے تو لوگوں کی توجہ ختم ہو گئی، ہرزن اخبار کے پڑھنے والوں کو اشتراکی تعلیم کی طرف مائل نہ کرسکا اور جب ۱۸۶۳ میں پولینڈ میں بغاوت ہوئی اور ہرزن نے

باغیوں کا ساتھ دیا تو اس کے پرچے کی اشاعت قریب قریب بند ہو گئی اور لوگ خود ہرٹسن کو بھی بھول گئے۔

ہرٹسن کے حلقے میں نکولائی تورگینیف (۱۸۷۱-۱۷۸۹) میخائل باکونِن (۱۸۷۶-۱۸۱۴) پیوترلا فروف (۱۹۰۱-۱۸۲۳) وہ خاص لوگ تھے جنھوں نے صرف اسے نہیں بلکہ ۱۸۴۰ سے ۱۸۵۰ تک اکثر آزاد خیال روسیوں کو اشتراکیت کے سبق پڑھائے۔ ۱۸۴۰ تک روس کے سمجھ دار لوگ جرمن فلسفے کے پھیر میں پڑے تھے اور اسی سے اپنے سیاسی عقیدے اور معاشرتی تعلیم اخذ کرتے تھے۔ چنانچہ جرمن فلسفی ہیگل کے اس نظریے نے کہ "جو کچھ موجود ہو وہ عقل پر مبنی ہوتا ہے" بیلن سکی جیسے آزادی کے دل دادہ ادیب اور نقاد کو زاری حکومت کا حامی اور فرماں برداری کا مبلغ بنا دیا۔ باکونن بھی ایک عرصے تک اسی قسم کے فلسفیانہ مقولوں کے پھندے میں پھنسا رہا لیکن جب وہ ۱۸۴۲ میں یورپ گیا اور وہاں کی زندگی اپنی آنکھ سے دیکھی تو اس کے خیالات بالکل بدل گئے اور اسی کے سمجھانے سے اس کے دوست احباب بھی مجرد تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر حقیقت سے روشناس ہوئے۔ مگر باکونن نکولائی تورگینیف اور لافروف کا اثر ان کے اپنے ملک میں بہت کم رہا اس لیے کہ وہ خود زیادہ تر غیر ملکوں میں رہے اور ۱۸۵۰ کے بعد روس کے آزاد خیال لوگ اشتراکیت کی طرف اس قدر مائل نہیں ہوئے جتنے کہ "منکریت" کی طرف۔

"منکریت" محض انکار کا مسلک تھا، کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ "منکر"

یہ کہتے تھے کہ سیاسی اور سماجی مسائل میں جذبات کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جسے علم اور سائنس صحیح بتائیں۔ اس لیے "منکر" مذہب، رسم ورواج، اخلاقی اصولوں اور اس معاشرتی نظام کو جو ایک نسل سے دوسری کو ورثے میں ملتا ہے تسلیم نہیں کرتے تھے اور قدامت پسندی کے جذبے کو صدمے پہنچانے میں انھیں خاص مزہ آتا تھا لیکن یہ منکریت کا صرف ایک پہلو تھا اور اس کو لوگ مذاق اڑا کر ختم کر دیتے اگر منکر ساتھ ساتھ خدمت اور ایثار، جوش اور مستعدی کی سینکڑوں اعلیٰ اور قابلِ رشک مثالیں نہ پیش کرتے۔ ان کے فرقے میں زیادہ تعداد نوجوان مردوں اور عورتوں کی تھی جنھوں نے سائنس یا طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور منکریت اصل میں حوصلہ مند اور کار پرداز نوجوانوں کی بغاوت تھی ایک عام بے حسی کے خلاف جس نے قدامت پسندی اور اخلاق کی آڑ لے کر ریاست کو جبر کرنے اور اپنے فرائضِ منصبی کو نظر انداز کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

"منکروں" کے فرقے نے اسی سال سر اٹھایا جب کہ زار الکساندر کی طرف سے کسانوں کو آزاد کرنے کا حکم جاری ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کسانوں میں آزادی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرنے کے لیے پانچ چھ سال تک "منکروں" نے ان میں گھل مل کر بہت کام کیا تھا اور کسانوں کو جو آزادی دی گئی تھی وہ ان حوصلوں کے مقابلے میں بہت بے حقیقت معلوم ہوتی تھی جو "منکروں" اور بعض مقاموں پر کسانوں کے دلوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ زار الکساندر کی دین کا شکریہ ادا کرنے کی جگہ کئی ضلعوں میں کسانوں نے

منکروں کی اشتعال انگیز تعلیم سے اثر لے کر بغاوت کر دی، ریاست کا ظلم اور تشدد اسی نسبت سے بڑھ گیا اور ۱۸۸۱ تک منکروں اور حکومت کے درمیان کھلم کھلا لڑائی ہوتی رہی۔ ریاست نے ہزاروں نوجوانوں کو قید یا جلاوطن کیا، سینکڑوں کو پھانسی پر لٹکایا اور منکر اس کے جواب میں حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کو موقع پا کر قتل کرتے رہے۔ انتہا یہ ہوئی کہ ویرا زاسولچ، ایک نوجوان عورت نے ماسکو کے گورنر کو مارا اور ۱۸۸۱ میں خود زار الکسانڈر کو ایک "منکر" نے قتل کر دیا۔ اس کارنامے کے بعد "منکریت" کی تحریک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ حکومت کو تو "منکر" سدھار نہ سکے، لیکن جوش اور ایثار کی انھوں نے ایسی روشن مثالیں چھوڑیں کہ مخالفوں کے سر بھی ان کے سامنے ادب سے جھک گئے اور اس نئی زندگی کے لیے میدان تیار ہو گیا جو ۱۹۱۷ کے انقلاب میں رونما ہوئی۔

یورپ دوست فرقے نے جو اشتراکی اور منکر پیدا کیے ان کے جواب میں "سلاف دوست" فرقے کے پاس کچھ بھی دکھانے کو نہیں۔ اس کے ممتاز نمائندوں نے یا تو تاریخ کا مطالعہ کیا یا قوم کو اپنی فطرت سمجھنے میں مدد پہنچائی اور ان کا عمل یہاں تک محدود رہا کہ تاریخ کے مطالعے یا روسی فطرت کے مشاہدے سے جو اصول قائم کیے جائیں ان کا سیاست میں پورا لحاظ رکھا جائے۔ کیریئیفسکی (۱۸۰۶-۱۸۵۶)، خومیاکوف (۱۸۰۴-۱۸۶۰) اور کونستانتین اکساکوف (۱۸۱۷-۱۸۶۰) کی کوششوں سے

فائدہ اُٹھا کر سرگے ئی سولوفیوف (۱۸۲۰-۱۸۷۹) اور کوستومار وف (۱۸۱۷-۱۸۸۵) نے روس میں تاریخ نویسی کو کمال تک پہنچایا اور ایک گم نام داستان کو قومی زندگی کی تعمیر کا ایک ذریعہ بنایا۔ دوسری طرف سلاف دوستوں نے اس بیگانگی کو دور کرنے کی بھی بڑی کوشش کی جو پیٹر اعظم کی اصلاحوں کے بعد عوام اور تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔

تنقید

سیاسی تحریکوں کی تحت میں تنقید کا ذکر کرنا بظاہر مناسب نہیں معلوم ہوتا، لیکن روس میں تنقید کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے سیاسی اور معاشی تعلیمات کو اپنا معیار مانا، اور اس طرح ادب کو سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کا خادم بنانے کی کوشش میں لگی رہی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انشا پردازی کے سوا خیالات ظاہر کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اگر ادیب کو محض ایک فن کا ماہر مان لیا جاتا اور اس سے سیاسی اور معاشرتی مسائل میں قوم کی رہبری کرنے کی امید نہ رکھی جاتی تو اصلاح کا دروازہ ہی بند ہوجاتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روسی نقاد شاعروں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کی خمخصی زندگی قوم کے سامنے اخلاق کا اچھا نمونہ نہیں پیش کرتی، یا ناول نویسوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی عقیدے غلط اور مضر ہیں اور تنقید کے اس اصول کو سب مانتے ہیں، چاہے نقاد کی رائے سے اختلاف کریں۔ روس میں ایسے انشا پرداز ہوئے ہیں

جن کا قوم میں بہت چرچا رہا مگر نقادوں نے انھیں بالکل نظر انداز کیا، اس لیے کہ انھوں نے کوئی سیاسی یا اخلاقی نظریے پیش نہیں کیے تھے اور ایسے انشا پرداز بھی ہوئے ہیں جنھیں نقادوں نے بہت سراہا مگر وہ پڑھنے والوں میں کبھی مقبول نہ ہوئے، اس لیے کہ ان میں ادبی خوبیاں بہت کم تھیں۔ نقاد اپنے مسلک پر قایم رہے، اس لیے کہ وہ تنقید کے بہانے سے معاشرتی مسئلوں پر بحث کرنا چاہتے تھے، پڑھنے والے اپنے مسلک پر چلے، کہ انھیں اچھی کتابوں سے مطلب تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نقاد اپنی الاپتے رہے اور پڑھنے والوں نے جو چاہا پڑھا۔ نقاد خود بھی اچھے ادیب تھے اور اگر کسی شاعر یا ناول نویس کے بارے میں ان کی رائے نہ مانی جاتی تب بھی ان کے مضامین شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ان سے اثر بھی لیا جاتا تھا، اس لیے کہ سیاسیات اور اخلاقیات میں معلموں کے فرائض وہی انجام دیتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ ہر دور کی ذہنیت اور مذاق کا پتہ ہمیں اس نقاد کے خیالات سے چل جاتا ہے جو اس دور میں سب پر حاوی رہا۔ روس کا پہلا نقاد وینے ویتوف (۱۸۰۵ - ۲۷ ۱۸) خود ایک شاعر تھا جس کی قبل از وقت موت نے روسی ادب کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد نجیشردِن (۱۸۰۴ - ۱۸۵۶) ایک عالم اور فلسفی نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور پولیووئی (۱۷۹۶ ۱۸۴۶) نے ۱۸۳۰ میں ایک اخبار جاری کرکے جو ریاست کے اثر سے بالکل آزاد تھا، آنے والے نقادوں کے لیے میدان تیار کر دیا۔ روسی ادیبوں پر

جس نقطۂ نظر سے تنقید کی جاتی رہی وہ بھی سب سے پہلے وینے ویتوف کے مضامین میں ملتا ہے، یعنی اس نے بہترین یورپی شاعروں کے کلام کو سامنے رکھ کر پشکن پر یہ اعتراض کیا کہ اس کا کلام ان بلند خیالات اور حوصلہ پیدا کرنے والی صفتوں سے خالی ہے جو ایک سچے قومی شاعر میں ہونا چاہییں۔ نجیژدن اور پولیوو ے بھی وینے ویتوف کی طرح یورپی شاعری کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے اور چاہے اپنے زمانے کے ادیبوں کے متعلق ان کی رائے صحیح نہ ہو، انھوں نے روسیوں کے سامنے ایک معیار رکھ دیا جو ادیبوں اور ان کے قدر دانوں کو بھٹکنے سے کچھ نہ کچھ روکتا ضرور تھا۔ ۱۸۳۴ سے ۱۸۴۸ تک روسی تنقید کی باگ ڈور بیے لن سکی کے ہاتھ میں رہی، پھر ۱۸۶۳ تک چرنی شف سکی اور ددبرولیوبوف، جو منکریت کی طرف مائل تھے اس کی رہبری کرتے رہے، ان کے بعد پانچ سال تک پسارف کا دور دورہ رہا اور پھر صدی کے آخر تک میخائلوف سکی کے خیالات کا رنگ تنقید پر چڑھا رہا۔

بیے لن سکی روس کے ایک دور افتادہ صوبے میں پیدا ہوا مگر اس کے باپ کے دل میں تعلیم کی اتنی قدر تھی کہ مفلسی کے باوجود بیے لن سکی کو بہت اچھی تعلیم دلائی۔ ۱۸۳۲ میں بیے لن سکی پیٹر برگ کی یونیورسٹی سے ایک اشتعال انگیز ڈراما لکھنے کی بنا پر نکال دیا گیا اور چونکہ اسے انشا پردازی کا شوق تھا، اس نے اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے روس میں اس وقت جرمن فلسفے کا بڑا چرچا تھا اور بیے لن سکی کے ابتدائی زمانے

کے مضامین اسی کے رنگ میں ڈوبے تھے۔ لیکن گوگول کی تصانیف پڑھنے سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر فلسفے کی جگہ زندگی اس کا معیار بن گیا۔ اس معیار نے اسے نومشق انشا پردازوں کا قبلہ بنا دیا اور اس طرح بیے لن سکی نے ادب اور ادیبوں دونوں کی بڑی خدمت کی۔ ۱۸۳۶ سے مرتے دم تک وہ روس کی ادبی دنیا کا بادشاہ مانا جاتا تھا، اور وہ مضامین جن کی بدولت وہ حکمرانی کرتا تھا واضح بڑی شان کے ہوتے تھے اور ان سے وہ خلوص اور ہمدردی ٹپکتی تھی جو اصلاح بھی کرتی ہے اور بناتی بھی ہے۔

چرنی شف سکی (۱۸۲۸-۱۸۸۹) کی زندگی کا مرکز ادب اور آرٹ کے سچّے معیار کی جستجو تھی اور اسی کی تلاش میں وہ عقلیت اور اشتراکیت کا معتقد ہو گیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم ختم کرنے کے چند سال بعد ہی اس نے تین چار کتابیں لکھیں جن میں تنقید کے معیار پر بحث کی گئی تھی اور جمالیات کا ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے خیالات کا چرچا اسی وقت سے ہوا جب اس نے ۱۸۵۵ میں "ہم عصر" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ "ہم عصر" کا ہرٹسن کے اخبار "گھنٹی" سے کچھ کم اثر نہیں تھا اور اس کی قدر اس وجہ سے اور بھی کی جاتی تھی کہ اس میں ادب پر بہت اچھے مضمون نکلتے تھے۔ ۱۸۶۳ میں چرنی شف سکی قید کر دیا گیا اور قید خانے میں اس نے ایک کتاب "اب کیا کرنا ہے" کے عنوان سے لکھی جو روسی نوجوانوں کو اس کا آخری پیغام تھا۔ ادب میں اس تصنیف کا کوئی خاص مرتبہ نہیں، لیکن نوجوانوں کو ایسی ہی کتاب کی ضرورت

تھی اور اسے نوجوانوں میں ایک عرصے تک ایک الہامی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ اس اعتبار سے یہ تصنیف روس کے بہترین ادبی کارناموں سے بازی لے گئی۔

"اب کیا کرنا ہے" میں چرنی شف سکی نے ناول کے پیرائے میں اپنے سیاسی و سماجی عقیدے بیان کیے، فرانسیسی اشتراکی فوریئے کے دل فریب خوابوں کی تعبیر کی، اور ایک سچے منکر کا خاکہ کھینچا۔ یہ گویا اس کی اپنی تعلیم تھی، نقاد کی حیثیت سے جن اصولوں پر وہ چلا وہ اس نے اپنی تصانیف میں سے ایک میں بیان کیے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ادیب اور آرٹسٹ کی دلی آرزو ہونا چاہیے کہ زندگی کے مسائل کو سمجھے اور سمجھائے اور اپنے فن کے ذریعے لوگوں کو بہتر زندگی کا گرویدہ کرے۔ چرنی شف سکی کی نظر میں وہ تصانیف کوئی قدر نہیں رکھتی تھیں جن میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح مضمر نہ ہو۔ دوبرولیوبوف (۱۸۳۶ ۱۸۶۱) اور پیسارف عقیدے کے لحاظ سے چرنی شف سکی کے ہم خیال تھے لیکن دوبرولیوبوف یہ نہیں مانتا تھا کہ آرٹسٹ کو ماحول کی ضروریات کا اس قدر پابند کیا جا سکتا ہے جتنا کہ عالم یا مدبر کو، کیوں کہ آرٹسٹ کی تخلیقی قوت کو عمل میں آنے کے لیے آزادی چاہیے۔ پیسارف (۱۸۴۰ ۱۸۶۸) کو اخلاقیات سے زیادہ دلچسپی تھی اور اس کا اثر اس کے خیالات سے زیادہ اس کی شخصیت کی وجہ سے ہوا۔ پیسارف کے دل میں آرٹ کی کوئی خاص قدر نہیں تھی، وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کو ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو

حقیقت کو مضبوط پکڑ سکتے ہوں مگر بہتر دنیا کے خواب بھی دیکھتے رہیں۔ اگر آرٹسٹ ہوں تو گوئٹے جیسے ہوں، نہیں تو نہ ہوں۔

لیسارف کے بعد صدی کے آخر تک میخائلوف سکی کا دور دورہ رہا میخائلوف سکی کو زیادہ شوق فلسفے سے تھا اور اس زمانے کی تنقید زیادہ تر فلسفیانہ عقائد کے ماتحت رہی۔ فلسفے کا یہ نیا شوق ترقی کی علامت نہیں تھی بلکہ اس مایوسی کا عکس تھا جو منکریت کے زوال کے ساتھ پھیلتی گئی اور جس کے کالے بادلوں اور جس کو انقلاب کی طوفانی ہواؤں نے آکر دور کیا۔ اس زمانے میں، جب کہ خاص انقلابی فرقوں کے سوا سب بہتر زندگی کے اصولوں کو چھوڑ چکے تھے، بعض نقاد، جن میں مرژ کوف سکی (۱۸۶۶ء) سب سے ممتاز ہے روس کے ادبی مشاہیر کا مطالعہ کرکے ان کو پورے طور پر سمجھنے اور ان کے خیالات کی صحیح تشریح کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس اعتبار سے مرژ کوف سکی نے ایک نیا معیار پیش کیا جس میں ادب کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔ لیکن تنقید کے اس اصول نے زیادہ رواج نہیں پایا۔

روسی ناول

پہلا باب

نکولائی وسیل یوپح گوگول (۱۸۰۹-۱۸۵)

روسی انشا پردازی کی پہلی کوششوں کا ذکر ایک گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ گوگول کی تصانیف میں روسی ناول اور ڈراما پہلی مرتبہ اپنی مخصوص اور دلفریب شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت تک روسی ادیب یورپی مذاق کی پیروی کرتے رہے تھے، گوگول نے ہمّت سے کام لے کر اپنی بات اپنے انداز سے کہی اور تعلیم یافتہ روسیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے زمانے میں رومانیت کا اثر زائل نہیں ہوا تھا پشکن کے قصّے اور اکثر نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، اس کی ایک جھلک تورگینیف کے افسانوں میں بھی ملتی ہے، لیکن گوگول کے افسانوں میں اس کی بو بھی نہیں۔ تربیت اور مذاق کے اعتبار سے وہ ٹھیٹھ دیسی آدمی تھا اور بعد کی زندگی بھی اس کی طبیعت کو بدل نہ سکی۔ وہ صوبہ اوکرائن کے ایک گانو میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوسک نسل کا ایک چھوٹا زمیندار تھا، اور اس کا بچپن ایک ایسی فضا میں گزرا جس پر پُرانی کوسک

وضع اور فلسفۂ زندگی کا اثر اس وقت تک نمایاں تھا۔ گوگول کی ذہنیت اس دیہاتی کی سی تھی جو شہری زندگی کی نفاستوں سے مرعوب نہیں ہوتا، اسکول اور کالج میں اس کی آزاد خود مختار اور مغرور طبیعت نے اس کی تعلیم میں بہت خلل ڈالا۔ اکثر مضمون جو پڑھائے جاتے تھے اسے ناپسند تھے، یونانی اور رومن ادب کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور جرمن اور فرانسیسی انشا پردازی کی بھی اس کے دل میں زیادہ عزت نہیں تھی اس لیے اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، عام معیار کے لحاظ سے اس کی تعلیم خراب رہی، لیکن اس خرابی کا نتیجہ اچھا نکلا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ناولیں، افسانے اور ڈرامے لکھنا شروع کر دیے۔ اور یہ مشق آگے چل کر بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر پیٹر برگ پہنچا اور وہاں اُسے وزیر زراعت کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ لیکن اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایک طریقے پر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ دو سال کے اندر اس نے ملازمت ترک کر دی اور یورپ کا سفر کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا، مگر آدھے راستے سے واپس آگیا۔ اس کی تعلیم کی طرح اُس کے اس سفر کا نامکمل رہ جانا بھی اس کی ذہنی آزادی کی علامت تھی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا کیونکہ اگر وہ یورپ جاتا تو ممکن ہے اپنے خلقی ذوق اور آزادی کو وہیں چھوڑ آتا۔ سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے انشا پردازی کا شغل اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا اور ۱۸۳۱ء میں اس کی پہلی کامیاب تصنیف شایع ہوئی جس کا عنوان

"جکا نکا کے قریب ایک باڑی میں سنی ہوئی کہانیاں" تھا۔ افسانوں کے اس مجموعے نے گوگول کو مشہور کر دیا، کیونکہ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جنھوں نے گوگول کو روسی ادب میں اس کے بلند درجے پر پہنچایا ہے۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، ان افسانوں میں دیہاتی زندگی کے قصّے سنائے گئے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک جدّت تھی، مگر ان افسانوں کے اور اوصاف کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ صفت معلوم ہوتی ہے۔ گوگول نے اوکرائن کے مناظرِ قدرت کی نہایت دل کش تصویریں کھینچی ہیں، اسے زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اس کی باریک بیں نظر اس کا نازک احساس اور اس کی ہمدردی بھری ظرافت اپنا پورا کمال دکھا سکی۔ اس کے افسانوں میں مافوق الفطرت قوتوں کا اکثر ذکر آتا ہے، ان میں بھوت پریت، چڑیلیں اور شیطان بے تکلفی سے انسانی زندگی میں شریک ہوتے ہوئے اور مداخلت کرتے دکھائے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا رہنا سہنا اور فلسفۂ زندگی بیان کیا گیا ہے، وہ ان سب چیزوں کو مانتے تھے اور اس عقیدے کو ان کے کردار سے بہت گہرا تعلق تھا اس لیے در اصل بھوت پریت کے ذکر سے افسانوں کی حقیقت نگاری پر حرف نہیں آتا۔ گوگول کی طبیعت میں دیہاتی فضا اور دیہاتی لوگوں کی سرشت کے ہر رنگ اور ہر کیفیت کے سمجھنے کی وجدانی قوت تھی، اس کی زبان کی شستگی، شیرینی اور روانی پڑھنے والے کے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔

"اوکرائن کی رات دیکھیے۔ بیچ آسمان سے چاند زمین کو تک رہا ہے۔

آسمان کا گنبد جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں، معلوم ہوتا ہی پھیل کر اور وسیع ہو گیا ہی، اور اب گرم ہی اور سانسیں بھر رہا ہی۔ ساری زمین پر سیمیں روشنی چھٹکی ہوئی ہی، پُرتاثیر ہوا میں خنکی ہی، وہ آدمی کو گلے مل کر بھیجتی ہی، اس کی رفتار متوالی ہی اور خوشبوؤں کے سمندر کو جنبش دیتی ہی۔ جانفزا رات! مسحور کن رات! جنگل کسی روحانی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ساکت کھڑے ہیں، اندھیرے میں پیٹے ہیں اور اپنے سائے سے دور دور تک اندھیرا پھیلا رہے ہیں، تالاب خاموش اور ساکن ہیں، ان کی سطح پر ایک لہر تک نہیں، ان کے پانی کی ٹھنڈک اور تاریکی باغوں کی سیاہی مائل سبز دیواروں میں قید ہی اور قید ہونے سے کچھ اُداس ہو گئی ہی، جنگلی پھلوں کی گھنی جھاڑیاں جن میں کسی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ہی ڈرتی ڈرتی اپنی جڑوں کو چشمے کے ٹھنڈے دھارے کی طرف پھیلاتی ہیں اور ان کی پتیاں چپکے سے کچھ کہتی ہیں، ایسے لہجے میں جس سے ناراضگی اور خفگی ظاہر ہوتی ہی، جب رات کی ہوا کا کوئی شریر جھونکا آہستہ آہستہ آتا ہی اور آنکھ بچا کر ان کا بوسہ لے لیتا ہی۔ ساری زمین پر نیند طاری ہی، مگر آسمان پر چاند اور تارے سب آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں اور اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ انسان کی روح میں اس وقت عجیب وسعت پیدا ہو جاتی ہی اور اس کی تہ سے ہزار ہا چاندی کی طرح چمکتے ہوئے خیالی پیکر نکل کر دنیا کو آباد کر دیتے ہیں۔ جانفزا رات! مسحور کن رات! یکبارگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہی اور جنگل اور تالاب اور میدان سب جاگ اُٹھتے ہیں، ہر طرف سے اُمڈ آئی بلبلوں کے نغموں کی

بارش ہونے لگتی ہو اور خیال ہوتا ہو کہ چاند تک ان کے سُریلے راگوں کو محویت سے سُن رہا ہو...... ٹیلے پر گانو اونگھ رہا ہو، جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ چاندنی میں اس کے جھونپڑے چمکتے ہیں اور رات کے ساتھ اُن کی چمک بڑھتی جاتی ہو...... گانو والے سب جی بھر کر گیت گا چکے ہیں، اب ہر طرف خاموشی ہو، بھلے آدمی سب سو گئے ہیں، صرف کہیں کہیں تنگ کھڑکیوں میں چراغ کی روشنی نظر آتی ہو یا کسی گھرانے کے لوگ جنھیں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو دروازے کے باہر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے ہیں...... "

یہ منظر "مئی کی رات" سے لیا گیا ہو، جو اس مجموعے کا ایک افسانہ ہو۔ اسی افسانے کے دو اشخاص سراپا ملاحظہ ہو، ایک گانو کا مُکھیا ہو، دوسرا شراب ساز جو گانو میں شراب کا کارخانہ قایم کرنے کے لیے آیا ہو۔

" مُکھیا کے ماتھے پر ہمیشہ بل رہتے ہیں، اس کا چہرہ روکھا ہو، وہ زیادہ بک بک پسند نہیں کرتا، بہت زمانہ ہوا.... جب اللہ بخشے ملکہ کیتھرین دارالسلطنت سے کریمیا جا رہی تھیں تو وہ ان کے ہمراہ بوڈی گارڈ کے طور پر جانے کے لیے اپنے گانو والوں میں سے منتخب کیا گیا تھا اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے سے مُکھیا نے عقلمندی اور اہمیت کے احساس سے سر جھکانا، اپنی لمبی اور جھکی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دینا اور ہر چیز کو ترچھی، شکرے کی سی تیز نظر سے دیکھنا سیکھا۔ اسی زمانے سے مُکھیا میں اس کی قابلیت پیدا ہو گئی کہ چاہے جس مسئلہ پر گفتگو ہو وہ باتوں کو ایر پھیر کر اپنی اس داستان کی طرف لے آئے کہ وہ ملکہ

کی ہمراہی کے لیے کس طرح سے منتخب ہوا، اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف کیونکر حاصل ہوا۔ مکھیا کو کبھی کبھی بہرا بننے میں مزا آتا ہی، خصوصاً جب اسے ایسی باتیں سُنائی جاتی ہیں جنھیں وہ سُننا نہیں چاہتا ہی۔ مکھیا لباس میں کسی قسم کا بانکپن برداشت نہیں کر سکتا...... مکھیا رنڈوا ہی، مگر اس کے گھر میں اس کی سالی رہتی ہی، جس کا کام دونوں وقت کھانا پکانا، بھینس دھونا، مکان پر سفیدی کرنا، کپڑوں کے لیے سوت کاتنا اور گھر گرستی کی دیکھ بھال کرنا ہی۔ گانو میں مشہور ہی کہ مکھیا سے اس کی کوئی عزیزداری نہیں، لیکن ہم کو معلوم ہی کہ مکھیا کے بہت سے بدخواہ ہیں، جو ہر قسم کی افواہ خوشی سے پھیلانے پر تیار رہتے ہیں...... یہ بھی ممکن ہی لوگوں کو بات بنانے کا موقع اس وجہ سے ملا ہو کہ مکھیا کی سالی کو ہمیشہ بُرا لگتا ہی، اگر مکھیا کسی ایسے کھیت میں چلا جاتا ہی جہاں گانو کی عورتیں کام کرتی ہیں، یا ایسے کوسک سے ملنے جلنے جاتا ہی جس کے گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہی۔ مکھیا کانا ہی، مگر اس کی اکیلی آنکھ بڑی شریر ہی اور دور سے خوبصورت عورت کو پہچان لیتی ہی۔ ہاں، مگر وہ خوبصورت چہرے کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اچھی طرح اِدھر اُدھر دیکھ لیتا ہی، کہ کہیں اس کی سالی کی نظر تو اس پر نہیں پڑ رہی ہی......"

شراب ساز مکھیا کے یہاں مہمان آیا ہی۔ ایک ٹھنگنا، موٹا سا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی ہیں، غالباً اس خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے جو اُسے اپنا چھوٹا سا پائپ پینے میں ہوتی ہی۔ وہ ہر

وقت تھوکتا رہتا ہی اور اس کے ساتھ ہی انگلی سے پائپ میں تمباکو کی راکھ دباتا جاتا ہی۔ دھوئیں کے بادل اس کے منھ اور اس کے پائپ سے نکل کر ہر طرف چھا گئے ہیں اور خود اسے بھی سُرمئی رنگ کے کہرے نے لپیٹ لیا ہی۔ معلوم ہوتا ہی کسی شراب کے کارخانے کا دود دان جو چھت پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہی، سیر کے شوق میں نکلا ہی اور مکھیا کے گھر میں آکر ادب سے میز کے پاس بیٹھ گیا ہی۔ شراب ساز کی ناک کے نیچے اس کی گھنی اور چھوٹی مونچھیں ہیں، جن کے سارے بال کھڑے ہیں، لیکن پائپ کے دھوئیں میں وہ بہت دھندلی نظر آرہی ہیں اور خیال ہوتا ہی وہ مونچھیں نہیں ہیں بلکہ ایک چوہا جسے شراب ساز منہ میں دبائے ہوئے ہی......"

"باڑی میں سنی ہوئی کہانیوں" کے بعد ہی گوگول نے ایک مجموعہ "میر گورود" کے عنوان سے شایع کیا۔ میرگورود نام ہی پولتاوا کے پاس ایک گانو کا جس میں گوگول پیدا ہوا تھا، اس مجموعے میں گوگول کی انشاپردازی کی خوبیاں اور نکھر آئیں اور اس میں ظرافت کے ساتھ درد ہی جو پہلے مجموعے میں نہیں پایا جاتا۔ ایک آنکھ سے ہنسنا، ایک سے رونا، گوگول کی انشاپردازی اور حقیقت نگاری کا خاص وصف ہی اور اس مجموعے میں یہ وصف اپنی پوری شان سے نظر آتا ہی۔ لیکن گوگول کی طبیعت نہ معلوم کس وجہ سے ناول نویسی سے ہٹ گئی اور اس نے روس کو چک[1] کی تاریخ لکھنے کا ارادہ

---

[1] روس کا جنوب مغربی حصہ جس میں "چھوٹے" روسیوں کی نسل آباد ہی "چھوٹے" اور "بڑے" روسیوں میں قد کے علاوہ سیرت اور مزاج کا بھی کچھ فرق ہی۔ "چھوٹا" روسی فطرتاً ہنس مکھ ہوتا ہی "بڑا" روسی غمگین اور یاس مشرب۔

کر کے قدیم کتابوں اور تاریخی داستانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اس میں مورخ بننے کی صلاحیت بہت کم تھی اور اس کے مطالعے کا پہلا نتیجہ "تراس بلبا" ایک تاریخی ناول کی صورت میں نکلا۔ ناول کی تاریخی بنیاد بہت کمزور رہی، کبھی کبھی مصنف بھول جاتا ہے کہ اسے زیر بحث زمانے کے ذہنی معیار کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اس لیے بعض تقریریں جو ناول کے اشخاص کرتے ہیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں، مگر رزمیہ داستان کی حیثیت سے ناول نہایت قابلِ قدر ہے اور کوسک نسل کی مردانگی، بہادری، جفاکشی اور سادگی کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں بہت ہی ہمت افزا اور سبق آموز ہیں۔ ایک بوڑھے باپ کا اپنے بیٹوں کی طاقت آزمائی کے لیے ان سے کشتی لڑنا، اس کے ایک لڑکے کا شائستگی اور نفاست پسندی کی تحقیر کرنے کے لیے بہت اچھے کپڑے پہن کر زمین میں لوٹنا، اس ماں کے دل کی کیفیت جو اپنے بچوں کی ہمت اور جواں مردی پر فخر کرتی ہے مگر دل سے خوف اور اندیشہ نہیں نکال سکتی ہے۔ یہ سب پہلے صفحوں ہی میں بیان کیا گیا ہے اور سارے ناول میں یہ فضا قایم رہتی ہے۔ "تراس بلبا" کی تصنیف کے بعد گوگول کا تاریخی مطالعہ کچھ دن جاری رہا، مگر روس کو جب کی تاریخ محض خیال ہی کی صورت میں رہی چند مضامین کی بنا پر جو بظاہر بہت عالمانہ تھے گوگول کو تاریخ کے پروفیسر کی جگہ مل گئی، مگر اس کے علم کا سارا سرمایہ پہلے لکچر میں ختم ہو گیا اور تقرر کے ڈیڑھ سال بعد اسے مجبوراً استعفا دینا پڑا۔

اس کے بعد پھر گوگول نے عالم فاضل سمجھے جانے کی ہوس نہیں کی

اور ناول نویسی میں مشغول ہوگیا۔ دو تین سال کے اندر اس نے "گل کاریوں اور کہانیوں" کے عنوان سے افسانوں کا تیسرا مجموعہ شایع کیا جس کے بہترین قصّے " پرانی وضع کے زمیندار" " ادان اوان کی لڑائی" "نفسکی پروسپکٹ" اور "لبادہ" ہیں۔

"پرانی وضع کے زمیندار" ایک بڈھے اور بڑھیا افناسی ئی اوانووچ اور پلخیریا اوانوفنا کی کہانی ہے۔ دونوں چین سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے اور ساری دنیا سے خوش تھے۔ لیکن اگر زندگی کے معنی حرکت اور تغیر ہیں تو وہ دونوں جوانی میں بھی "زندگی" کی نعمت سے محروم تھے۔ گوگول کو ان سے بہت محبت ہے۔ ان کے سفید بالوں سے اور ان کے معصوم دلوں سے مگر ان کی تصویر کھینچنے میں اس کا اصل مقصد روسیوں کی ذہنی بے مائگی اور ان کی زندگی کا جمود دکھانا ہے اور اسی لحاظ سے یہ افسانہ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ افناسی اوانووچ دن بھر کھاتے رہتے ہیں، ان کی بیوی پلخیریا اوانوفنا کا دن میٹھے اچار اور مربے تیار کرتے گزرتا ہے، گفتگو بھی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے البتہ "کبھی کبھی آسمان صاف، دن اُجالا اور کمرے خوب گرم ہوتے تو افناسی اوانووچ کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور وہ پلخیریا اوانوفنا کو چھیڑتے ہیں ...."

"پلخیریا اوانوفنا، اگر ہمارے گھر میں ایک بارگی آگ لگ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

"اُی لو۔ خدا نہ کرے!" بڑی بی کہتی ہیں اور صلیب کا نشان بناتی ہیں۔

"پھر بھی، فرض کرو کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تو ہم کہاں بھاگ کر جائیں گے؟"

"خدا جانے آپ کیا کہ رہے ہیں، افناسی ادانووچ! یہ کیسے ہو سکتا ہی کہ ہمارے گھر میں آگ لگ جائے؟ خدا کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا"

"پھر بھی اگر سب کچھ جل گیا"

"گھر سب جل جائے تو میں باورچی خانہ میں چلی جاؤں گی اور آپ اس کمرے میں جہاں چوکیدارنی رہتی ہی"

"اگر باورچی خانہ میں آگ لگ گئی اور سب جل گیا"

"لو اور سنو! خدا ہمیں ایسی مصیبت سے بچائے کہ گھر میں آگ لگ جائے اور باورچی خانے میں بھی، اگر ایسا ہوا تو ہم گودام میں جا کر رہیں گے، جب تک دوسرا مکان نہ بن جائے"

"اور اگر گودام میں بھی آگ لگ گئی؟"

"خدا جانے آپ کیا کہ رہے ہیں، بس اب میں بہت سن چکی، ایسی باتیں کرنا گناہ ہی، ایسی باتوں کی خدا کے یہاں سے سزا ملتی ہی!"

افناسی ادانووچ، اس بات سے خوش ہو کر کہ انھوں نے پلخیریا ادانوفنا کا مذاق اُڑایا ہی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہے۔

ایسی زندگی کا انجام بھی مناسب ہوا: پلخیریا ادانوفنا کی بلّی کھو گئی، کچھ دنوں کے بعد انھیں اسی طرح کی بلّی باغ میں دکھائی دی۔

اور وہ اسے چمکار پکار کر گھر ساتھ لائیں اور پیالہ بھر دودھ اُس کے سامنے پینے کے لیے رکھ دیا، مگر جیسے ہی اُنھوں نے اس کی پیٹھ سہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا بلّی زن سے کھڑکی سے کود کر نکل بھاگی۔ پلخیریا اوانوفنا کو یقین ہو گیا کہ در اصل یہ ایک بلّی نہیں تھی بلکہ ان کی موت جو بلّی کی شکل میں آئی تھی، اُنھوں نے گھر کا سب سامان ٹھیک کیا، افناسی ئی اوانووچ کے لیے اتنے مربّے اور اچار تیار کر دیے کہ وہ برسوں تک کھاتے رہیں اور یہ وصیت کی کہ ان کا کفن ململ کا ہو، اس لیے کہ وہ سستا ہی اور اسی کا ساجو دوسرا کپڑا رکھا ہی اس کی افناسیؔ اوانووچ کے لیے عبا تیار کرائی جائے۔ یہ وصیت کرنے کے کچھ دنوں بعد وہ مرگئیں۔ افناسئی اوانووچ چار پانچ سال اور زندہ رہے اور پھر خوشی خوشی اپنی پلخیریا اوانوفنا سے ملاقات کے لیے چل دیے۔

" ایوان اوان کی لڑائی" عام روسی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہی۔ دو اوسط درجے کے زمیندار ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے بگڑ جاتے ہیں۔ ان میں صلح کرانے کی بہت کوشش کی جاتی ہی، دونو چاہتے ہیں کہ پھر آپس میں دوستی ہو جائے، مگر عین اس وقت جب وہ بغل گیری کے لیے تیار ہوتے ہیں تو ذرا سی بات پر لڑائی ہو جاتی ہی اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

" نفسکئی پراسپکٹ" میں گوگول نے روسی شہر کی ایک دردناک داستان سُنائی ہی۔ دو نوجوان، ایک فوجی افسر، اور دوسرا مصور جن کی

آپس میں جان پہچان تھی، پیٹر برگ کی مشہور سڑک نفسکئی پراسپکٹ پر چلے جارہے تھے۔ ان کے سامنے سے دو عورتیں گزریں، جو نہایت حسین تھیں، ان میں سے ایک کے بال سیاہ تھے، دوسری کے سنہرے' فوجی افسر نے سنہرے بالوں والی کا پیچھا کیا، مصور نے سیاہ بالوں کا، محض اس ارادے سے کہ اِس کے مکان کی شان وشوکت دیکھے، کیوں کہ بظاہر وہ بہت امیر معلوم ہوتی تھی، لیکن وہ ایک معمولی طوائف نکلی، مصور کی بھولی معصوم طبیعت، جس پر اس عورت کے حُسن کا بہت اثر ہوا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور چند دنوں میں وہ ایک نازک پھول کی طرح کمھلاکر مر گیا۔ جس عورت کے فراق میں فوجی افسر گیا تھا وہ ایک جرمن موچی کی بیوی تھی۔ افسر نے بہت کوشش کی کہ اس سے آشنائی ہوجائے، مگر کامیاب نہ ہؤا، اور آخر کار جب جرمن موچی نے اسے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا دیکھا تو اپنے دوست کی مدد سے اسے اُٹھاکر دروازے کے باہر پھینک دیا۔ فوجی افسر ایسا بے حیا تھا کہ اس بے عزّتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہؤا، اور دوسرے دن وہ اسے بالکل بھول گیا

"نفسکئی پراسپکٹ" گوگول کے عام طرز سے جُدا ہے، مگر اس میں بھی اس کی باریک بینی اور ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ صبح سے شام تک جو مختلف قسم کے لوگ نفسکئی پراسپکٹ پر سے گزرتے ہیں ان کے اوصاف نہایت مفصل اور دلچسپ طریقے پر دکھائے گئے ہیں، جرمن موچی، جو اپنی ناک کٹوا ڈالنا چاہتا ہے، کیونکہ ناک کی وجہ سے اس کی

ناس لینے کی عادت پڑگئی ہی اور ناس خریدنے میں اس کا بہت روپیہ صرف ہوتا ہی، گوگول کے بہترین مضحک کیرکٹروں میں سے ہی۔

اس وقت تک گوگول کے تصور نے جو خیالی پیکر بنائے تھے، وہ روسیوں کے سچے نمونے تھے، لیکن وہ کیرکٹر جس کے ہم شکل روسی ناولوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جسے عام رائے نے روسی تمدن کی مخصوص پیداوار قرار دیا ہی پہلی بار گوگول کے افسانے "لبادے" میں اپنی صورت دکھاتا ہی۔ "لبادے" کا ہیرو اکاکیٔ اکاکیئے وِچ ایک مضحک مگر سیدھا سادا اور مسکین آدمی ہی، جسے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ کہہ اُٹھتے ہیں: "دیکھو بچارے غریب کو!" اکاکیٔ اکاکیئے وِچ ایک دفتر میں نوکر ہی، جہاں اسے زیادہ تر کاغذات اور خطوط نقل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اس کام سے اس کا جی نہیں گھبراتا، بلکہ اسے اس میں خاص لطف آتا ہی، کیونکہ اسے خوش نویسی کا شوق ہی اور اس کام میں اسے خوش نویسی کا بہت موقع ملتا ہی۔ خطوط اور کاغذات نقل کرنے کا کام اس کے لیے ہجوم لطف اور رنگا رنگ احساسات کا ایک عالم تھا۔ ایک خاص قسم کے خط اسے بہت ہی پسند تھے۔ اگر انھیں دوبارہ لکھنا ہوتا تو اسے دلی مسرت ہوتی۔ لیکن "شوق" اور "لطف" کے الفاظ اکاکیٔ اکاکیئے وِچ کے صحیح جذبات ادا نہیں کرسکتے، اسے اپنے کام سے حقیقی عشق ہی، اس کی ساری امیدیں ارمان اور تمنائیں اسی سے وابستہ ہیں، زندگی کا کوئی مزہ نہیں جو اسے اس کام میں حاصل نہ ہوتا ہو۔ لیکن اکاکیٔ اکاکیئے وِچ کا جسم ذرا کمزور ہی،

جاڑوں میں اسے سردی بہت لگتی ہے، اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک لبادہ خریدے اور رفتہ رفتہ خطاط ہونے کے علاوہ ایک نئے لبادے کا مالک بننا بھی اس کی دلی آرزوؤں میں شامل ہو جاتا ہے۔ کئی سال تک تھوڑا تھوڑا روپیہ اکھٹا کرکے وہ آخر کار ایک نیا لبادہ خریدتا ہے، مگر آسمان کا ظلم دیکھیے کہ اکاکئی اکاکئے وچ کا لبادہ پہلے ہی دن چوری جاتا ہے۔ اس کا دل ایسا سخت صدمہ برداشت نہیں کرسکتا، وہ بے چارہ مرجاتا ہے، اور بھوت بن کر شہر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔

عموماً دنیا اکاکئے وچ جیسے بچارے غریبوں پر ہنستی ہے اور اس کی ہنسی حقارت بھری ہوتی ہے، روسی حقیقت نگار اپنی قوم کے نمونوں کی صورت اور سیرت کے تمام پہلو کمال وضاحت اور باریک بینی سے دکھاتے ہیں، مگر اپنے تعصبات اور رجحانات کو اس طرح سے معطل کر دیتے ہیں کہ ان کی صورت گری میں حقیقت کا منظر دکھانے کے سوا اور کوئی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں ہوتا، ہم ان کے کیرکٹروں کو ان کی نظر سے نہیں، اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ہمارے دلوں پر وہ اثر نہیں ہوتا جو حقیقت نگار پیدا کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جو خود بخود پیدا ہوتا، اگر ہم ایسی ہستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اکاکئے وچ جیسے لوگوں سے ہمیں پہلے الجھن ہوتی ہے، پھر ان پر غصہ آتا ہے اور آخر کار اگر ہم کو انسانی ہمدردی چھو بھی گئی ہے، تو ہم کو ان پر ترس آتا ہے اور دل محبت کے درد سے بھر آتا ہے گوگول کی بحیثیت انسان کے یہی کیفیت تھی، لیکن بحیثیت آرٹسٹ اور مصور کے اس نے

بچارے اکاکئے وِچ پر رحم کھاکر یا اس سے خفا ہو کر کسی قسم کا مبالغہ یا غلط بیانی جائز نہیں رکھی۔ وہ ایک آنکھ سے اکاکئے وِچ پر ہنستا ہے، اس لیے کہ اکاکیے وِچ کے مضحک ہونے میں کوئی شک نہیں اور ایک آنکھ سے روتا ہے، اس لیے کہ اکاکئے وِچ بھی انسان ہے اور ہمدردی کا مستحق۔ جذبات کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر اس طرح روکنا خواہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہو، حقیقت نگاری کا تقاضا تھا کہ کاکئے وِچ جیسے لوگ ہرگز نظر انداز نہ کیے جائیں۔ روس میں اکاکئے وِچ جیسے 'بیچاروں' کے وجود کا سب نے گوگول کا افسانہ پڑھتے ہی اعتراف کیا، بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روس کے اکثر باشندوں میں اکاکئے وِچ کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہے۔ چنانچہ افسانہ پڑھ کر گوگول کے معاصرین میں سے کسی نے لکھا: ''ہم سب گوگول کے ''لبادے'' سے نکلے ہیں''۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہر روشن خیال روسی 'بچارے' اکاکئے وِچ سے مشابہت محسوس کرتا تھا، بے کسی نے اسے بھی اکاکئے وِچ کی طرح مضحک اور مسکین اور قابلِ رحم بنا دیا تھا اور تقدیر اس کے اور اس کی تمناؤں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرتی تھی، جیسا اس نے اکاکئے وِچ کے ساتھ کیا۔

''گل کاریوں اور کہانیوں'' کے بعد گوگول نے دو ڈرامے لکھے ''انسپکٹر جنرل'' اور ''شادی''۔ ان میں مضحک کیرکٹروں کی کوئی انتہا نہیں، لیکن ان میں بھی وہی لاشخصی انداز نمایاں ہے جو گوگول نے اکاکئے وِچ کی صورت گری میں اختیار کیا تھا اور ان موقعوں پر بھی جب گوگول ہمیں ہنسی سے

بے چین کر دیتا ہے، انسانی ہمدردی آنسوؤں یا آہوں کی شکل میں اپنا خراج وصول کر لیتی ہے۔" انسپکٹر جنرل" کے کیرکٹر مضحک ہونے کے علاوہ معند اور بددیانت بھی ہیں اور گوگول نے ڈراما محض ان کا مذاق اُڑانے کے لیے نہیں بلکہ اس غرض سے بھی لکھا تھا کہ قوم سرکاری ملازموں کی رشوت خوری اور بے ایمانیوں سے آگاہ ہو، مگر مصور کے کمال نے مصلح کے خیالات پر بالکل پردہ ڈال دیا اور ریاست کی بدنظمی پر خفا ہونے کے بجائے ہم کو ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی پر ترس آتا ہے جو فطرتاً ایک خاص طرح کا چال چلن اختیار کرنے پر مجبور ہیں اور اپنی صفائی کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ بالکل مسخرے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک شہر کے سرکاری عہدہ داروں کو پتہ لگتا ہے کہ دارالسلطنت سے ایک خاص افسران کا کام جانچنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے، کیونکہ ان لوگوں کی مرکزی حکومت تک بہت سی شکایتیں پہنچی ہیں۔ شہر کے تمام عہدہ دار یہ خبر سُن کر گھبرا جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے، سب بڑے رشوت خور ہیں اور تمام شہر والے ان کی حرکتوں سے بہت نالاں ہیں، اس لیے سب کو یقین ہے کہ اگر واقعی انسپکٹر جنرل بھیجا گیا تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئے گا اور بدحواسی میں وہ ایک آوارہ نوجوان کو جو اتفاق سے شہر کے ایک ادنیٰ ہوٹل میں آکر ٹھیر گیا ہے، انسپکٹر جنرل سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نوجوان جسے روپے کی سخت ضرورت تھی

تقدیر کے اس کھیل سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اور خوب دعوتیں کھا کر اور روپیہ وصول کر کے اپنا رستہ لیتا ہے۔ آخر میں ان سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان انسپکٹر جنرل نہیں تھا، کوئی معمولی لفنگا تھا اور اسی وقت کوئی سپاہی آکر اطلاع دیتا ہے کہ انسپکٹر جنرل آیا ہے اور اس نے سب کو طلب کیا ہے۔

جعلی انسپکٹر جنرل کے آنے کا منظر نہایت دلچسپ ہے۔ صدر میونسپلٹی کو خبر ہوتی ہے کہ مدار السلطنت سے ایک بڑا افسر آنے والا ہے، وہ تمام بڑے عہدے داروں کو بلا بھیجتا ہے اور انھیں یہ خبر سنا دیتا ہے۔ سب کے سب بہت پریشان ہوتے ہیں، مگر چونکہ سب پر یکساں گرفت ہو سکتی ہے، اس لیے ایک دوسرے کو تنبیہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ صدر میونسپلٹی ہچکچا کر منصف سے کہتا ہے:۔

"آپ کی کچہری کے برآمدے میں، جہاں لوگ عموماً عرضیاں لے کر آتے ہیں، اردلیوں نے بطخوں کے بچے پال رکھے ہیں، جو ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے ہیں اور پیروں تلے آجاتے ہیں۔ گھر گرستی کرنا ہر شخص کے لیے قابلِ تعریف بات ہے تو اردلیوں کے لیے کیوں نہ ہو، مگر بھئی ایسی جگہ پر تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا......"

منصف فوراً جواب دیتا ہے:۔

"میں ان سب کو آج ہی باورچی خانے پکڑ بھجواتا ہوں، آپ کا جی چاہے تو آج میرے یہاں کھانا کھائیے۔"

صدر میونسپلٹی چند اور بے قاعدگیوں کی طرف توجہ دلا کر کہتا ہے:۔

"...... اسی طرح آپ کا اسیسر... یوں تو وہ آدمی خاصا ہوشیار ہے، مگر اس کے منہ سے ایسی بو آتی ہے، معلوم ہوتا ہے، سیدھا کسی شراب کے کارخانے سے آرہا ہے۔ یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں..... اگر یہ بدبو واقعی کوئی پیدائشی مرض ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، تو اسے سمجھائیے، پیاز یا لہسن یا کوئی اور دوا کھائیے......"

لیکن اس معاملے میں منصف کا بس نہیں چل سکتا:۔

"نہیں، اب یہ بدبو نہیں مٹ سکتی، وہ کہتا ہے بچپن میں اس کی دائی کے چوٹ لگ گئی تھی اور تب سے اس کے منہ سے کچھ وودکا کی بو آنے لگی ہے۔"

اس ناکامی سے صدر میونسپلٹی کی اصلاحی کوششوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، وہ تمام افسروں کو فلسفیانہ طرز پر ان کی خاص کمزوری سے آگاہ کرتا ہے:۔

"...... عجیب بات ہے، ایسا کوئی آدمی ہی نہیں، جس کے سر کوئی گناہ نہ ہو، خدا ہی نے دنیا کو ایسا بنایا ہے...."

منصف سمجھتا ہے کہ اس کی رشوت خوری کی طرف اشارہ ہے اور بگڑ کر کہتا ہے کہ گناہ گناہ میں فرق ہے، "میں سب سے کھلم کھلا کہتا ہوں کہ میں رشوت لیتا ہوں، مگر کیسی رشوت؟ شکاری کتے کے بچے یہ کچھ اور ہی چیز ہے۔"

پھر صدر میونسپلٹی ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جن کے ماتحت

اسکول اور اوقاف اور خیرات خانے ہیں۔

"..... آپ کو استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیے،

وہ بڑے لایق لوگ ہیں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

مگر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، جو ممکن ہے علم و فضل کے ساتھ لازمی

ہوں۔ مثلاً استادوں میں سے ایک جس کا چہرہ کچھ پھولا سا ہے... کبھی

اپنی کرسی پر بیٹھ ہی نہیں سکتا، بغیر اس طرح (منہ بنا کر) منہ بنائے ہوئے

اور پھر وہ حلق کے پاس ہاتھ لے جا کر اپنی ڈاڑھی کو انگلیوں سے باہر کی

طرف پھینکتا ہے۔ اگر وہ صرف طالب علموں کا اس طرح منہ چڑھاتے تو

کوئی بات نہیں...... لیکن آپ خود غور کیجیے، اگر وہ کسی شخص کا جو

اسکول کا معائنہ کرنے آیا ہو اس طرح منہ چڑھائے تو اس کا نتیجہ بہت

بُرا ہو سکتا ہے، ممکن ہے انسپکٹر جنرل یا کوئی اور اس بات کو اپنی رپورٹ

میں درج کر دے۔ خدا جانے پھر اس کا کیا انجام ہو...... مجھے آپ کو

استاد تاریخ کی طرف بھی توجہ دلانا ہے..... میں نے ایک مرتبہ ان کا

لکچر سنا تھا...... جب انھوں نے اسکندر اعظم کا ذکر شروع کیا تو خدا

جانے انھیں کیا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر ایک کرسی

اُٹھائی اور پوری طاقت سے اسے زمین پر دے مارا۔ میں نے مانا

اسکندر اعظم بڑا بہادر تھا، مگر آخر کرسیاں کیوں توڑی جائیں؟ اس سے

تو خزانے کا نقصان ہوتا ہے....."

اس مجمع میں پوسٹ ماسٹر بھی شریک ہو جاتا ہے۔ صدر میونسپلٹی

الگ لے جاکر اس سے کہتا ہے کہ فی الحال تمام خط کھول کر دیکھ لیا کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت ڈاک کے ذریعے سے دارالسلطنت نہ بھیجی جا سکے۔ پوسٹ ماسٹر جواب دیتا ہے کہ اسے یہ باتیں سکھانے کی ضرورت نہیں، اسے خود خط پڑھنے کا بہت شوق ہے، اور اگر کوئی خط اسے خاص طور سے پسند آتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بار بار پڑھا کرتا ہے..... یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دو حضرات جن کا کام شہر بھر میں خبریں سننا اور سنانا ہے دوڑے ہوئے آتے ہیں، اور خبر دیتے ہیں کہ انھیں فلاں ہوٹل میں ایک آدمی نظر آیا ہے، جو دارالسلطنت سے آیا ہے اور انسپکٹر جنرل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔

صدر میونسپلٹی فوراً ہوٹل پہنچتا ہے۔ نوجوان لفنگے کی پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ کس غلط فہمی میں ہیں تو انھیں اچھی طرح سے لوٹتا ہے۔ آخر کار پوسٹ ماسٹر اس کا ایک خط کھول لیتا ہے، جو اس نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور جس میں شہر کے تمام مشاہیر کو خوب گالیاں دی ہیں اور ان پر پھبتیاں کسی ہیں۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب نے دھوکا کھایا ہے، مگر اس وقت تک چڑیا اُڑ جاتی ہے۔

گوگول کا دوسرا ڈراما "شادی" بھی اسی طرح مضحک سیرتوں کا عجائب خانہ ہے۔ اس کا ہیرو پود کولیسن، ایک کھاتا پیتا آدمی ہے جو شادی کرنا چاہتا ہے، مگر ایسا جھینپو ہے کہ خود کسی لڑکی سے دوستی کر کے

اس سے شادی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایک مشاطہ اس کا ایک لڑکی سے نکاح کرانے کا وعدہ کرتی ہی اور پود کو لیبن کپڑے وغیرہ تیار کرانے لگتا ہی۔ اس کی کیفیت پہلے منظر میں ظاہر ہو جاتی ہی، جب وہ اپنے نوکر کو بار بار بلا کر اس سے جرح کرتا ہی:-

"درزی کے یہاں گیا تھا؟"

"گیا تھا"

"تو کیا ہوا، وہ فراک کوٹ سی رہا ہی؟"

"سی رہا ہی"

"بہت سا سی چکا ہی؟"

"ہاں کافی سی لیا ہی، کاج بنانے شروع کر دیے ہیں"

"کیا؟"

"میں نے کہا: اس نے کاج بنانے شروع کر دیے ہیں"

"اور اس نے کہیں یہ تو نہیں پوچھا کہ صاحب کو بھلا فراک کس لیے چاہیے"

"نہیں، نہیں پوچھا"

"ممکن ہی اس نے کہا ہو: صاحب شادی تو نہیں کرنا چاہتے؟"

"نہیں کچھ نہیں کہا"........

"... ہاں، مگر کیا اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ صاحب اتنی باریک بانات کا کوٹ کیوں سلوا رہے ہیں؟"

"نہیں"

"اس کا بھی کوئی ذکر نہیں آیا کہ شاید صاحب شادی کرنا چاہتے ہوں"!

"نہیں اس کے متعلق کچھ باتیں نہیں ہوئیں"......

پود کولیسن کو اس کا خوف ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی شادی کی خبر تمام شہر میں مشہور ہو جائے اور لوگ اسے چھیڑیں اور اُس کا مذاق اُڑانے لگیں۔ نوکر ایک بار چلا جاتا ہے تو کچھ سوچنے کے بعد وہ پھر اس کو آواز دیتا ہے۔

"پولش خرید لایا؟"

"خرید لایا"......

"تجھے پالش دیتے وقت دکان والے نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ بھلا صاحب کو اس پالش کی کیوں ضرورت پڑی؟"

"نہیں"

"ممکن ہے اُس نے کہا ہو: کہیں صاحب شادی کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں"؟

"نہیں، اس نے کچھ نہیں کہا تھا"!

یہ گھبراہٹ اور خوف اور اندیشوں کا یہ عالم دیکھتے ہوئے بھلا کب ممکن تھا کہ پودکولیسن دولھا بننے کی ہمّت کر سکتا۔ اتفاق سے اس کے ایک دوست کوچ گرف نے اس کی شادی کرا دینے کا بیڑا اٹھا لیا۔ پودکولیسن کے علاوہ اور امیدواروں کو جنھیں مشاطہ نے پھانسا تھا کوچ گرف نے بہکا کر اور ڈرا کر بھگا دیا اور پودکولیسن کے لیے میدان صاف کر دیا۔ لیکن عین اُس وقت جب دُلہن گرجا میں جانے کے لیے تیار ہو گئی، پودکولیسن

ہمت ہار گیا اور چونکہ کوچ گرف نے اس خیال سے کہ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے دروازے پر پہرہ کھڑا کر دیا تھا، پودکولیسن کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔

"انسپکٹر جنرل" کا اصلاحی مقصد نہیں پورا ہوا۔ زار نکولائی نے خود اسے پڑھا، بہت پسند کیا اور اسے اسٹیج پر دکھلانے کا حکم دیا: اور پہلے تماشے میں جا کر ہنسنے اور داد دینے میں پیش قدمی کی۔ لیکن سرکاری عہدہ داروں نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اسٹیج پر دکھانے کی قطعی ممانعت ہو گئی۔ مگر گوگول کی طبیعت میں اس ڈراما لکھنے کے ساتھ قومی اصلاح کا ولولہ اٹھا اور اس کا نقطۂ نظر بھی کسی قدر بدل گیا۔ اس کی باریک بینی ولیسی ہی رہی ظرافت اتنی ہی رہی مگر واقعات کو وہ مصلح کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، اور جو درد روسی زندگی کا نظارہ اس کے دل میں پیدا کرتا تھا وہ اس امنگ میں منتقل ہو گیا کہ روسیوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے اور روسی زندگی کی عبرت انگیز تصویریں دکھا کر لوگوں کے دل بہتر زندگی کی آرزوؤں سے معمور کر دیے جائیں۔ "انسپکٹر جنرل" کی تصنیف کے بہت جلد بعد اس نے ایک ناول لکھنا شروع کر دیا جس کا عنوان "مردہ روحیں" تھا۔

"مردہ روحوں" میں مصوری بہت بڑے پیمانے پر کی گئی ہے، گوگول کا ارادہ تھا کہ روسی زندگی کی ایک جامع تصویر کھینچے اور اسی غرض سے اس نے ایک ایسا لوچدار پلاٹ منتخب کیا جو اس پر قصے کے تسلسل کی کوئی ذمہ داری یا پابندی نہیں ڈالتا۔ ناول کا ہیرو چچیکوف ایک نہایت درجہ چالاک

خود غرض اور عیّار آدمی ہے جو دو بار سرکاری ملازمت سے غبن اور رشوت خوری کی بنا پر نکالا جا چکا ہے۔ وہ روپیہ کمانے کی ایک اور تدبیر سوچ کر مردہ روحیں خریدنے نکلتا ہے۔ اس زمانے میں تمام روسی کاشتکار زمینداروں کی ملکیت تھے اور دوسری چیزوں کی طرح بیچے اور خریدے جا سکتے تھے۔ زمینداروں پر لگان ان نفوس "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا تھا جو ان کی ملکیت میں تھیں، لیکن چونکہ مردم شماری ہر دسویں سال ہُوا کرتی تھی، اس لیے زمینداروں کو ان کاشتکاروں کا لگان بھی دینا ہوتا تھا جو درمیان میں مر جاتے تھے۔ چچکوف کی تدبیر یہ تھی کہ ایسی مردہ "روحیں" زمینداروں سے سستے داموں خریدے، فرضی قیمتیں لگا کر ان کا ایک باقاعدہ بیع نامہ لکھوائے، جیسا کہ زندہ روحوں کی خرید فروخت کے وقت لکھوایا جاتا تھا، اور تب انھیں کسی بڑے بنک میں جا کر ایک معقول رقم کے عوض رہن رکھا دے۔ روحیں خریدنے کے لیے وہ ایک گاڑی پر بیٹھ کر سفر کو نکلتا ہے، اور گوگول بھی ہمیں اس کے ساتھ ساتھ سیر کراتا ہے اور ان زمینداروں میں جن کے پاس چچکوف بیوپار کرنے جاتا ہے، ہمیں روسی سیرت مختلف شکلوں میں دکھلائی جاتی ہے۔ منی لوف ایک جوان زمیندار ہے، جس میں کوئی خصوصیت نہیں، کسی قسم کا شوق نہیں جو کبھی سوچتا ہے کہ اپنے گھر سے تالاب تک ایک زمین دوز راستہ بنائے، کبھی اسے تالاب پر ایک ایسا پُل بنانے کی سوجھتی ہے جس کے دونوں طرف مٹھائی کی دوکانیں ہوں، مگر وہ کرتا کراتا کچھ نہیں۔ اس کے گول کمرے میں کئی کوچ ہیں جن پر کپڑا چڑھانا باقی رہ گیا ہے، وہ اپنے تمام مہمانوں سے کہتا ہے کہ ان کچ

نہ بیٹھیں، وہ ابھی تیار نہیں ہیں، لیکن کئی سال گزر گئے اور وہ کوچ اسی حالت میں پڑے ہیں۔ اس کی جائداد کا انتظام بہت خراب ہے، اسے کھانا تک ٹھیک طرح سے نہیں ملتا، مگر وہ خوش ہے اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتا۔ اس کے برعکس سوباکیے وچ ایک نہایت کنجوس، اکھڑ آدمی ہے، جو اپنی جائداد کا انتظام بہت اچھا کرتا ہے اور روپے کے لالچ میں ہر طرح کی بے ایمانی کرنے پر خوشی سے راضی ہو جاتا ہے، اگر اسے یہ یقین ہو جائے کہ اس میں فائدہ ہوگا۔ کھانے میں اور دوسروں کو گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا

نوزدریوف اسی قسم کا مگر کسی قدر مختلف آدمی ہے، بے ایمان، جھوٹا، فسادی، آوارہ، جو ملنے جلنے میں بڑا بے تکلف ہے۔ مگر جیسا کہ چچکوف کو ذاتی تجربے سے معلوم ہو جاتا ہے، اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پٹوانے اور ذلیل کرنے پر بھی وہ بہت جلد آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب شہر میں چچکوف اپنا کام ختم کر چکتا ہے، بیع نامے لکھ کر کچہری میں داخل کر دیے جاتے ہیں اور رخصت ہونے سے پہلے وہ دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے میں مصروف ہوتا ہے تو یہی نوزدریوف سب سے کہہ دیتا ہے کہ چچکوف نے مردہ روحیں خریدی ہیں اور ناول کے ہیرو کا سارا کام بگڑ جاتا ہے وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہو جاتا بلکہ ملک کے دوسرے حصے میں جا کر اسی طرح مردہ روحوں کا بیوپار شروع کر دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ جعلی وصیت نامہ بنا کر ایک رئیس عورت کی جائداد کا بڑا حصہ ورثے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کا جعل پکڑا جاتا ہے اور وہ بہ مشکل قید خانے سے اپنی جان بچاتا ہے۔

جو ہنسنا چاہے اسے "مردہ روحوں" میں اس کے بہت سے موقع ملیں گے، گوگول کی نظر انسانی زندگی کا ہر پہلو دیکھنے میں کبھی نہیں چوکتی۔ شہر کے سرکاری وکیل کی بائیں آنکھ اس طرح جھپکتی تھی گویا وہ کہنا چاہتا ہو" بیٹا ذرا دوسرے کمرے میں چلو تو تم کو پتے کی بات سناؤں"، لیکن وہ نہایت سنجیدہ اور خاموشی پسند آدمی تھا، چچکوف سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی اور جب اس نے آخر میں افواہ سنی کہ چچکوف کوئی سزا یافتہ مجرم ہے، اور جعلی نوٹ بناتا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں فالج گرنے سے یا قلب کی حرکت بند ہونے سے وہ اچانک مر گیا۔ لوگوں نے ڈاکٹر کو فصد کھولنے کے لیے بلوایا، لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری وکیل کے جسم سے روح نکل چکی ہے" تب انھیں ..... احساس ہوا کہ وہ واقعی روح رکھتا تھا، اگرچہ اس کے انکسار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا"..... ایک زمیندار سے جو لمبان چوڑان میں یکساں ہے اور کھاتے کھاتے بھول گیا ہے، ایک ہمسایہ شکایت کرتا ہے کہ اسے زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا ہے اور اس کا جی گھبرایا کرتا ہے۔

" تمھارا جی کیوں گھبراتا ہے؟" وہ بزرگ حیرت سے پوچھتے ہیں " تم کھانے کافی نہیں ہو، اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں"۔ لیکن ایسے چٹکلے "مردہ روحوں" کی مایوس کن اور ہمت شکن فضا پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے، گوگول ہنستا اور ہنساتا ہے، مگر یہ بھی ایک مجبوری سی ہے۔ "مردہ روحوں" میں ایک جنرل ہیں جنھیں چچکوف کا ایک لطیفہ بہت پسند آتا ہے اور جب ان کی لڑکی اعتراض کرتی ہے کہ انھیں ہنسنے کے بجائے افسوس کرنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں:" بیٹی میں

کروں کیا...... یہ بات ہی کچھ ایسی مضحک ہی۔"" گوگول کا بھی یہی انداز ہی، لیکن ظرافت سے وہ کبھی اپنے یا اپنے پڑھنے والوں کے دل پر غم کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ "مردہ روحوں" میں ایک بزرگ فرماتے ہیں: "مجھے اکثر خیال ہوتا ہی کہ روسی کو بالکل گیا گزرا سمجھنا چاہیے، اس کے ارادے میں قوت نہیں، اس میں اتنی ہمّت نہیں کہ استقلال سے کام کرے۔ وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہی، مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ وہ ہر دن سوچتا ہی کہ کل سے ایک نئی زندگی شروع کروں گا، جس قدر محنت کرنی چاہیے وہ کروں گا، کھانے میں پرہیز کروں گا مگر ہوتا ہوا تا کچھ نہیں۔ اسی رات کو وہ ضرورت سے زیادہ کھا جاتا ہی، بے وقوفوں کی طرح آنکھیں مچمچاتا ہی اور منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکال سکتا۔ ہاں، واقعی؛ ہمیشہ یوں ہی ہوا کرتا ہی۔" گوگول نے جب "مردہ روحوں" کے پہلے دو چار باب لکھے تو شاعر پشکن زندہ تھا اور گوگول نے اسے یہ پڑھ کر سنائے۔ پشکن گھبرا کر چلّا اُٹھا "یا خدا، ہمارا روس بھی کیا عجیب ویرانہ ہی"۔ ۱۸۴۲ء میں "مردہ روحوں" کی پہلی جلد شایع ہوئی اور اس کے پڑھنے سے اور سب پر بھی ایسا ہی اثر ہوا۔ لیکن گوگول کی حقیقت بینی تسلیم کرتے ہوئے نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ جس سوسائٹی میں صرف ایسے ہی لوگ ہوں جیسے کہ گوگول نے اپنی ناول میں دکھائے ہیں تو اس کا صفحۂ ہستی پر قایم رہنا ناممکن ہی۔ گوگول نے بھی یہ محسوس کیا، اور اپنے نقادوں کو یقین دلایا کہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا ہی، اس کا پہلا حصہ روسی زندگی کا صرف ایک رُخ دکھاتا ہی اور آگے

چل کر وہ ناول کے پیرائے میں نجات کی بھی کوئی صورت دکھائے گا، لیکن نجات کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ "مردہ روحوں" کا دوسرا حصّہ تین بار لکھ کر جلا دیا گیا اور جس شکل میں اس کی آخر کار چھپنے کی نوبت آئی وہ نہایت نامکمل تھا اور اس میں نجات کا راستہ سمجھانے کا وعدہ بھی فذا بے تکے طریقے سے پورا کیا گیا تھا۔ مگر "مردہ روحوں" کے دوسرے حصے کو دیکھ کر گوگول پر اعتراض کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ یہ حصّہ گوگول کے مرنے کے بعد شایع ہؤا، اور مرنے سے کئی سال پہلے ۱۸۴۷ء میں گوگول نے "احباب کے نام خطوط" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ناول نویسی ترک کر دی ہے۔

قومی نجات کا مسئلہ در اصل نہایت اہم تھا اور اگر گوگول نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے طے کرنا ناول نویس کے امکان سے باہر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی "احباب کے نام خطوط" ایک قسم کے مذہبی وعظوں کا مجموعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوگول نے اپنی عاجزی اور بے کسی محسوس کر کے مذہب کے آغوش میں پناہ لی تھی۔ اس کے معاصرین کو اس تصنیف سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ہؤا، کیونکہ وہ مذہبی جذبے اور مذہب کی پیروی میں فرق کرتے تھے۔ گوگول کے وعظوں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زار اور روسی کلیسا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرانے کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بھول گئے کہ وہ کیسے زار اور کیسے کلیسا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک روسی فطرت کی تعبیر کا تعلق ہے، گوگول کے وعظ بھی اسی قدر پر حقیقت تھے جتنے

اس کے ناول اور دستئفکی اور تالستائی کی تصانیف نے اسے ایک حد تک ثابت بھی کر دیا۔ بہرحال یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ روسی کو صرف مذہبیت کا جذبہ نجات دلا سکتا ہے، گوگول کا انجام صاف طور سے ظاہر کر دیتا ہے کہ روسی ناول نویسوں کے لیے ناول محض قصّے کہانی نہیں تھے۔ ان کی نظروں میں ناول وہی حیثیت رکھتا تھا جو قدیم یونانی معیار کے مطابق المیے کی تھی، اس کا مقصد صرف جی بہلانا یا عبرت دلانا نہیں تھا۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کی ہر شکل اور کیفیت تھی، وہ ایک آئینہ تھا جس میں صرف موجودہ حالات کا عکس نہیں تھا، بلکہ اس زندگی کا ایک دھندلا سا پرتو جسے انسان اپنے تمام قویٰ کی نشو و نما کے بعد اپنی جولانگاہ بنا سکتا ہے۔ گوگول پہلا ناول نویس تھا جس نے ناول کے کل امکانات سمجھے اور ناول نویسی کے پورے فرائض محسوس کیے اور باوجود اپنے فلسفیانہ مقاصد کی ناکامی کے وہ دنیا کے ناول نویسوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔

دوسرا باب

سرگے ئی تیموسفے یوچ اکساکوف (۱۷۹۱-۱۸۵۹)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ "مردہ روحوں" کی حقیقت نگاری نے گوگول کو گویا ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جہاں سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں ملا، اور ایک قیدی کی طرح جو آزادی کے لیے تڑپ رہا ہو وہ اپنے قید خانے کی دیواروں پر سر ٹپک ٹپک کر رہ گیا۔ اس کے ہم عصر اکساکوف نے بھی حقیقت کو اتنی ہی تیز اور نکتہ بیں نگاہوں سے دیکھا، مگر اپنے آپ کو جان بوجھ کر کسی فریب میں مبتلا نہیں کیا اور اس کی حقیقت نگاری خود اس کے اور دوسروں کے لیے تسکین اور تسلی کا ذریعہ اور امید کا ایک پیغام بن گئی جیسا کہ ایک اخبار نے اکساکوف کی تصنیف "ایک خاندانی داستان" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا اس وقت روسی انشاپردازوں میں وہی ایک ایسا تھا جس نے روسی زندگی کو محض نکتہ چینی کے لیے تختۂ مشق نہیں بنایا، بلکہ روسی سرزمین اور روسی رہن سہن سے سچی دلچسپی دکھائی اور محبت برتی۔ یہی اس کی عظمت کا راز ہے۔ اکساکوف کی تصانیف مروجہ مذاق اور معیار کے مطابق ممکن ہے ناولیں نہ کہی جا سکیں، مگر جس زندگی کا ان میں خاکہ کھینچا گیا ہے، جو داستان وہ سناتی ہیں وہ لطف، دل کشی، حقیقت نمائی اور سبق آموزی میں بہترین

ناولوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر روسی اپنے آپ سے اور اپنی
زندگی سے بیزار نہیں ہوئے، ان کو قوم اور قومی معاشرت سے
اور گہرا تعلق ہوگیا، اس وجہ سے نہیں کہ اکساکوف نے انھیں خود ستائی
اور حیوانوں کے سے سکون و اطمینان کا سبق پڑھایا، بلکہ اس وجہ سے
کہ اس نے ان کے دلوں میں محبت کے جذبے کو بیدار کیا اور اس جذبے
نے ان کی نظر کو بُرائی کے ساتھ اچھائی کو دیکھنا بھی سکھایا، یورپ پر رشک
کرتے کرتے ان کے دلوں میں جو بے صبری اور بے اطمینانی کا طوفان برپا
ہوا تھا اسے کسی قدر فرو کیا اور روسی عینیت کے بھٹکے ہوئے مسافر کو منزلِ مقصود کا راستہ بتایا۔

اکساکوف شہر اوُفا، صوبہ اورن برگ میں پیدا ہوا
اور اس نے کازان کے اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔
تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ پانچ سال تک پیٹربرگ میں ملازم رہا، چند
سال ماسکو، پیٹربرگ اور اوفا کا چکر لگاتا رہا اور ۱۸۱۶ میں مستقل طور پر ماسکو
میں سکونت گزیں ہو گیا۔ انشا پردازی کا اسے لڑکپن ہی سے شوق تھا،
لیکن اس کی نامور تصانیف کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب
اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس دوران میں اس نے
متعدد مضامین لکھے اور کئی ڈراموں کے ترجمے کیے مگر ان میں اُن خوبیوں
کا نام و نشان تک نہیں جنھوں نے اس کے بڑھاپے کی تصانیف کو اس قدر
مشہور اور ہر دل عزیز کر دیا۔ یہ معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے اگر ہم اکساکوف
کی طبیعت پر غور کریں اور یاد رکھیں کہ انسان اپنا جوہر اسی حالت میں دکھا سکتا ہے

جب وہ اپنی تخلیقی کوششوں میں اپنی پوری شخصیت کو محو کر سکے۔ اکساکوف طبعاً نہایت درجہ نیک دل، خوش اخلاق اور محبت کرنے والا تھا، ادبی شہرت حاصل کرنے سے پہلے اس نے ہزار ہا لوگوں کو اپنی شریفانہ سیرت اور دوستانہ سلوک کا گرویدہ کر لیا تھا۔ مضامین اور ترجمے اُس کی شخصیت کی تاثیر سے محروم رہے، مگر وہ اپنے بچپن کے حالات اور خاندان کی سرگزشت سُنانے بیٹھا تو وہ تمام صفتیں جنھوں نے ماسکو کے ہر بھلے آدمی کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا اس کی تصانیف میں ایک ساتھ ظاہر ہوئیں اور ادبی دنیا میں اس کا وہی مرتبہ ہو گیا جو دوستوں کے حلقے میں تھا۔ "مچھلی کے شکاری کا روزنامچہ" ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا، "صوبۂ اورن برگ کے شکاری کا روزنامچہ" ۱۸۵۲ء میں اور اس کے تین سال بعد "شکاری کے قصّے اور تذکرے"۔ تینوں کتابوں کی بہت جلد کئی اشاعتیں نکل گئیں اور جب ۱۸۵۶ء میں اکساکوف نے "خاندانی داستان" کے ابواب کی اشاعت شروع کی تو اس کا روس کے ادبی مشاہیر میں شمار ہونے لگا تھا اور تعلیم یافتہ روسی اس کے فریفتہ ہو چکے تھے۔

ان تصانیف میں اکساکوف کا ارادہ اپنی طبیعت کا جوہر یا اپنی انشا پردازی کے کرشمے دکھانا نہیں تھا۔ اسے بڑھاپے میں اپنا بچپن یاد آیا اور اپنے لڑکپن اور جوانی کی دلچسپیاں، وہ لوگ یاد آئے جن کی محبت میں وہ پلا تھا اور اس طرح اس کی نظر ایک نسل سے دوسری تک دوڑ گئی، جو کچھ اس نے دیکھا اور سُنا تھا وہ جیتی جاگتی تصویروں کی طرح پھر اس کے سامنے آ گیا اور اس کے قلم نے بڑے شوق سے کاغذ پر ان کا پورا پورا

نقشہ اُتار دیا۔ اکساکوف کے بیان سے سادگی اور خلوص ٹپکتا ہے اور بیان کی رونق اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان مناظر اور انسانوں کی تصویروں میں جو وہ دکھاتا ہے اپنی طرف سے کچھ گھٹاتا بڑھاتا نہیں اور اس اصول پر استقلال سے عمل کرتا ہے کہ سچّی بات اور سچّی تصویر میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پہلی دو تصانیف میں اس نے اپنے وطن کے مناظرِ قدرت، اس کی فضا، اس کے حیوانات و نباتات کا ذکر کیا ہے۔ اسے اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت تھی، ایسی گہری اور سچّی محبت کہ وہ اس کی تصانیف کا ایک جزو بن گئی اور پڑھنے والے کو فوراً اپنی تاثیر سے مسحور کر دیتی ہے۔ اسی طرح "خاندانی داستان" میں جن لوگوں کی سرگزشت سُنائی گئی ہے ان سے اکساکوف کو محبت تھی، وہ ان کی بُرائی بھلائی سب دیکھتا اور دکھاتا ہے، مگر وہ ہر حالت میں انھیں اپنا سمجھتا ہے اور جو محبت اپنوں سے کرنا چاہیئے اسے ہمیشہ برتتا ہے۔ پڑھنے والے کو بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہوتا ہے، اکساکوف کے عزیز اس کے عزیز بن جاتے ہیں، ان کی بُری حرکتیں اور خصلتیں اس کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرتی ہیں، کیونکہ اکساکوف سے وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے کہ خطاؤں سے درگزر کرنا نفرت کرنے سے بہت بہتر ہے اور اگر اس کے دل میں ذرا بھی محبت کا مادہ ہے تو وہ محسوس کر لیتا ہے کہ محبت کا یہی تقاضا ہے۔ اکساکوف کے عزیز ان لوگوں سے کسی صورت مختلف یا بہتر نہیں ہیں جن سے "مردہ روحوں" میں چچکوف بیوپار کرتا ہے؛ لیکن اکساکوف کی انسانی ہمدردی اور محبت نے دونوں کتابوں کی

روح اور ان کی تاثیر میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

"خاندانی داستان" روسی طرزِ معاشرت کی بہت ہی صحیح اور سچّی تصویر ہے، اس لیے ذیل میں اس کے چند اقتباس دیے جاتے ہیں، کہانی سُنانا اکساکوف کا مقصد نہیں تھا، اس داستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے مگر مصنف کی انشا پردازی کے کمال نے روزمرہ زندگی کو ایک دل ربا کہانی کا رنگ روپ دیدیا ہے اور ہمیں وہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔

"خاندانی داستان" کا قصّہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اکساکوف کے دادا نے خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر اپنا وطن چھوڑ دیا اور صوبہ اورن برگ میں، شہر اوف سے کوئی ڈھائی سو میل کے فاصلے پر زمین خریدی اور گانو آباد کر لیا۔ یہ جگہ نہایت خوبصورت اور یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی، کسان اور زمیندار دونوں اپنے وطن کو بہت جلد بھول بھال گئے اور نئی بستی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر بھی گانو کے گانو کو ایک بستی سے لے جا کر اور کئی سو میل کا سفر کر کے کسی دوسری جگہ آباد کرنا ہمت کا کام تھا اور ستیپان میخائلو وِچ، اکساکوف کے دادا کو کامیابی زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے دنیا سے نرالی طبیعت پائی تھی۔ اس کے اسامی اس سے ڈرتے بھی تھے اور محبت بھی کرتے تھے" وہ قرب و جوار کے تمام لوگوں کے سچّے محسن تھے... ان کے لبالب بھرے ہوتے کٹھار سب کے لیے کھلے تھے، جس کا جو جی چاہتا لے سکتا تھا... وہ ایسے سمجھدار تھے

دوسرے کی خواہشوں اور ضرورتوں کا اتنا لحاظ کرتے تھے، اپنے قول کے اتنے پکّے تھے کہ بہت جلد ان لوگوں کی نظر میں جو وسیع صوبۂ اورن برگ کے ایک کونے پر آباد ہوئے تھے علم اور دانشمندی کا مجسّمہ بن گئے۔ وہ اپنے ہمسایوں کو مدد پہنچانے کے علاوہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتے تھے،، جس نے ایک بار جھوٹ بولا، ایک بار دھوکا دیا اس کی خیریت اسی میں تھی کہ پھر وہ ان کو اپنا منہ نہ دکھاتے: کیونکہ تب صرف یہی اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ واپس جائے گا، بلکہ اگر وہ الٹے پیروں بھاگ کر اپنی جان بچا لیتا تو بھی سمجھنا چاہیے تھا خدا نے اس کے حال پر رحم کیا۔ ستیپان میخائلووچ نے بہت سے خاندانوں کے جھگڑے طے کیے، ہزارہا فتنوں کو سر اٹھاتے ہی کچل دیا......

"میں[۱] نے لوگوں کی زبانی ستیپان میخائلووچ کی بہت سی باتیں سنی ہیں، بعض معمولی، بعض ایسی جنھوں نے دل پر بہت گہرا اثر کیا اور جن کو سناتے وقت لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے......

"اس نیک دل، فیاض اور بامروت شخص پر کبھی کبھی غصّے کا بھوت ایسا سوار ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر انسانیت کی علامتیں باقی نہیں رہتی تھیں اور اس وقت وہ نہایت درجہ بے رحم اور نفرت انگیز حرکتوں

۱؎ اکساکوف نے "خاندانی داستان" کی پہلی اشاعتوں کی تمہید میں لکھا تھا کہ یہ اس کے اپنے خاندان کا قصّہ نہیں ہے اس خیال سے کہ شاید جن لوگوں کا اس میں ذکر آیا ہے ان کے عزیزوں کو کوئی شکایت ہو مگر اس داستان میں واحد متکلم کا صیغہ اکساکوف نے اپنے لیے استعمال کیا ہے

پر اتر آتا تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں انھیں اس حالت میں دیکھا تھا۔۔۔ اور میرے دل پر خوف کا نقش ابھی تک تازہ ہے، ان کی صورت ہو بہو میرے سامنے آجاتی ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی پر خفا ہوئے تھے، غالباً اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولی تھی اور دھوکا دینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ دو آدمی دادا کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے انھیں تھامے تھے، انھیں دیکھ کر میں مشکل سے کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے دادا ہیں، وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے، چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی، ان کی آنکھوں سے ہیبت ناک شعلے نکل رہے تھے، غصّے سے انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ چلّا رہے تھے: "اسے یہاں پکڑ لاؤ!" اور ان کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہے۔۔۔ میری دادی چاہتی تھیں کہ ان کے پیروں پر گر کر مجرمہ کی طرف سے معافی مانگیں، لیکن ایک لمحے میں ان کے سر سے رومال[۱] اور ٹوپی غائب ہو گئی اور ستیپان میخائلووچ نے اپنی چھوٹی موٹی بوڑھی اور ضعیف ارینا وسیلیفنہ[۲] کے بال پکڑ کر انھیں جھنجھوڑ ڈالا۔ اس درمیان میں صرف مجرمہ ہی نہیں بلکہ اس کی اور سب بہنیں، بھائی اور بھاوج مع اپنے بچّے کے سب گھر سے نکل بھاگے اور ایک کنج

---

[۱] پرانی روسی وضع کے مطابق بال بھی ستر میں شامل تھے اور عورتیں سر کو ہمیشہ ایک رومال سے ڈھکے رہتی تھیں جو ٹھوڑی کے نیچے گرہ دے کر قایم رکھا جاتا تھا۔ اس کے نیچے بعض عورتیں ایک تنگ ٹوپی بھی پہنتی تھیں۔

[۲] اکساکوف کی دادی کا نام ہے۔

میں جو مکان کو چاروں طرف سے گھیرے تھا جاکر چھپ رہے، رات کو سب وہیں سوئے، صرف دادا کی نوجوان بہو اپنے بچے کو وہاں سے لے کر چلی آئیں اور اس اندیشے میں کہ کہیں بچے کو سردی نہ لگ جائے نوکروں کی ایک کوٹھری میں رات گزاری۔ میرے دادا میدان اور خالی مکان میں بہت دیر تک دھاڑتے گرجتے رہے، آخر کار وہ تنائی چیچونک اور مازلن کو ٹھوکتے ٹھوکتے اور ارینا وسیل یفنہ کے جھونٹے نوچتے نوچتے تھک گئے، اپنے پلنگ پر بے ہوش گر پڑے اور دوسرے دن صبح تک گہری نیند سوتے رہے۔ سو کر اٹھے تو چہرہ صاف اور روشن تھا، بڑی خوشی کے لہجے میں اپنی ارلیشا (ارینا وسیل یفنہ) کو پکارا اور وہ پاس کے کمرے سے فوراً دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار ایسے نمایاں تھے کہ گویا کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پچھلے دن کے دیوانے نے سو کر اٹھتے ہی کہا "چائے لاؤ! بچے کہاں ہیں اور الکسئی[2] اور میری بہو[3]؟ لاؤ، سیرلیوژا[4] کو لاؤ"۔ اور بہو پوتے کے سوا گھر بھر میں سب خوش اور مطمئن یکے بعد دیگرے سیتپان میخائلووچ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی بہو بھی نازک مزاج اور ضدی تھی۔ اس کی لاکھ خوشامد کی گئی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی کہ جس شخص نے کل ہی ایک درندے کی خاصیتیں اختیار کر لی تھیں

---

[1] نوکروں کے نام۔

[2] سیتپان میخائلووچ کے بیٹے، اکساکوف کے باپ کا نام دراصل اسے تیمونے ئی ہونا چاہیے۔

[3] مصنف کی ماں۔ [4] خود مصنف

اس سے آج میل کرلے ... اس کی طبیعت کچھ واقعی ناساز معلوم ہوتی تھی، اس لیے اس نے کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں اور اپنے بچے کو بھی نہیں جانے دیا۔ سب پر خوف طاری ہوگیا، سب سمجھے کہ کل کا سا حشر پھر برپا ہوگا۔ لیکن کل کا درندہ سو کر اٹھا تو آدمی تھا... چائے کے بعد... خسر خود بہو کے پاس گئے... اس کے پلنگ پر بیٹھ گئے، اسے گلے لگایا پیار کیا،... پوتے کو بھی خوب پیار کیا اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ "بہو کے بغیر تو زندگی بے مزہ ہو جائے گی۔" آدھے گھنٹے کے بعد ان کی بہو، ایک پُرتکلّف شہری وضع کا جوڑا پہنے... اور بچے کا ہاتھ پکڑے ان کے کمرے میں آئی۔ دادا اس سے مخاطب ہوئے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُنھوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا "دیکھو بہو نے اپنی بیماری کا خیال نہیں کیا، اُٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے پہن کر مجھ بوڑھے کا جی خوش کرنے آئی ہے۔" نندوں نے ہونٹ چبا کر نظریں نیچی کرلیں۔ انھیں سب کو اپنی بھاوج سے بالکل محبت نہیں تھی۔ بہو نے احترام اور مسرت سے خسر کی شفقت کا جواب دیا، اور اپنی بدخواہوں کو فخر اور فتح مندی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی..."

یہ ستیپان میخائلووچ کا برا دن تھا۔ معمولاً ان کے دن اچھے ہوتے تھے۔ اچھے دن کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

"دادا سو کر اُٹھے اور... مسہری سے سر نکال کر قہقہہ لگایا، کیوں کہ مازان اور تنائی چیونٹی ایک عجیب مضحک انداز سے زمین پر ہاتھ پیر

پھیلائے پڑے خرّاٹے لے رہے تھے ؛ دادا نے کہا" دیکھو یہ کتّے کے پلّے کیسے خرّاٹے لے رہے ہیں!" اور پھر مسکراتے۔ ان کی طبیعت ابھی ایک معمّہ تھی۔ ایسے سخت الفاظ استعمال کرنے کے بعد انھیں چاہیے تھا کہ سوتوں کی پسلیوں میں اپنا ڈنڈا جو ہمیشہ ان کے پلنگ کے پاس کھڑا رہتا تھا بھونک دیں یا ان کے ایک لات لگائیں یا ان پر کرسی دے ماریں لیکن وہ ہنس کر رہ گئے۔ وہ اچھی طرح سے سوتے تھے اور ان کے مزاج میں دن بھر خوش رہنے کا سامان تھا... انھوں نے خاموشی سے اٹھ کر دو چار دفعہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اپنے بادامی رنگ کے سلیپر پیر میں ڈالے اور موٹے سن کے کپڑے کی دیہاتی وضع کی قمیص پہنے (باریک بُنا ہُوا کپڑا دادی انھیں قمیصوں کے لیے کبھی نہیں دیتی تھیں) جا کر برساتی میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں صبح کی تازگی اور طراوت نے نہایت دل پذیر طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ ارینا وسیل نفیہ ستیپان میخائلو وچ کو باریک کپڑا قمیصوں کے لیے نہیں دیتی تھیں اور ہر شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ میاں بیوی کی طبیعتیں دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا... لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے، عورت کی فطرت اس معاملے میں بھی مرد پر فتحیاب ہوئی۔ میری دادی نے موٹے کپڑے کے پیچھے کئی دفعہ مار کھائی مگر وہ قمیص موٹے کپڑے ہی کی بناتی رہیں اور آخرکار دادا کو اس کی عادت ہو گئی۔ ایک بار تو انھوں نے نہایت ہی موثر اور اپنے نزدیک انتہائی تدبیر اختیار کی: یعنی تمام موٹے سن کے

سوت کے بنے ہوئے کپڑے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر رکھے اور کلہاڑی سے کاٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ میری دادی روتی بیٹھی رہیں، دادا سے التجا کرتی رہیں کہ "مجھے مار لو مگر اپنی چیز نہ برباد کرو" دادا نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ... مگر یہ تدبیر بھی ناکامیاب رہی پھر انھیں ویسے ہی موٹے کپڑے ملنے لگے اور آخر کار انھوں نے ہار مان لی ... دادا کے "اچھے دن" کی داستان کا سلسلہ توڑنے کی معافی چاہتا ہوں ... خیر اب آگے سُنیے۔ دادا بغیر کسی کو بلائے خود ہی جاکر اپنا نمدے کا سوئیٹر اسباب کی کوٹھری سے، جہاں وہ ہمیشہ رکھا رہتا تھا، لے آئے اسے برساتی کی پہلی سیڑھی پر بچھایا اور اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گئے کہ سورج کو نکلتے ہوئے دیکھیں۔ طلوع آفتاب کے وقت ویسے بھی انسان کا دل آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے اس کے علاوہ میرے دادا کو سویرے اٹھ کر اپنے گھر بار کی ہر چیز پر نظر ڈالنے میں لطف آتا تھا، اور ان کے یہاں اس زمانے کے لحاظ سے زندگی کی تمام ضروریات مہیّا تھیں ...
پھر دادا کا ٹھنڈے پانی سے منھ ہاتھ دھو کر چائے پینے کو دل چاہا اور انھوں نے اپنے خادموں کو جیسے تیکے طریقے سے سو رہے تھے جگایا۔ خادم دیوانوں کی طرح خوف سے اچک کر کھڑے ہو گئے، مگر ستیپان میخائلووچ کی خوش و خورم آواز نے پھر ان کی جان میں جان ڈال دی، "مازان، منہ دھونے کا پانی لاؤ! تنائی چیونوک، اکسیونکا[1] اور بی بی کو جگاؤ! ۔ اور چائے لاؤ!"

---

[1] خادمہ کا نام۔

ان حکموں کے دہرانے کی ضرورت نہ تھی بے ڈول مازان چشمے سے پانی کے لیے چمکتی ہوئی پیتل کی چلمچی لے کر سرپٹ بھاگا، پھر تیلے تنائی چیونک سنے بدصورت، نوجوان اکسیوتکا کو اُٹھایا۔ وہ اپنے سر پر رومال ٹھیک کرتی ہوئی گئی اور بوڑھی موٹی بی بی ارینا وسیل یفنہ کو جگا آئی۔ چند منٹ میں گھر بھر اُٹھ کھڑا ہوا اور سب کو معلوم ہو گیا کہ بڑے میاں خوش خوش اُٹھے ہیں۔ پندرہ منٹ کے اندر برساتی میں ایک میز بچھ گئی، اس پر ایک سفید گھر میں بنے ہوئے کپڑے کی چادر لگا دی گئی۔ ایک بہت بڑے پیتل کے چائے دان نما سماوار میں چائے اُبلنے لگی اور میز کے گرد اکسیوتا مختلف کاموں میں مشغول ہو گئی۔ بوڑھی بی بی ارینا وسیل یفنہ اور ستیپان میخائلووچ نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ بوڑھی بی بی کے لیے اور دنوں کی طرح آج نہ آہیں بھرنا ضروری تھا نہ کانکھنا، انھوں نے بلند آواز اور خوشی کے لہجے میں دادا کا مزاج پوچھا اور کہا: "کہیے کیسی نیند آئی، کیا کیا خواب دیکھے؟" دادا نے بڑی شفقت سے اپنی بیوی کا مزاج پوچھا اور پیار میں انھیں اریشا کہ کر پکارا۔ وہ ان کے ہاتھ کبھی نہیں چومتے تھے، بلکہ عنایتاً اپنا ہاتھ چومنے کے لیے دیتے تھے۔ ارینا وسیل یفنہ پھول کی طرح کِھل گئیں، چہرے پر جوانی کا رنگ آگیا: کہاں گیا اب ان کا موٹاپا، ان کا بے ڈھنگا پن! وہ جلدی سے اسٹول لائیں اور برساتی میں دادا کے پاس بیٹھ گئیں۔ اس کی انھیں کبھی ہمت نہ ہوتی اگر دادا پیار سے نہ پیش آئے ہوتے دادا نے کہا "آؤ اریشا، گرمی ہونے سے

پہلے ہمارے پل لیں۔ رات کو جبس تو تھا مگر میں ایسی گہری نیند سویا کہ خواب تک نہیں دیکھا۔ ہاں اور تم ؟" یہ سوال ایک غیر معمولی پیار کی نشانی تھی اور ارینا وسیل یفنہ نے جلدی سے جواب دیا کہ "جس رات کو ستیپان میخائلو وچ اچھی طرح سوتے ہیں مجھے بھی خوب نیند آتی ہے، مگر تانیوشا[1] نے رات کچھ بے چینی سے گزاری"۔ تانیوشا سب سے چھوٹی لڑکی تھی اور جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے، بوڑھے باپ کو وہ اور لڑکیوں سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ یہ خبر سن کر کچھ پریشان ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ جب تک لڑکی خود سے نہ اُٹھے اسے کوئی نہ جگانے پائے۔ تنیا نہ ستیپانوفنہ اپنی بہنوں الکساندرا[3] اور ایلی زا ویتا ستیپانوفنہ[2] کے ساتھ جگا دی گئی تھی اور کپڑے پہن کر تیار بھی ہو چکی تھی، مگر دادا سے یہ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ تانیوشا پھرتی سے کپڑے اُتار کر پھر پلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکیاں سب بند کرا دیں۔ اُسے نیند تو نہیں آئی، مگر دو گھنٹے اندھیرے میں لیٹی رہی، دادا کو اطمینان ہو گیا کہ تانیوشا جی بھر کر سولی ہے۔ دادا کا اکلوتا لڑکا جو کوئی نو سال کا تھا۔ کبھی سویرے جلدی نہیں جگایا جاتا تھا۔ بڑی لڑکیاں تھوڑی دیر بعد حاضر ہوئیں۔ ستیپان میخائلو وچ نے شفقت سے انھیں ہاتھ چومنے کو دیا۔ ایک کو لزانکا[2] کہہ کر پکارا، دوسری کو لکسانیا[3]۔ دونوں بڑی ہوشیار تھیں۔ الکساندرا کی طبیعت میں

---

[1] تنیانا کا مخفف ۔
[2] ایلی زا ویتا کا مخفف ۔
[3] الکساندرا کا مخفف ۔

چالاکی کے ساتھ باپ کی تیزی اور تنک مزاجی تھی، مگر باپ کی اچھی صفتیں اس میں نہیں تھیں، دادی بہت ہی سیدھی سادھی عورت تھیں اور ان کی لڑکیاں ان پر بالکل حاوی تھیں۔ گروہ ستیپان میخائلووچ سے چالاکی کرنے کی ہمت کرتیں تو محض لڑکیوں کے سکھانے سے اور اپنی سادگی کی وجہ سے اکثر انھیں اس کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی۔ ستیپان میخائلووچ کو یہ بخوبی معلوم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب کبھی موقع ملا انھیں دھوکا دینے پر تیار ہو جاتی ہیں، جب ان کا مزاج ٹھیک ہوتا تو... صرف بکھیڑے سے بچنے اور اپنا سکونِ قلب قایم رکھنے کے لیے وہ ایسی باتیں کرتے کہ لڑکیاں سمجھتیں کہ ان کو بیوقوف بنا رہی ہیں، لیکن جہاں انھیں غصّہ آیا وہ لڑکیوں کو بے تکلف خوب کھری کھری سناتے بلکہ کبھی مار بھی بیٹھتے تھے، مگر لڑکیاں پوری حوا کی بیٹیاں تھیں، وہ کبھی باز نہ آئیں، غصّے کی گھڑی گزری اور دادا کی پیشانی کے بل دور ہوئے کہ وہ پھر دھوکا دینے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگتیں جن میں وہ اکثر کامیاب بھی رہتی تھیں۔

"چائے پی کر اور بیوی بیٹیوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے دادا کھیتوں کے معائنے کے لیے چل دیے... باوجود گرمی کے وہ دوپہر تک گاڑی پر چڑھے گھوما کیے جیسے ہی دادا کی گاڑی پہاڑی پر سے اُترتی نظر آئی کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سارا خاندان ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا... کھانے پر سب بہت خوش تھے... سب بلند آواز میں باتیں کرتے، مذاق کرتے، ہنستے رہے... کھانے کے بعد دادا فوراً سونے کے لیے

لیٹ گئے ... اور بہت جلد ان کے خراٹوں کے شور و غل کو سن کر سب سمجھ گئے کہ صاحب خانہ سورماؤں کی نیند سو رہے ہیں، سب اپنی اپنی جگہ پر آرام کرنے چلے گئے، مازان اور تنائی چیونک بھی ... دادا کی خواب گاہ کے دروازے کے سامنے دراز ہو گئے ... نیند اور گرمی سے ان کا گلا سوکھ گیا تھا ان کا جی چاہتا تھا اپنے آقا کی طرح بیر میں خوب برف ڈال کر پئیں اور حلق تر کر لیں۔ دیکھیے ان ڈھیٹھ چھوکروں نے کیسی ترکیب سوچی۔ دادا کی خواب گاہ کا دروازہ کچھ کھلا تھا، وہ کمرے میں جا کر ان کی ٹوپی اور چوغا لے آئے جو دروازے کے پاس ہی کرسی پر رکھا تھا۔ تنائی چیونک آقا کے کپڑے پہن کر برساتی میں بیٹھ گیا ... مازان جگ لے کر تہ خانے بھاگا ہوا گیا اور خادمہ کو جگا کر صاحبِ خانہ کے لیے ٹھنڈی بیر طلب کی، خادمہ نے جب شک ظاہر کیا کہ صاحب خانہ واقعی اُٹھے بھی ہیں تو مازان نے تنائی چیونک کی طرف اشارہ کر دیا، جو چوغا اور ٹوپی پہنے برساتی میں بیٹھا تھا۔ بیر انڈیل دی گئی، اس میں برف ڈال دی گئی اور مازان مال غنیمت لے کر چلتا ہوا، دونوں لڑکوں نے ایک ہی جگ سے پی کر پھر چوغا اور ٹوپی پرانی جگہ پر رکھ دی ... دادا اُٹھے تو صبح سے بھی زیادہ خوش و خرم تھے اور اُٹھتے ہی ٹھنڈی بیر مانگی ... نوکروں کے دھوکے کا راز فاش ہو گیا، مازان اور تنائی چیونک خوف سے لرزتے ہوئے آقا کے قدموں پر گر پڑے اور آپ کیا سمجھتے ہیں دادا نے کیا کیا؟ ... اُنھوں نے قہقہہ لگایا، اپنی بیوی اریشا اور لڑکیوں کو بلا بھیجا اور خوب زور سے ہنس ہنس کر

اپنے نوکروں کی چالاکی کا قصّہ سُنایا...

"دادا سہ پہر کو پانچ بجے اٹھے تھے اور ٹھنڈی بیر کے بعد باوجود سخت گرمی کے انھیں چائے پینے کی خواہش ہوئی، اس خیال سے کہ گرمیوں میں گرم چیز پینے سے طبیعت کا بھاری پن کم ہو جاتا ہے۔ البتہ درمیان میں وہ جاکر لوگورُسلاں دریا کے ٹھنڈے پانی میں نہا آتے، جو گھر کی کھڑکیوں کے نیچے سے بہتا تھا۔ واپسی پر ان کا سارا خاندان اسی سویرے والی چائے کی میز کے پاس ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چائے کی میز سائے میں رکھی تھی، ابھی چائے دان نما سماوار میں چائے اُبل رہی تھی اور وہی خادمہ اکسیوتکا موجود تھی۔ دادا نے اپنا مرغوب پسینہ لانے والا گرم پانی جی بھر کر پی لیا... اور تب سیر کے لیے پن چکی پر جانے کی تجویز پیش کی۔ ظاہر ہے کہ سب بڑی خوشی سے راضی ہو گئے..."

"شام ہوئی تو ستیپان میخائلووچ نے کہا: "اریشا، اب گھر واپس ہونے کا وقت آگیا؛ گھر پر غالباً مکھیا میرا انتظار کر رہا ہو گا..."

ستیپان میخائلووچ کا اندازہ غلط نہیں تھا: برساتی میں گاؤں کا مکھیا ان کا راستہ دیکھ رہا تھا اور صرف اکیلا نہیں بلکہ کئی کسانوں اور عورتوں کے ساتھ۔ مکھیا دادا کو پہلے دیکھ چکا تھا، اس نے پہچان لیا کہ ان کی طبیعت خوش ہے اور کسانوں میں سے کسی کو یہ خبر سُنا دی: بعضے جنھیں کوئی غیر معمولی درخواست کرنی تھی، اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپہنچے اور سب کی خواہشیں اور حاجتیں پوری کر دی گئیں... صرف یہ نہیں

بلکہ سب کو ایک چاندی کے پیالے بھر... گھر کی بنی ہوئی زوردار شراب بھی ملی... رات اور دن کے کھانے میں بہت کم فرق تھا اور غالباً اس وقت سب نے اور زیادہ پیٹ بھر کر کھایا، اس وجہ سے کہ گرمی کم تھی۔ رات کا کھانا کھا کر ستیپان میخائلو وچ نے خاندان کو آرام کرنے کے لیے بھیج دیا اور خود حسب معمول فقط قمیص پہنے برساتی میں جاکر رات کی خنکی کا لطف اٹھانے کے لیے بیٹھ گئے۔"

"خاندانی داستان" میں ستیپان میخائلو وچ کے وطن سے ہجرت کرکے نئی بستی میں آباد ہونے اور ان کے اچھے اور برے دنوں کی سرگزشت سنانے کے بعد ان کی چچیری بہن اور ان کے اپنے لڑکے الکسئی ستیپانوچ کی شادیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ستیپان میخائلو وچ کو اپنی چچیری بہن پراسکو ویا اوانوفنہ بہت عزیز تھی اور چونکہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی نانی پر ستیپان میخائلو وچ کو زیادہ اعتبار نہ تھا اس لیے وہ پراسکو ویا اوانوفنہ کو زیادہ تر اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے۔ ستیپان میخائلو وچ سے سب بہت ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود خاندان کی عورتوں نے مل کر ان کی مرضی کے خلاف پراسکو ویا اوانوفنہ کی پندرہ برس کی عمر میں میخائل ماکسی مووچ کورولے موف نامی ایک فوجی افسر سے شادی کرادی۔ پراسکو ویا اوانوفنہ کو ورثے میں کئی گانو ملنے والے تھے اور اس سے شادی کر لینا قرب و جوار کے تمام نوجوانوں میں بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس سے شادی کرنے کے بہت سے امیدوار تھے، صرف اس کی نوعمری

کی وجہ سے سب نے اس کی کوشش ملتوی کر رکھی تھی۔ اتفاق سے کورد لیے
موف، جس کی پراسکوویا کے ناہنال کے قریب کچھ زمین بھی تھی ملازمت
سے چند مہینوں کی رخصت لے کر اپنے گانو آیا۔ پراسکوویا کے ورثے کی
خبر سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے اس کی عمر کا لحاظ کیے بغیر
اس سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ وہ آدمی بہت ہوشیار اور تجربہ کار
تھا، دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اس نے پراسکوویا کی نانی کو ایسا گرویدہ کر لیا
کہ وہ اس سے پراسکوویا کا نکاح کرنے پر آمادہ ہوگئیں اور کورویموف
کو ستیپان میخائلووچ اور ان کے خاندان سے رضامندی لینے کے لیے
ان کے گانو بھیجا۔ ستیپان میخائلووچ کی بیوی اور لڑکیوں کو کورلیوف
بہت پسند آیا، لیکن ستیپان میخائلووچ کو صورت دیکھتے ہی اس سے
نفرت ہوگئی اور اس کا انھوں نے بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیا۔ ان کی
بیوی اور لڑکیوں نے سمجھ لیا کہ وہ اسے اپنا بہنوئی بنانے پر کبھی راضی
نہ ہوں گے، لیکن ان کی ضد میں اور کچھ اس لیے کہ کورلیوف انھیں
واقعی بہت معقول آدمی معلوم ہوتا تھا انھوں نے پراسکوویا کی نانی سے
مل کر سازش کی اور چند مہینے بعد جب ستیپان میخائلووچ کسی ضرورت
سے ماسکو چلے گئے تو انھوں نے پراسکوویا کا کورلیوف سے نکاح کرا دیا۔
پراسکوویا بہت سیدھی سادی نیک دل لڑکی تھی اور پہلے پہل کوروئیموف
کا اس کے ساتھ سلوک بھی اتنا اچھا تھا کہ اسے اس سے گہری محبت ہوگئی۔
مگر کچھ سال بعد کورویموف کا چال چلن بالکل بگڑ گیا، اس لیے پراسکوویا

کے لیے اس نے ایک گانؤ میں بہت عالی شان مکان بنا دیا جہاں وہ بیچاری اکیلی پڑی رہتی تھی اور خود دوسرے گانؤ میں عیاشی شراب خواری میں مصروف رہتا تھا۔ رعایا اس کے ظلم سے نالاں تھی، جان پہچان کے لوگ اس کی ساری بدکاریوں سے واقف تھے، مگر پراسکوویا کو اس کی طرف سے کچھ ایسا حسن ظن ہو گیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کار اس کی نوبت آئی کہ اسے بھی شک ہو گیا اور اپنے شوہر کو اطلاع دیے بغیر وہ اس گانؤ میں پہنچ گئی جہاں وہ رہتا تھا وہاں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں، وہ چاہتی تھی کہ کورولیموف کو منتظم کے عہدے سے معزول کر دے لیکن کورولیموف نے اسے ایک تہ خانے میں بند کر دیا اور ستیپان میخائلووچ اس حادثے کی خبر سن کر وقت پر پہنچ نہ گئے ہوتے تو غالباً وہ وہیں بھوکوں مر جاتی۔ ستیپان میخائلووچ اسے چھڑا لائے اور چند دن کے بعد ہی خبر ملی کہ کورولیموف مر گیا۔

الکسئی ستیپانووچ[۱] کی شادی کا قصہ اس سے بہت زیادہ دلچسپ ہے، اور ستیپان میخائلووچ کی شخصیت کا ایک پہلو دکھاتا ہے جو در حقیقت حیرت انگیز ہے۔ الکسئی ستیپانووچ کچھ سال فوج میں ملازم رہنے کے بعد شہر اوفا میں وکالت کرنے لگا۔ یہاں وہ سوفیا نکولائیفنہ، نائب گورنر صوبہ اورن برگ کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ اس کا عشق نہایت شاعرانہ

---

[۱] اکساکوف کے والد، جن کا شروع میں ذکر آیا تھا۔ ستیپان میخائلووچ کی بہو انھیں کی بیوی اور اکساکوف کی ماں تھیں۔

قسم کا تھا، یہ ایک دل کی بیماری تھی، جس نے اسے دُبلا اور کم زور اور زندگی سے بے پروا کر دیا۔ سوفیا نکولائفنہ بہت ہی مہذّب تعلیم یافتہ اور لایق تھی، روس کے اکثر ادبی مشاہیر سے اس کی واقفیت تھی اور سب اُس کا ادب کرتے تھے، خود شہر اوف میں کوئی خاتون حسن اور ذہانت اور سلیقے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کا اور الکسئی ستیپانووچ کا، جو ایک معمولی زمیندار کا لڑکا تھا کوئی جوڑ نہ تھا اور اس کے علاوہ الکسئی ستیپانووچ ایسا جھیپو، بزدل اور کمزور طبیعت کا تھا کہ شادی کا پیغام دینے کی نوبت آنا بھی مشکل تھا۔ لیکن الکسئی ستیپانووچ دل کے ہاتھوں ایسا مجبور ہوا کہ شادی کے سوا اسے جان بچانے کی کوئی اور صورت ہی نظر نہیں آئی، وہ پیام دینے پر تُل گیا۔ اُس نے ایک خاتون کے ذریعہ سے جس سے اس کی کچھ عزیزداری تھی سوفیا نکولائفنہ کی رائے معلوم کی اور اس سے اُس کی اُمیدیں بہت بڑھ گئیں۔ سوفیا نکولائفنہ مردم شناس تھی، نکولائی الکسئی ستیپانووچ شرمیلا آدمی تھا اور اس میں یہ مادہ نہیں تھا کہ کسی مجمع پر رعب جما سکے مگر وہ دل کا بڑا اچھا اور بہت مخلص تھا، اور سوفیا نکولائفنہ نے اس کے یہ اوصاف پہچان لیے اور اس کی قدر کرنے لگی۔ دشواریاں بہت تھیں، لیکن سوفیا نکولائفنہ کی رائے معلوم کرنے کے بعد الکسئی میخائلووچ کو کچھ کچھ امید بندھی اور وہ اس مسئلے پر اپنے خاندان کی رائے لینے کو گھر آیا۔ گھر یہ اس کی بہنوں نے سب حال دریافت کر لیا تھا۔ انھیں

سوفیا نکو لائفنہ سے دلی بغض ہو گیا تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ حسین شائستہ اور ہوشیار تھی اور ارادے کی ایسی مضبوط کہ اس کے سامنے کسی کی دال گلنا ممکن نہیں تھا۔ بہنیں اپنے بھائی پر قبضہ رکھنا چاہتی تھیں اور ستیپان میخائلووچ کے خیال میں بھی ایک معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے زمیندار اور ایک شائستہ شہری خاتون کا نباہ اس قدر دشوار تھا کہ انھوں نے بھی اپنے بیٹے کو یہ خیال چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ سب کی مخالفت کا بیچارے الکسئی ستیپانووچ پر ایسا اثر پڑا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑ گیا اور موت کے منہ سے بال بال بچا۔ آخر کار جب وہ اچھا ہو کر شہر اوفا واپس ہوا تو اس کے خاندان کا خیال تھا کہ وہ سوفیا نکو لائفنہ کو بالکل بھول گیا ہو گا مگر وہاں پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی اس نے گھر والوں کو یہ دھمکی لکھ بھیجی کہ اگر سوفیا نکو لائفنہ سے شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کا بے اولاد مرنا گویا خاندان کا خاتمہ تھا، اس لیے ستیپان میخائلووچ نے مجبوراً سوفیا نکو لائفنہ کے نام پیغام بھیج دیا اور دونوں کی کچھ عرصہ بعد شادی ہو گئی۔

سوفیا نکو لائفنہ اور ستیپان میخائلووچ "خاندانی داستان" کے بہترین کیرکٹر ہیں اور وہ حصہ جہاں ان دونوں طبیعتوں کا خود بخود ملنا، ایک دوسرے کو سمجھنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا دکھایا گیا ہے

انشا پردازی اور کیرکٹر کی مصوری کا کرشمہ ہے۔ ستیپان میخائلو وچ نے اپنی وضع نہیں چھوڑی، سوفیا نکو لائفنہ نے اپنی شائستگی سے ہاتھ نہیں دھویا، اس کی ساس اور نندیں شروع سے آخر تک اس سے نفرت کرتی رہیں اور الکسئی ستیپانو وچ نے دنیاداری نہیں سیکھی، لیکن سوفیا نکولائفنہ کے سلیقے اور ستیپان میخائلو وچ کی محبت سب برداشت کر لے گئی، خاندان میں امن قایم رہا اور ایک پوتے کی پیدائش نے بوڑھے دادا کی پرانی آرزو پوری کر کے سوفیا نکو لائفنہ سے ان کی محبت اور گہری کر دی۔

وہ خاندانی داستان" کا قصہ ستیپان میخائلو وچ کے پوتے مر گئے کی پیدائش پر ختم ہو جاتا ہے اور مصنف اپنے خاندان سے رخصت ہوتا ہے۔

"الوداع میرے روشن اور تاریک پیکرو، میرے اچھے اور برے لوگو! .... تم بڑے سورما نہیں تھے، نہ ایسی شخصیت کے مالک جس کی شہرت کا نقارہ بجتا ہوا خاموشی اور گم نامی میں تم نے اپنی زندگی بسر کی اور ایک زمانہ گزرا کہ تم دنیا سے سفر کر چکے ہو۔ لیکن تم انسان تھے۔ تمھاری جسمانی اور روحانی زندگی شاعری سے لبریز ہے، جو ہمارے لیے اتنی ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے جتنی ہماری ذات اور ہماری زندگی آئندہ نسلوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز ہوگی۔ اور انسانوں کی طرح تم بھی اس دنیا کے عظیم الشان میدانِ عمل میں اپنا کام کر گئے .... اس ڈراما میں تم نے بھی صدقِ دل سے اپنا پارٹ کیا اور تمھاری

یادگار بھی زندہ رکھے جانے کی مستحق ہے . . . تمھاری اولاد ہمدردی سے تمھارا ذکر کرتی ہے تمھیں اپنے عزیز اپنے بزرگ سمجھتی ہے تمھارا زمانہ، طرز معاشرت اور لباس خواہ کچھ بھی رہا ہو خدا کرے تمھاری یادگار کی کبھی متعصبانہ رلئے اور گستاخانہ الفاظ سے توہین نہ کی جائے۔"

تیسرا باب

گریگو۔ ودچ، پی سم سکی، گونچروف

گوگول کی تصانیف نے روسی ناول نویسی کو ایک خاص ڈھرّے پر لگا دیا، اور گو وہ خود "یورپ دوست" اور "سلاف دوست" فرقہ بندی سے علیحدہ تھا، اور اسے نہ روسی قوم کا نقاد کہہ سکتے ہیں نہ وکیل، لیکن اس سے بعد کے ناول نویس میں اس بنا پر امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ روسی قوم کے نقاد گریگورووچ، پی سم سکی، گون چروف، تورگنیف اور سال تکوف ہیں اور اس کے وکیل اکساکوف، دستہ ئفسکی، لسکوف اور تالستائی۔ دونوں طرز کے ناول نویسوں حقیقت نگار اور نکتہ چیں تھے، لیکن "یورپ دوست"، ناول نویس اپنی قوم اور اس کے طرز معاشرت اور خیالات کی خامیاں اور برائیاں دکھا کر رہ جاتے ہیں، "سلاف دوست" اپنے مشاہدے سے نتیجے نکالتے ہیں، اپنی قوم کی تمام خامیوں کو تسلیم کرکے ان کی توجیہ کرتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ایک فلسفۂ حیات تعمیر کریں، ایک قومی نصب العین قایم کریں جو روسی فطرت سے مناسبت رکھتا ہو۔ وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ روسی قوم اپنی زندگی کی تشکیل اور اعلیٰ

اصولوں کی پیروی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

روسی قوم کے نقاد اس خیال پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ روسیوں نے یورپ کی تقلید صحیح طریقے پر نہیں کی ہے اور ان کی فلاح کی صورت یہی ہے کہ زندگی کے گر یورپ سے سیکھیں۔ روسیوں کے وکیل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ روسی قوم نے یورپ کی تقلید کر کے اپنی عزت اور خود داری کھودی ہے اور اس کی ساری مصیبتیں اسی جرم کی سزا ہیں۔ وہ راہ راست پر اُسی وقت آئے گی اور اپنی مصیبتوں سے اسی وقت نجات پاسکے گی جب وہ اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جائے اور اپنی قوت اس مقصد عالی کے حاصل کرنے میں صرف کرے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے دونوں طرز کے ناول نویسوں میں نوک جھونک ہوتی رہی اور چونکہ ادب کے سوا اور کوئی میدان نہ تھا جس میں مختلف عقائد کے لوگ اپنے دل کا بخار نکال سکیں، اس لیے ناول نویسوں میں نہیں تو ان کے پیرووں میں یہ مخالفت اکثر عداوت کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی۔ لیکن ہمیں کسی فریق کی طرف داری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر خالص ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بحث ایسی ہے بھی نہیں جس میں طرف داری کی گنجائش ہو۔

دمیتری وسیلیے وِچ گریگورووچ (۱۹۰۰-۱۸۲۲) مصور اور انشاپرداز تھا۔ اس نے اور دستہ ئفسکی نے ایک ہی انجینیرنگ کالج میں تعلیم پائی۔ یہ پہلا ناول نویس تھا جس نے تعلیم یافتہ روسیوں کو کسانوں کے حالات سے آگاہ کیا اور اس تحریک کو بہت تقویت پہنچائی جس کا

مقصد کسانوں کو آزاد کرنا تھا[1]۔ اس کے سب سے پہلے ناول "ارگن والے"[2]
میں پیٹر برگ کے غریبوں کی زندگی کی نہایت پُر درد تصویر تھی اور اس ناول
سے گریگوروویچ کی خاصی شہرت ہوگئی۔ اس کے بعد وہ کچھ سال دیہات
میں رہا اور ۱۸۴۶ سے ۱۸۵۵ تک ہر دوسرے تیسرے سال ایک ناول
شایع کرتا رہا۔ "گانو" (۱۸۴۶) ایک خاتون کا قصہ ہے جو کسانوں کی شادی
کا تماشا دیکھنا چاہتی ہیں اور ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک کسان
کی لڑکی ایک نوجوان سے بیاہ دی جاتی ہے، لڑکی اور لڑکا دونوں شادی
پر راضی نہیں تھے، ان کے اپنے ارادے، اپنی آرزوئیں تھیں جنھیں اس
جابرانہ حرکت نے خاک میں ملا دیا اور ان بیچاروں کی زندگی برباد ہوگئی۔
"بدنصیب آن تون" (۱۸۴۸) بھی اس قسم کے ظلم و جبر کا قصہ ہے اور اسی
دل گداز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ "شمیدوف کی وادی" (۱۸۵۰)
"ماہی گیر" (۱۸۵۳) اور "نو آباد" میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کا ظلم
اور فطرت اور آب و ہوا کی بے دردی، چکّی کے پاٹ بن کر بیکس کسانوں
اور انھیں جیسے غریب اور مظلوم مزدوروں اور ادنیٰ درجے کے پیشہ وروں
کو کس طرح پیس ڈالتے ہیں۔ ۱۸۵۵ کے بعد گریگوروویچ نے صرف دو ناول اور
ایک آپ بیتی لکھی اور باقی وقت مصوری میں صرف کیا۔ لیکن ۱۸۵۵

---

[1] ۱۸۶۱ تک کسان زمیندار کی ملکیت تھے اور زمیندار کو ان پر ہر طرح کا اختیار تھا سوائے قتل کے۔

[2] یورپ میں بھیک مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ فقیر ایک بڑا ارگن باجا سڑک پر کھڑے ہوکر بجاتے ہیں اور پھر راہ گیروں سے اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

تک کی تصانیف سے اس کا اصلاحی مقصد پورا ہو گیا تھا اور اس نے روسی قوم کے ضمیر کو اس حد تک بیدار اور زود حس کر دیا تھا کہ کسانوں کو آزاد کرنے کی خواہش عام ہو گئی۔

کچھ نقاد ایسے ہیں جو گرگیو۔رووچ کو روس کے بہترین ناول نویسوں میں گنتے ہیں اور تالستائی اور تورگنیف کا ہم پلّہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس رائے میں بہت سی سیاسی اور معاشرتی اغراض شامل ہیں، جنھیں صحیح ذوق ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ گرگیورووچ کے ناولوں میں جذبات پرستی بہت ہے، کسانوں اور مزدوروں کی سیرت کا اس نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ صحیح نہیں اور جو جذبات اور حوصلے اس نے اپنے قصّوں کے اشخاص میں دکھائے ہیں وہ دیہاتی زندگی کی اصلیت سے دور ہیں۔ گرگیورووچ کے قصوں کی ترتیب اور اس کا طرز بیان بھی کسی خاص تعریف کا مستحق نہیں، لیکن اس نے ناول نویسی کے ایک خاص میدان میں ہراول کی خدمت انجام دی ہے اور ہراولوں کی فنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنے میں ہمیشہ رعایت سے کام لینا چاہیے۔

گرگیورووچ کے بعد عوام کی زندگی ناول نویسی کا ایک مستقل موضوع بن گئی اور حقیقت نگاری کی سب سے ہیبت ناک شکل انھیں ناول نویسوں کی تصانیف میں دکھائی دیتی ہے جنھوں نے عوام کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا، پی سم سکی، پومیالوف سکی، رے شت نی کوف اور لیوی توف

الکسے ئی فے اوفی لاکتووچ پی سم سکی (۱۸۲۰-۱۸۸۱) ایک

مفلوک الحال شریف خاندان کا آدمی تھا۔ وہ بہت ذہین تھا مگر بالکل بے اصول اور انشا پردازی اس نے پیٹ پالنے کے لیے اختیار کی تھی۔ اس کے پہلے ناول کی اشاعت دفتر احتساب نے نامنظور کی مگر اس کے بعد کا افسانہ "ایک مہمل آدمی" (۱۸۵۵) بہت مقبول ہوا، ۱۸۵۸ میں اس کا ناول "ہزار روحیں" جو اس کا کارنامہ ہے، شایع ہوا۔ اس ناول میں روس کی قصباتی زندگی کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے اور اس کا ہیرو ایک شخص ہے جو کامیابی کا پرستار ہے اور اس پر اپنی اور دوسروں کی عزت آبرو نہایت خوشی سے قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک غریب لڑکی فاستنیا کو جو اس سے محبت کرتی ہے چھوڑ کر صوبے کے گورنر کی مدخولہ سے روپے کے لالچ میں نکاح کر لیتا ہے اور اس کی ساری زندگی جھوٹ، فریب اور دغابازی کا نفرت انگیز سلسلہ بن جاتی ہے۔ آخر میں اس کا ضمیر اسے کچھ ستاتا ہے اور وہ ناستیا سے شادی کر کے اپنا حرام کا مال نیک کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس کی زندگی اور اس ماحول کو جس میں ایسی زندگی ممکن ہے، دیکھ کر پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ روس بھلے مانسوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ "ہزار روحوں" کے بعد پی سم سکی روسی کسانوں کی زندگی کے متعلق افسانے لکھتا رہا اور ان سب میں بھی انسانی فطرت اور خصوصاً روسی سرشت کی طرف سے وہی تعصب ظاہر ہوتا ہے جو "ہزار روحوں" میں اس قدر نمایاں ہے۔ پی سم سکی کے نزدیک انسان کے عمل کے صرف دو محرک ہیں، لالچ اور شہوت، اور اس کے افسانے اور ناول سب اسی

دعوے کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ قابل اعتراض ضرور ہے، مگر اس کی وجہ سے پی سم سکی کی حقیقت نگاری پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کے کیرکٹر گریگوروویچ کے مقابلے میں اصلیت سے زیادہ قریب ہیں اور وہ مصور بھی بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ پی سم سکی نے ایک ڈراما "بھوٹی تقدیر" بھی لکھا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محض اس قانون[1] کی وجہ سے جو ایک انسان کو دوسروں پر ناجائز حقوق دے دیتا ہے اچھے خاصے نیک دل آدمی کیسے بد ہو جاتے ہیں اور ان کے اخلاق کس قدر بگڑ جاتے ہیں۔

پی سم سکی کے بعد اس رنگ کی حقیقت نگاری کا فرض پومیالوف سکی (۱۸۳۵-۱۸۶۳) رے شت نی کوف (۱۸۴۱-۱۸۷۱) اور لے وی توف (۱۸۴۲-۱۸۷۷) نے ادا کیا۔ یہ حقیقت نگاری فرض اس لحاظ سے تھی کہ روسی زندگی کے واقعی بہت سے تاریک پہلو تھے اور روشن خیال روسیوں پر لازم تھا کہ ان سے خود واقفیت حاصل کریں اور دوسروں کو آگاہ کریں۔ پومیالوف سکی اور رے شت نی کوف دونوں دیہاتی پادریوں کے لڑکے تھے اور ان کی آواز سب سے پہلے اُن تعلیم گاہوں اور مدرسوں کے خلاف بلند ہوئی جن میں پادریوں کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ ان تعلیم گاہوں کے مدرس عموماً غریب اور آوارہ مزاج ہوتے تھے، ان کی معلومات اس قدر محدود ہوتی تھیں کہ وہ

---

[1] یعنی وہ قانون جس کے رو سے کسان زمیندار کی ملکیت بنا دیے گئے تھے۔

کسی طرح معلمی کے اہل نہیں تھے، ان کے نزدیک تعلیم کے معنے بس یہ تھے کہ چند کتابیں زبانی یاد کرلی جائیں۔ طالب علموں پر ہر قسم کی بیجا سختیاں کی جاتی تھیں، اور ذرا ذرا سی بات پر ان کے کوڑے لگائے جاتے تھے۔ پادریوں کی تعلیم گاہوں کی ظالمانہ سزائیں برداشت کرنے کے ساتھ ہی ان دونوں ناول نویسوں نے افلاس، فاقہ کشی اور سردی کی سختیاں بھی بہت جھیلیں اور اپنی اور پرائی مصیبتیں ان دونوں کی اکثر تصانیف کا موضوع ہیں۔ پومیا لوف سکی کے مشہور ناول دو ہیں، "دنیا داروں کا سکھ" اور "مولوتوف"، جن میں اس نے ان غریبوں کی ذہنیت دکھائی ہے جو معاشرتی نظام کی ناانصافی محسوس کرتے ہیں، اسے درہم برہم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، مگر ہمت ہار کر یا تو چین سے دن گزارنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں یا ایسے بیزار ہو جاتے ہیں کہ ایذا رسانی کے سوا انھیں اور کوئی شغل پسند نہیں آتا۔ مگر رے شت نی کوف کے کیرکٹر اس احساس سے بھی محروم ہیں۔ جس صوبہ میں رے شت نی کوف کی ولادت اور پرورش ہوئی وہ یورپی روس میں شامل تھا، مگر وہاں کے رہنے والے نیم وحشی تھے اور ہرگز اس لایق نہ تھے کہ انسان کہلائیں۔ رے شت نی کوف نے "اہل پودلی پووا" کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جس میں ان لوگوں کی معاشرت اور ذہنیت بیان کی ہے اور اس ناول کو پڑھ کر واقعی رونا آتا ہے۔ یہ لوگ تو پھر بھی نیم وحشی تھے۔ "حضرات گلوموف" جس میں کوہ اورال کی کانوں کے مزدوروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور بھی

زیادہ دردناک ہے۔ اس میں وہ مصیبتیں جن کا ہر غریب کو جو روٹی کا محتاج ہو سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ظلم جو انسان اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار پا کر دوسروں پر کرتے ہیں اور بھی زیادہ بھیانک شکل میں نظر آتا ہے۔

"اجنبی لوگوں" میں رے شت نی کوف نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے اور اس کی داستان بھی بے انتہا پر درد ہے۔ پادریوں کے اسکول میں اس نے ایک ہی دن میں دو دو بار کوڑے کھائے، اسکول چھوڑ کر بھاگ گیا، فاقہ کشی کی، ایسے رہبانوں کی صحبت میں رہا جو رات کو خانقاہ سے چھپ کر نکل جاتے تھے اور آوارہ عورتوں کے یہاں دن بھر کی عبادت کی تلافی کرتے تھے۔ تعلیم ختم کرنے پر اسے نوکری ملی، مگر اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ پیٹ بھرنے اور تن بدن ڈھکنے کو بھی کافی نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر تک رے شت نی کوف کی حالت یہی رہی شہر کی زندگی بھی اسے دیہات سے کسی طرح بہتر نہ معلوم ہوئی اور اپنے دو آخری ناولوں میں اس نے شہر کے غریبوں کا حال سنایا ہے۔ رے شت نی کوف کی "کھری بات" ضرب المثل ہے اور یہ کھری بات وہ اپنے خاص انداز سے کہتا ہے۔ اس کے ناولوں میں ہیرو نہیں ہوتے، صرف انسانوں کے گروہ ہوتے ہیں جن میں سب لوگ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتے ہیں، کسی کو کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں ہوتا اور مختلف افراد کی صورتیں اور سیرتیں بہت مشکل سے اور رفتہ رفتہ پہچانی جاتی ہیں۔ اُسے انسان کی ذات سے زیادہ اس فضا سے سروکار ہے جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے ناولوں میں شروع سے آخر تک

دراصل یہی فضا دلچسپی کا مرکز ہوتی ہے۔ رے سٹ نی کوف کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ روس کے دورافتادہ صوبوں، قصبوں اور شہروں میں یہ فضا لوگوں کی ہمت کس طرح لپست کر دیتی ہے، وہ اپنی انسانیت محفوظ رکھنے کے لیے کیوں کر ہاتھ پیر مارتے ہیں اور آخر میں بھوک یا شراب انھیں کیسے تباہ کر دیتی ہے۔ رے رشت نی کوف کی مصوری کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ آدمیوں کا بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا دکھلاتا ہے یا ان کا شراب خواری کی عادت میں اس طرح مبتلا ہو جانا کہ ان کی قوت ارادہ بالکل معطل ہو جاتی ہے۔ لے وی توف، پومیالوف سکی اور رے شت نی کوف کی طرح پادریوں کے خاندان سے تو نہیں تھا، لیکن اس نے بھی غربت اور افلاس کی انتہائی مصیبتیں جھیلیں اور اس کی عمر کا زیادہ تر حصّہ غریبوں کی صحبت میں گزرا۔ شہر کے غریبوں کے حالات اس نے اپنے دو آخری ناولوں میں بیان کیے ہیں، اور اس کے شہری غنڈوں کے کیرکٹر ایسے ہیں کہ ناول میں ان کا حال پڑھ کر بھی ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر لے وی توف کا کارنامہ اس کا پہلا ناول ہے، جس میں اس نے اپنے وطن کے مناظر اور اپنی بچپن کی زندگی کا قصّہ سنایا ہے۔

حقیقت نگاری کا وہ طرز جو ان تینوں ناول نویسوں نے اختیار کیا، روشن خیال روسیوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے بہت ضروری تھا لیکن سچ پوچھیے تو یہ ایک بند گلی تھی جس میں پہنچ کر باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ ناول نویسی کا ایک مقصد یہ ضرور ہے کہ انسان کو عام زندگی سے واقف

اور وابستہ رکھے، کیوں کہ اس کے بغیر تہذیب میں اصلیت اور اخلاقی معیار میں صحت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر وہ ناول نویس جو اپنا مقصد صرف اصلی حالات بیان کر دینے تک محدود رکھے آرٹ کے اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا اور خواہ وہ انشا پردازی میں کتنا ہی کمال دکھلائے اس کی تصانیف کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو ایک سرکاری رپوٹ کی۔ پومیالوف سکی، رے شت نی کوف اور لے وی توف کے ناول انشا پردازی کے بہت اچھے نمونے ہیں، لیکن ناول نویسی میں ان کا رتبہ بلند نہیں، کیوں کہ وہ دکھاتے بہت کچھ ہیں، سمجھاتے کچھ بھی نہیں، ضمیر کو بے چین کر دیتے ہیں مگر نہ ذہن کو روشن کرتے ہیں نہ دل میں حوصلے پیدا کرتے ہیں عوام کی زندگی، جو روسی تہذیب کے ماتھے پر کلنگ کے ٹیکے سے کم نہ تھی، لے وی توف کی تصانیف کے بعد پھر صدی کے آخر میں مکسیم گورکی کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔ اس درمیان میں لوگوں کی توجہ دوسرے مسائل کی طرف منتقل ہو گئی تھی، ناول نویسوں نے خوش حال اور تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت، ان کی کوششوں اور کوششوں کے انجام کو اپنا موضوع بنا لیا تھا۔

اوان الک سے یوِچ گونچروف (۱۸۱۲-۱۸۹۱)

گونچروف دولت مند زمینداروں کے گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کی ساری زندگی آسائش اور آرام سے گزری۔ انشا پردازی کا سلسلہ اس نے ۱۸۴۷ میں "ایک روزمرہ کی کہانی سے" شروع کیا۔ اس کے دوسرے سال ایک ناول "اوب لوموف" کے پہلے چند باب ایک اخبار

میں نکلے، مگر یہ ناول ختم دس سال کے بعد ہوا۔ اس عرصے میں گونچروف نے ایک جہاز پر دنیا کا سفر کیا اور اپنے سفر کے حالات "جہاز پے لیس" کے عنوان سے شایع کیے۔ اس کی بقیہ عمر کی ادبی کارگزاری کل دو تصانیف ہیں، ایک ناول "دریا کے اونچے کنارے پر" اور ایک اس کی "آپ بیتی"۔

"روزمرّہ کی کہانی" ایک روسی نوجوان کا قصّہ ہے۔ اس کے پیشِ نظر زندگی کے دو طریقے ہیں جن میں سے ایک اسے انتخاب کرنا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک غریب مگر نہایت زندہ دل، محبت کیش اور بلند حوصلہ لڑکی سے شادی کرے اور اس کی محبت اور رفاقت کو اپنی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بنائے، دوسرا یہ کہ وہ ایک امیر مگر نکمی لڑکی کا شوہر بن کر چین سے زندگی گزارے۔ نوجوان امیر لڑکی کا انتخاب کرتا ہے۔ اس سے گونچروف کو یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اعلیٰ مقاصد کا ادنیٰ دنیاوی اغراض پر قربان ہونا، انسانیت کا حیوانی عیش و آرام کے بدلے فروخت ہونا روس میں ایک روزمرّہ کی کہانی ہے۔ "دریا کے اونچے کنارے پر" ٹالسٹائی کے ناول "جنگ اور امن" کی طرح روسی زندگی کی تصویر بہت بڑے پیمانے پر کھینچنے کی کوشش ہے، مگر گونچروف اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا اور یہ ناول ناکامیاب رہا۔ اس کا اصل کارنامہ "اوب لوموف" ہے اور اسی کی بنا پر وہ روس کے سب سے بڑے ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس ناول میں گونچروف نے اپنے ہیرو اوب لوموف، ایک بتیس برس کے خوش حال زمیندار کی شکل میں جمود اور کاہلی کا ایک مجسمہ پیش کیا ہے جو روسی سرشت کیا نوع انسان کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اوب لوموف نہایت نیک، سیدھا سادا آدمی ہے جو کسی کی نسبت بُرے خیال بھی اپنے دل میں نہیں آنے دیتا، اس کی استعداد بہت اچھی ہے، موسیقی میں ستھرا مذاق رکھتا ہے، اسے انشا پردازی کا شوق ہے اور جب کبھی مجبور ہوتا ہے تو تقریر بھی بہت اچھی کر لیتا ہے، اس کی صورت اور طور طریق سے شرافت ٹپکتی ہے، دوسروں کا غم اسے بے چین کر دیتا ہے، اسے دل سے یہ آرزو ہے کہ دنیا سے درد اور تکلیف کو مٹا دے اور اپنی انسانی ہمدردی ثابت کرنے کے لیے وہ بہت دنوں سے سوچ رہا ہے کہ اپنے کسانوں کو آزاد کر دے لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب ہے جو ان سب پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ عیب اس کی کاہلی ہے جو اس کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہے کہ اس کی شخصیت کو کسی طرح اُبھرنے نہیں دیتی اور وہ ذہنی اور اخلاقی سرمایہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں کام آ سکتا تھا بڑے افسوس ناک طریقے پر ضایع ہوتا ہے۔ اوب لوموف کا دل کچھ بھی کہتا ہو اور وہ کچھ بھی چاہتا ہو، اس کی کاہلی نے اسے جو منطق سکھائی ہے وہ سب کچھ رد کر دیتی ہے اور جو مسئلہ درپیش ہو، خواہ پلنگ سے اُٹھنا یا کسانوں کو آزاد کرنا، اوب لوموف اس کے ہر پہلو پر غور کرنے میں، اس کی اونچ نیچ سوچنے میں رہ جاتا ہے اور عمل تو ایک طرف ارادہ کرنا بھی اس کے لیے

ایک مہم بن جاتی ہے جو کبھی سر نہیں ہوتی۔

ناول کے پہلے حصّے میں گونچروف نے اوب لوموف کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے اور اس کی زندگی کے ایک دن کی سرگزشت سُنائی ہے۔ اوب لوموف کی صورت شکل اچھی ہے، مگر کوئی خاص بات نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔ قد لمبا ہے جسم ذرا بھاری ہے، آنکھوں سے نیکی ٹپکتی ہے جو قریب قریب معصومیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے میں نرمی ہے اور انتہائی سکون کی ایک کیفیت جو ہر وقت قائم رہتی ہے، کیوں کہ وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتا اور اس لیے نہ تھکتا ہے نہ اس کی طبیعت اُکتاتی ہے۔ اس کا "شغل" لیٹے رہنا ہے۔ لیٹے رہنا اوب لوموف کے لیے نہ تو ضروری تھا، جیسے مریض کے لیے، یا اس شخص کے لیے ہوتا ہے جو سونا چاہتا ہے، نہ اتفاق کی بات تھی، جیسے اس شخص کا لیٹنا جو تھک گیا ہو، نہ لطف حاصل کرنے کا ذریعہ، جیسے کاہلوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا معمول ہی یہ تھا کہ لیٹا رہے۔ جس دن کا ذکر ہے " وہ بہت سویرے جاگ اٹھا یعنی آٹھ بجے، یہ اس کی عادت کے خلاف تھا۔ کسی وجہ سے وہ بہت متفکر تھا، اس کے چہرے پر وقتاً فوقتاً ایک کیفیت ظاہر ہوتی تھی جو نہ بالکل خوف کی تھی اور نہ بالکل ملال یا پریشانی کی، معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں ایک قسم کی جنگ جاری ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے عقل بھی موقع پر پہنچ نہیں پاتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کل اوب لوموف کے پاس اس کے گانْو کے مکھیا کا ایک

خط آیا تھا جس میں ناگوار خبریں تھیں۔ مُکھیا جو ناگوار خبریں سُنا سکتا ہو، ظاہر ہیں، فصل خراب ہوئی، کسان لگان ادا کرنے میں سستی کر رہے ہیں آمدنی کم ہوگی۔" اس خط کا اوب لوموف پر بہت اثر ہوا اور اسے یقین ہوگیا کہ اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کرنا ناگزیر ہے۔" آنکھ کھلتے ہی اس نے ارادہ کیا کہ فوراً اٹھ بیٹھوں گا، ہاتھ منہ دھو کر چائے پینے سے پہلے خوب غور کروں گا کوئی تدبیر سوچوں گا، مُکھیا کو خط لکھ بھیجوں گا اور اس معاملے میں جیسی چاہیے سرگرمی دکھاؤں گا۔ مگر وہ آدھ گھنٹے تک پڑا رہا، اور اپنے اس ارادے کی وجہ سے پریشان ہوتا رہا، پھر اس نے طے کیا کہ چائے کے بعد بھی اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اور چائے حسب معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے پی جا سکتی ہے اور لیٹے لیٹے غور کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں ... ساڑھے نو بج گئے اوب لوموف چونکا۔ اس نے پریشان ہو کر زور سے کہا "یہ میں آخر کیا کر رہا ہوں؟ آخر انسان میں کچھ غیرت بھی تو ہونی چاہیے۔ اب کام میں جُٹ جانے کا وقت آگیا ہے! جہاں طبیعت کو ذرا ڈھیل دی اور بس! ... اس نے اپنے نوکر کو پکارا " زخار!" جب تک زخار پہنچے پہنچے اوب لوموف پھر خیالات میں ڈوب گیا اور زخار کے آنے کی اسے بہت دیر تک خبر ہی نہ ہوئی، زخار اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ آخر کار وہ کھانسا۔ اوب لوموف نے پوچھا "کیا ہے"؟

"آپ ہی نے تو بلایا تھا"۔

اوب لوموف نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا:

"بلایا تھا؟ ہاں، آخر میں نے کس لیے بلایا تھا؟ کچھ یاد نہیں! خیر ابھی تو تم جاؤ، پھر شائد مجھے یاد آجائے" زخار چلا گیا اور اوب لوموف لیٹا لیٹا اس کمبخت خط کے بارے میں سوچتا رہا، یوں ہی وقت گزرتا رہا"۔ اوب لوموف کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی، وہ بار بار چونک اٹھتا ہی، زخار کو بلاتا ہی، کبھی خط کے لیے، کبھی رومال تلاش کرنے کو، کبھی اس سے کہتا ہی منہ دھونے کا سامان تیار کرو۔ مگر ہر دفعہ انجام یہی ہوتا ہی کہ اوب لوموف پلنگ پر پھر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہی۔ زخار اس سے کہتا ہی اور اس سے پہلے کئی مرتبہ کہہ چکا ہی کہ مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہی اور اس خبر سے اوب لوموف کو بہت پریشانی ہوتی ہی، مگر یہ محرک بھی اسے حرکت میں لانے کے لیے کافی نہیں۔ زخار اسے سمجھاتا ہی کہ مالک مکان کو خط لکھ کر نوٹس واپس لے لینے پر آمادہ کرے، اوب لوموف لکھنے کا وعدہ کرتا ہی، مگر اس وقت نہیں پھر کبھی۔ اسی گفتگو کے دوران میں دروازے کی گھنٹی بجتی ہی، وول کوف، ایک نوجوان جس سے اوب لوموف کی جان پہچان ہی، اس سے ملنے آیا ہی۔

وول کوف ان لوگوں میں سے ہی جو ملنے جلنے اور ناچ گانے کے شوقین ہوتے ہیں اور سارا دن ایک کے یہاں سے دوسرے کے یہاں اور وہاں سے تیسرے کے یہاں جاتے ہیں اور گپ شپ کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ اوب لوموف کو اپنا نیا سوٹ دکھاتا ہی، اپنی خوشگوار مصروفیتوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہی اور خوشی سے کہتا ہی

کہ مجھے دن بھر میں دس جگہ مہمان ہونا پڑتا ہی۔ اوب لوموف یہ سُن کر تعجب سے پوچھتا ہی کہ اس بے فائدہ دوڑ دھوپ سے تمھاری طبیعت کیوں نہیں گھبڑا جاتی اور جب وہ چلا جاتا ہی تو اوب لوموف لیٹے لیٹے سوچتا ہی:

"ایک دن میں دس جگہ، کیا بد قسمت آدمی ہی! اور اسی کا نام ہی زندگی!... پھر انسانیت آخر کیا شی ہی؟ یہ شخص خدا جانے کیوں اپنی ہستی کو پاش پاش کر کے بکھیر رہا ہی؟ کبھی کبھی تھیٹر میں جھانک لینے، کسی خوبصورت لیڈا[1] پر عاشق ہو جانے میں تو کوئی حرج نہیں... مگر ایک دن میں دس جگہ جانا! کیا بد قسمت آدمی ہی!" اوب لوموف نے یہ کہ کر کروٹ بدلی، پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور اس پر خوش ہوا کہ وہ ایسے فضول مشاغل اور خیالات نہیں رکھتا، دوڑ دھوپ نہیں کرتا، اطمینان سے لیٹا ہی اور نہ اس نے اپنا انسانی وقار کھویا ہی اور نہ سکونِ قلب۔

وول کوف کے بعد اور لوگ اوب لوموف سے ملنے آتے ہیں اور ہر شخص اسے اپنے اپنے طرز پر زندگی اور زندگی کی جد و جہد سے دلچسپی دلانا چاہتا ہی۔ اوب لوموف باتیں کرتا رہتا ہی، جو سننے پر آمادہ ہوا اسے اپنی دونوں مصیبتوں کا حال سُناتا ہی، یعنی مکھیا کے خط کا اور مالک مکان کے نوٹس کا۔ مگر سب کچھ لیٹے لیٹے۔ لوگ آئے اور

---

[1] اکثر لڑکیوں کا نام ہوتا ہی۔

چلے گئے اور وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ اس وقت تک اس نے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ زخار نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اوب لوموف کو کوچ پر سر کے نیچے ہاتھ رکھے لیٹا پایا۔ اس کے سامنے کتاب رکھی تھی۔ زخار نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے پوچھا "یہ آپ پھر کیسے لیٹ گئے؟"

اوب لوموف نے ایک سانس میں جلدی سے کہا "کام میں حرج نہ کرو۔ دیکھتے نہیں ہو میں پڑھ رہا ہوں۔"

زخار سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا، اس نے جواب دیا "اب منہ دھونے اور خط لکھنے کا وقت آگیا ہے" اوب لوموف نے کچھ چونکتا ہو کر کہا "ہاں" واقعی وقت آگیا ہے۔ اچھا ابھی تم ٹھیرو میں ذرا غور کر رہا ہوں"

زخار کے اصرار کے باوجود اوب لوموف نے کتاب کا صفحہ جو کھلا پڑے پڑے زرد ہو گیا تھا اس جگہ سے جہاں پچھلے مہینے میں چھوڑا تھا آخر تک پڑھ لیا، پھر کتاب کو اس کے خاص مقام پر رکھ دیا، جماہی لی اور اپنی دونوں مصیبتوں کے خیال میں جو اسے بہت تنگ کر رہی تھیں محو ہو گیا، لیکن اصل معاملے پر غور کرنے کے بجائے وہ اپنی طبیعت کو رنگین اور دل ربا خواب دکھا کر بہلانے لگا۔ یہ خواب کبھی ایک عالیشان مکان اور خوبصورت باغ کے تھے، کبھی ایسی شاعرانہ دیہاتی زندگی کے جس کی رونق ایک حسین محبت کیش اور وفادار بیوی کی ذات سے تھی۔ پانچ منٹ اوندھا لیٹنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کروٹ لے کر پھر پیٹھ کے بل لیٹ گیا، اس کا چہرہ ایک نازک دل کش جذبے سے چمک اٹھا،

وہ خوش اور مطمئن تھا مگر گھر کے پاس کسی کے چلّانے سے وہ پھر چونک پڑا۔ اُٹھنے، انگڑائی لینے، جماہی لینے اور جوتا پہننے کے تمام مرحلے طے کرکے اس نے ناشتہ کیا، امورِ خانہ داری، حساب، کتاب پر زخار سے کچھ بحث کی اور مالک مکان کو خط لکھنے بیٹھا۔ آدھا لکھ چُکا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو جملوں میں "جو" اور "کہ" دو بارہ آگیا ہے، اس پر وہ ایسا شرمندہ اور پریشان ہؤا کہ اس نے خط پھاڑ کر پھینک دیا، اتنے میں ڈاکٹر آیا اور اس نے اوب لوموف کی شکائتیں سُن کر اسے مشورہ دیا کہ فوراً جرمنی یا فرانس کی کسی صحت گاہ کو چلے جاؤ، ورنہ دل پر چربی چھا جائے گی۔ اوب لوموف کی مصیبتوں میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ مگر موت کا خوف بھی اس میں چستی نہ پیدا کرسکا، بلکہ اس نے چین سے لیٹے رہنے کی آرزو کو اور قوی کردیا۔ زخار نے صلاح دی کہ سیر کیجیے، لوگوں سے ملیے جلیے، تھیٹر میں جائیے۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور جب مکان بدلنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے زخار کی زبان سے نکل گیا کہ "اور سب" بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں، تو اوب لوموف آپے سے باہر ہوگیا۔

"تو میں "اور سب" کی طرح ٹھیرا! کیا میں روزی کی تلاش میں پھرتا ہوں؟ مزدوری کرتا ہوں؟ کیا میرے پاس کھانے کو کم ہے؟ کیا میں ایسا دُبلا پتلا ہوں کہ ہڈی پسلی کے سوا کچھ نہ ہو اور جو دیکھے اسے ترس آجائے؟ کیا میرے

پاس کسی چیز کی کمی ہے؟ میں ہمیشہ تو یہی سمجھتا رہا کہ میرے پاس کام کرنے کو لوگ موجود ہیں، جو چاہوں وہ لے آئیں گے، جو کہوں وہ کر دیں گے۔ میں نے خدا کے فضل سے جب سے ہوش سنبھالا اب تک اپنے ہاتھ سے موزے نہیں پہنے، میں بھلا کیوں کسی طرح کی تکلیف اُٹھاؤں؟ تمھیں یہ سب معلوم ہے، تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میں کس دلار سے پلا ہوں، میں نے نہ کبھی یہ جانا کہ سردی کیا بلا ہے نہ یہ کہ بھوک کسے کہتے ہیں، کوئی حاجت نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو، آج تک اپنی روزی نہیں کمائی، کبھی ایسا کام نہیں کیا کہ ہاتھ پیر میلے ہوں۔ تو پھر تم میرا "اور سب" سے کیوں مقابلہ کرتے ہو؟ کیا میری صحت ایسی ہے جیسے ان "اور سب" لوگوں کی ہوا کرتی ہے؟ کیا میں یہ ساری محنت برداشت کر سکوں گا؟"

پھر اوب لوموف اُس شخص کی طرح جس کی کافی قدر نہ کی گئی ہو، شکایت آمیز لہجے میں کہتا ہے "مگر اس کے باوجود میں دن رات فکر میں رہتا ہوں، محنت کرتا ہوں، کبھی کبھی سر میں آگ سی جلنے لگتی ہے، دل معلوم ہوتا ہے بیٹھا جاتا ہے، رات کو نیند نہیں آتی، کروٹیں بدلتا رہتا ہوں ہر وقت اس فکر میں رہتا ہوں کہ کون سی صورت بہتر ہوگی۔ اور یہ سب کس کے لیے؟ اپنے کسانوں کے لیے، گویا تمھارے لیے، تم مجھے سر سے

کمبل لپیٹے لیٹا دیکھ کر سمجھتے ہو گے کہ میں آرام سے پڑا سو رہا ہوں۔ نہیں اس وقت میں نیند میں نہیں ہوتا ہوں، بلکہ اس گہری فکر میں ہوتا ہوں کہ اپنے متعلقین کے لیے ہر ضرورت کی چیز کیسے مہیا کروں کہ وہ دوسروں پر حسد نہ کریں، خدا کی بارگاہ میں میری شکایت نہ کریں، بلکہ شکر ادا کریں اور میرے لیے بھی دعائیں مانگیں... مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی بدسلوکی محسوس کر لی ہے اور اب آئندہ کبھی اپنے آقا کا" اور سبھوں" سے مقابلہ نہ کروگے۔ اپنی بدسلوکی کا کفارہ تم اس طرح سے دو کہ مالک مکان کو سمجھا بجھا کر راضی کر لو اور مجھے مکان بدلنے کی تکلیف سے بچاؤ۔ تم بھی اپنے آقا کو کیا خوب چین سے رکھتے ہو! مجھے بالکل بدحواس کر دیا، ممکن ہے کسی نئے مفید خیال کو میرے ذہن میں آنے سے روک دیا ہو اور اس میں نقصان کس کا ہے؟ تمھارا اپنا۔ میں نے تمھیں لوگوں کے واسطے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ تمھارے فائدے کے لیے ملازمت سے دست بردار ہوا، تمھارے ہی خاطر قید میں پڑا رہتا ہوں۔ خیر... دیکھو اب تین بج رہے ہیں! کھانے کے وقت میں صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں اور دو گھنٹے میں بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ خاک بھی نہیں، اور کام کا انبار ہے، اس لیے میں خط اگلی ڈاک سے بھیجوں گا اور گانو کے انتظام کی تجویز پر کل غور کروں گا۔ اچھا اب میں تھک گیا ہوں، ذرا دیر لیٹتا ہوں... ممکن ہے گھڑی بھر سو بھی لوں۔ تم مجھے ساڑھے چار بجے جگا دینا۔" اس سرشت اور ذہنیت کا آدمی دنیا میں جو کچھ کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ممکن ہے اوب لوموف کی ساری عمر

اسی طرح کٹ جاتی جیسے یہ دن جس کا حال بیان ہوا ہے۔ اتفاق سے اس کا بچپن کا دوست شتولٹس اس وقت پیٹر برگ آیا اور اس کی زبردستی سے اوب لوموف نے کچھ دن کے لیے جمود اور کاہلی کی مصروفیتوں کو خیرباد کہہ کر دنیا کو منہ دکھایا۔ اسی سلسلے میں اوب لوموف کی آخری آزمایش ہوئی اور اسے اپنا طرز زندگی اور فلسفۂ حیات بدلنے کا آخری موقع ملا۔ مگر وہ ہمّت ہار گیا اور جمود کے پھندے سے نہ نکل سکا۔ یہ سرگزشت ناول کے دوسرے حصّے میں سُنائی گئی ہے۔

شتولٹس کے توسط سے اوب لوموف کا تعارف اولگا نامی ایک لڑکی سے ہوگیا۔ اولگا شتولٹس کی زبانی اوب لوموف کا سارا حال سُن چکی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ جس طرح بھی ہوسکے گا اوب لوموف کو راہ راست پر لاؤں گی اور اس کے سوئے ہوئے دل کو جگاؤں گی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ہر وقت پرستش کی نہیں تو کم سے کم قدردانی اور تعریف کی منتظر رہتی ہیں، وہ سوسائٹی کے اس بیہودہ رواج کی بھی پابند نہ تھی جو ایک طرف تو لڑکیوں کو سکھاتا ہے کہ مردوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے میں پیش قدمی نہ کریں اور دوسری طرف انھیں مجبور کرتا ہے کہ جس صورت سے بھی ہوسکے مردوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ سوسائٹی میں اولگا "ناکامیاب" سمجھی جاتی تھی، اس کی سادگی اور خلوص، سنجیدگی اور شرافت کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اور اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس کی صحبت اور دوستی میں وہ اپنے سچّے اور گہرے نسوانی جذبات کو ظاہر

جو نمود اور ظہور کے لیے بے تاب تھے۔ اوب لوموف کی طبیعت بھی بناوٹ اور اوچھے پن سے پاک تھی، اسے ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جن میں نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنا سارا وقت صرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ اس کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ ملاقات کے پہلے دنوں میں جب شٹولٹز نے اولگا سے کچھ گانا سنانے کی فرمایش کی اور اولگا نے اوب لوموف سے پوچھا کہ آپ کی کیا خواہش ہے تو اوب لوموف نے بلا تامل کہہ دیا کہ میں گانا سنانے کی فرمایش میں شریک نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کیسا گاتی ہیں اور میں جھوٹی تعریف کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جب اولگا نے گانا سنایا اور آخر میں ایک نہایت پُر درد گیت گایا جو اسے خاص طور سے پسند تھا تو اس نے دیکھا کہ اوب لوموف کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس واقعہ کا اولگا کے دل پر بہت اثر ہوا، یوں بھی اسے اوب لوموف میں بہت سی ایسی صفات نظر آئیں جو واقعی قابلِ قدر تھیں اور اس نے نہایت بے تکلفی سے اوب لوموف کو اپنے گھر پر بلانا، اسے چھیڑ چھیڑ کر مختلف مسئلوں پر بحث کرنا اور زندگی سے دلچسپی لینے پر مجبور کرنا شروع کر دیا، رفتہ رفتہ اس نے اوب لوموف کی جھجھک دور کر دی، اس کی عادتیں کچھ درست کر دیں، کاہلی کچھ کم کر دی۔ دونوں یہ محسوس کرنے لگے کہ ان میں ایسی گہری دوستی قایم ہو گئی ہے جس کے سامنے اس جذبے کی کوئی حقیقت نہیں جسے عشق کہتے ہیں اور جس کا دعویٰ ہر کس و ناکس کیا کرتا ہے۔ لیکن جب

تعلقات اس حد تک پہنچ گئے اور اوب لوموف نے دیکھا کہ سب کا خیال ہے کہ وہ اولگا سے شادی کرے گا اور خود اولگا بھی یہی چاہتی ہے تو وہ بہت گھبرایا۔ چند روز کے لیے اولگا جیسی لڑکی کی خاطر اس نے اپنے فلسفۂ حیات کو معطل کر دیا تھا اور طبیعت پر جبر کرکے اپنا پرانا طرز زندگی بدل دیا تھا، لیکن اولگا سے شادی کرنے کے معنے یہ تھے کہ اسے اولگا کی وجہ سے اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے انقلاب پیدا کرنا پڑے گا اور وہ پرانی عادتیں جن میں اس نے پرورش پائی تھی اور جنھیں وہ انسانیت کا جوہر سمجھتا آیا تھا سب ترک کرنی ہوں گی۔ اولگا کی محبت، اس اعلیٰ زندگی کی تصویر جو اولگا کی شخصیت اور حوصلے اس کا دل لبھانے کے لیے اس کے سامنے پیش کر رہے تھے، یعنی وہی محرکات جو کسی دوسرے شخص کو اولگا کی طرف اور زیادہ مائل کرتے، اوب لوموف کو وحشت دلانے لگے۔ آخر میں اولگا کو بھی یقین ہو گیا کہ اوب لوموف کے جمود اور کاہلی سے لڑنے کی اس میں طاقت نہیں اور یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ اپنی محبت اور زندہ دلی سے اس خاک کے تودے میں زندگی اور حرکت پیدا کر سکے گی۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے اس نے دوستی کی بنیاد ڈالی تھی، اسی طرح اس نے اسے کھود کر پھینک دیا۔ اس نے اوب لوموف سے کہا کہ "میں سمجھتی تھی تم میں جان ڈال سکوں گی، تمھاری زندگی ویسی ہی ہو گی جیسی میرا دل چاہتا ہے۔ مگر تم تو زمانہ ہوا مر چکے۔ میں نے اپنی غلطی پہلے سے نہیں محسوس کی، منتظر رہی، ... امید کرتی

رہی اور اب دیکھو کیا انجام ہوا"۔ محبت میں مایوس ہونے، امیدوں کے سرسبز درخت کو مرجھاتے ہوئے دیکھنے سے بڑا سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اس آخری ملاقات کے بعد ادب لوموف اور اولگا دونوں بیمار پڑ گئے، بیماری کے بعد ادب لوموف پر اس کا جمود پھر پورے طور سے حادی ہو گیا اولگا نے شٹولٹز سے شادی کر لی اور ادب لوموف کی دوستی کی یاد ان حسرتوں میں شامل ہو گئی جو پوری نہ ہونے پر بھی دل کو عزیز رہتی ہیں۔

گونچروف نے ادب لوموف کی سیرت میں زیادہ تر اپنی اور روس کے خوش حال زمینداروں کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ اپنی "آپ بیتی" میں اس نے اپنے بچپن کا جو حال سنایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے زمینداروں کے بچوں کی تربیت عموماً ایسی ہوتی تھی کہ بڑے ہو کر سب ادب لوموف کے سے ہو جائیں اور غالباً گونچروف اپنے ہیرو کے جمود کی تصویر کھینچنے میں اس قدر کامیاب اسی سبب سے ہوا کہ وہ ادب لوموف کی اکثر خصوصیات اور رجحانات اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا۔ روسی آب و ہوا بھی انسان کو جمودی فلسفۂ حیات کی طرف مائل کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک جمود کا ایک عنصر طبیعت میں شامل نہ ہو انسان کے لیے روس کے سخت جاڑے، جو ہر قسم کی نقل و حرکت مشکل کر دیتے ہیں اور مکانوں میں بند رہنے پر مجبور کرتے ہیں، برداشت کرنا ناممکن ہو جائے۔ جب گونچروف کا ناول شائع ہوا، تو تمام روشن خیال روسیوں نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ سب کے سب ایک حد تک ادب لوموف ہیں

مشابہ اور اسی کی طرح جمود کے مرض میں مبتلا ہیں، ادب لوموف روس کی قومی خصوصیات کا مجسمہ قرار دیا جانے لگا اور لوگوں کو "اوبلوموفی رنگ" روسی تاریخ، روسی طرزِ معاشرت اور روسی فلسفۂ حیات کے ہر پہلو میں نظر آنے لگا۔ جمود اور کاہلی، آرزوؤں اور امنگوں کی پستی، یہ خوف کہ کہیں جدوجہد، جفاکشی اور دل کے حوصلے پورے کرنے کی فکر میں چین آرام ہاتھ سے نہ جاتا رہے، غرض وہ رنگ جو ادب لوموف کی طبیعت میں اس قدر نمایاں ہے اور "اوبلوموفی" رنگ کہلاتا ہے روس میں واقعی بہت عام ہے۔ لیکن روس کے باہر بھی اس کی کمی نہیں۔ دنیا میں کون سا ملک ہے جہاں ایسے لوگ نہ ملیں گے جو آرام و اطمینان سے رہنا کامیابی کا صحیح معیار قرار دیتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی آرزوؤں کو خیرباد کہنے پر تیار ہو جاتے ہیں، اگر اس کے بدلے انھیں چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے؟ ان کے دلوں میں حوصلے ہوتے ہیں انھیں پورا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور ان کے پورا ہونے سے قوم اور ملک کو جو فائدہ ہو سکتا ہے اس کا احساس بھی ہوتا ہے، مگر محض اس خیال سے کہ اس کام کے لیے محنت اور کوشش درکار ہے یہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں شکایت کرتے ہیں، افسوس کرتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہیں کرتے۔ حوصلہ تو خیر بڑی چیز ہے اور جس قدر گراں مایہ ہے اتنا ہی کمیاب بھی ہے، دنیا اور خصوصاً ہمارے ہندوستان جنت نشان میں لاکھوں ایسے لوگ ملیں گے جو صرف محنت، مشقت، فکر اور پریشانی سے بچنے کے لیے انتہائی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور

اپنی پستی میں اس خیال سے تسلی حاصل کرتے ہیں کہ زندگی چاہے جس طرح گزرے چین سے بیٹھنا تو نصیب ہوا اور اُن لوگوں کو حیرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں جن کی نظر سے زندگی کا یہ بھید چھپا رہا، جو سکون اور اطمینان کی قدر نہ کر سکے اور ساری عمر "ہوس" اور کوشش میں سرگرداں رہے۔ جب اوب لوموف سرکاری ملازم تھا اور اسے صبح سے شام تک سرکاری کام میں مصروف رہنا پڑتا تھا، تو وہ اکثر تعجب سے پوچھا کرتا تھا کہ اگر مشاغل کی یہی کثرت رہی تو "سچی زندگی بسر کرنے" کے لیے کس طرح وقت نکل سکے گا اور اسی "زندگی بسر کرنے" کے اعلیٰ مقصد کی خاطر اس نے بیماری کا بہانہ کر کے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ یہ اعلیٰ مقصد جمود اور کاہلی کی پشت پناہ ہے۔ اوب لوموف کو جب کسی بات کی فکر ہوتی، کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوتا تو وہ یہ کہہ کر اپنی طبیعت کو اطمینان دے لیتا تھا کہ "شاید، ممکن ہے کسی نہ کسی طرح" سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ دوسرے لوگوں کے طریقے اور ہیں، دوسری زبانوں کی اصطلاحات جدا ہیں لیکن کسی بے سروپا امید پر بھروسا کر کے کوشش اور فکر کو بیکار سمجھنا انسانی سیرت کی ایک صفت ہے جس کے لیے ملک اور نسل کی کوئی قید نہیں۔

گونچروف نے اوب لوموف کے مقابلے میں اس کے دوست شٹولٹز کا کیرکٹر رکھا ہے۔ اس لیے اکثر روسی نقادوں نے یہ فرض کر لیا کہ شٹولٹز اس مکمل اور کامیاب شخصیت کا نمونہ ہے جس کا خاکہ کھینچنے کی کوشش اس دور کے ناول نویس کیا کرتے تھے اور چونکہ شٹولٹز کی شخصیت ایک معمولی جرمن تاجر کی سی تھی، اس لیے گونچروف کی تصنیف کا یہ پہلو بہت کمزور قرار دیا گیا،

لیکن دراصل شٹولٹز ایک پس منظر کا کام دیتا ہے اور اس کی طبیعت اور طرز زندگی کے تقابل سے اوب لوموف کی خصوصیات زیادہ واضح، اس کی سرگزشت اور زیادہ عبرت انگیز اور دردناک ہو جاتی ہے۔ ناول میں شٹولٹز کا اس کے سوا اور کوئی مصرف نہیں اور اس لحاظ سے اس کا کیرکٹر بہت صفائی اور کامیابی سے دکھایا گیا ہے۔ البتہ اولگا کی شخصیت اپنا خاص مقصد رکھتی ہے۔ جو حصہ وہ اوب لوموف کی زندگی میں لیتی ہے اس سے قطع نظر کر کے اس کی اپنی ذات بھی اوب لوموف کی طرح مثالی اہمیت رکھتی ہے۔ گونچروف نے اسے اس حوصلہ مندی اور بے چینی، جفاطلبی اور جفاکشی کا مجسمہ بنایا ہے جو زندگی کی اصل زینت اور انسانیت کا جوہر ہے۔ اولگا کی شخصیت میں وہ کشش، اس کی محبت میں وہ جادو ہے جو جواں مردوں کو اعلیٰ اخلاقی مقاصد کا شیدائی بنا دیتا ہے اور انھیں دائمی جستجو میں محو رکھتا ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسی عورتیں ملتی ہیں جن میں ان صفات کا پرتو بھی ہوتا ہے اور گونچروف اگر ہونے کے لیے اولگا سے ملتی جلتی کوئی لڑکی تلاش کرتا تو اسے غالباً ناکامیابی ہوتی، لیکن اس کے باوجود اولگا کے جسمانی اور روحانی سراپے میں ایک نقش بھی نہیں جس پر تصنع یا مبالغے کا شبہہ ہو۔ اولگا اور اوب لوموف کا ملنا اور مایوس ہو کر جدا ہو جانا ایک بہت معمولی داستان ہے۔ لیکن وہ ایک عاشق کی کہانی بھی ہے، جو اپنے عشق میں فنا ہونے سے ڈر جاتا ہے، ایک کم ہمت انسان جو انسانیت کے شرف اور عظمت کو انتہائی دلربا شکل میں دیکھ کر

بھی اپنے آپ کو اس کی صحبت سے محروم رکھتا ہی اور انسانیت کی ذمہ داریوں سے گریز کر کے نباتات کے سے جمود میں پناہ لیتا ہی، اس سے زیادہ پُردرد اور کونسی کہانی ہو سکتی ہی۔ مگر افسوس کہانی بہت عام ہی اور ہماری زندگی میں روزمرّہ کی بات ہی۔

چوتھا باب

ایوان سرگے یوچ تورگنیف (۱۸۱۸-۱۸۸۳)

تورگنیف روس کے ایک بہت مشہور رئیس خاندان سے تھا۔ اس کے باپ نے آبائی جائداد گنوا دی تھی، مگر اُس کی ماں کے پاس اس قدر سرمایہ تھا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکے اور تورگنیف نے زندگی خاصی آسودگی سے بسر کی۔ ۱۸۳۴ میں تورگنیف ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا، وہاں تعلیم ختم کرنے کے بعد، خوش حال روسی طالب علموں کی رسم کے مطابق جرمنی گیا اور تین سال تک برلن کے دارالعلوم میں لکچر سنتا رہا۔ جرمنی سے واپس پر وہ سرکاری ملازم ہوگیا، مگر طبیعت کی نامناسبت نے اسے ملازمت ترک کرنے پر مجبور کر دیا اور ۱۸۴۳ میں اس نے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنی زندگی انشاپردازی کے لیے وقف کر دی۔

اسے شاعری کا شوق تھا، طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نے بائرن اور دوسرے یورپی شاعروں کے ترجمے کیے تھے جو کسی قدر مقبول ہوئے۔ ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک نظم "پراشا"

لکھی جس کی مشہور نقاد بے لن سکی نے بہت تعریف کی۔ مگر اس فن میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اور اس نے شاعری تقریباً چھوڑ دی۔

۱۸۴۵ میں اس کی پہلی نثر کی تصنیف "شکاری کے مشاہدات" شایع ہوئی جس نے اس کی ساری خوبیاں روس کی ادبی دنیا پر روشن کر دیں۔ مگر "شکاری کے مشاہدات" کی کامیابی بھی تورگینف کو روسی ماحول سے رضامند نہ رکھ سکی اور ۱۸۴۷ میں وہ وطن کو خیرباد کہہ کر فرانس چلا گیا اور پیرس میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۲ میں وہ تھوڑے عرصے کے لیے گوگول کی تعزیت کے سلسلے میں روس واپس ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے چند روز جیل خانے میں گزارنے پڑے۔ جیل خانے سے رہائی پر وہ پھر یورپ چلا گیا سیر و سیاحت کرتا رہا اور مدام وی آردوت کارسیا، ایک مشہور گانے والی کی نیازمندانہ خدمات میں مصروف رہا۔ ۱۸۸۰ میں اسے ایک مرض ہو گیا جس کی نوعیت پہلے پہل ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آئی اور جو آخر وقت میں معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا سرطان ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور تورگینف کی عمر کے آخری دو سال پلنگ پر پڑے پڑے گزرے۔

"شکاری کے مشاہدات" کے بعد تورگینف لمبے اور مختصر افسانے لکھتا رہا، جس میں "گوشۂ عافیت" "خطوط" "یاکوف پاسن کوف" اور "آسیا" سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ۱۸۵۵ میں اس کا پہلا ناول "رودِن" شایع ہوا اور ناول نویس کی حیثیت سے بھی تورگینف کو بہت اعلیٰ رتبہ حاصل ہو گیا۔ "رئیسوں کا اڈا" (۱۸۵۸) اور "صبح امید" (۱۸۵۹) نے

تورگینیف کی شہرت اور ہر دل عزیزی کو عروج پر پہنچا دیا، مگر "باپ بیٹے" (۱۸۶۱) نے اس کے اور اُس کے شیداؤں میں غلط فہمی پیدا کر دی جسے رفع کرنے کے لیے اس نے اس موضوع پر ایک لمبا ناول لکھنے کا ارادہ کیا، مگر پورا نہ کرسکا۔ "دھواں" (۱۸۶۷) باوجود اپنے بے شمار اوصاف کے غلط فہمی کو اور بڑھانے کا باعث ہوا، اور جب تورگینیف نے "اچھوتی زمین" (۱۸۷۶) لکھا تو وہ روس کے حالات سے اس قدر گہری واقفیت نہیں رکھتا تھا کہ ناول کو مفاہمت کا ذریعہ بنا سکے۔ "اچھوتی زمین" تورگینیف کا آخری ناول تھا۔ اس کے بعد اس نے صرف چند انوکھے خیالی قصے لکھے اور عین علالت کے دوران میں "نثر میں نظمیں" یا "بڑھاپے کے تصورات"۔

تورگینیف کی تصانیف اور اس کے خیالات کا سلسلہ روس کے معاصر حالات سے بہت وابستہ ہے اور اس کا اپنا قول بھی ہے کہ اس کی تصانیف پوری طرح سمجھنے کے لیے انھیں سلسلے وار پڑھنا اور اس تاریخی اور معاشرتی ماحول کو جس کی فضا اور تاثر ان میں دکھائی گئی ہے، ہمیشہ پس منظر کے طور پر رکھنا چاہیے۔ تورگینیف نے اپنے پہلے افسانوں میں اس زمانے کا عکس اتارا جب زمیندار خداوندی کے نشے میں چور تھے اور کاشتکار غلامی کے مرض میں مبتلا لیکن روسی ذہنیت میں تغیر ہو رہا تھا۔ تعلیم اور تعلیم سے زیادہ انشا پردازوں نے خوش حال اور پڑھے لکھے روسیوں کے ضمیر کو بتدریج اس قدر ذی حس اور بیدار کر دیا کہ کسانوں کی غلامی اور ذہنی پستی سے ان کے دل دُکھنے لگے، اور کسانوں کو آزاد کرنا ہر روشن خیال روسی کی آرزو ہو گئی۔

کسانوں کو آزاد کرنے کے ساتھ یہ لازمی تھا کہ زمیندار اپنا طرزِ معاشرت اور فلسفۂ حیات بدلیں[1]، دوسروں کی محنت پر بسر کرنے کے بجائے اپنے ذریعۂ معاش کی خود فکر کریں۔ ان لوگوں کے لیے جو ہمیشہ سے بیکاری کے عادی تھے اس نئی زندگی کا بیڑا اُٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اور لوگوں کی ہمّت اور حوصلوں کا چڑھاؤ اُتار، ان کی امّیدیں، اندیشے، ناکامیاں خودبخود انشا پردازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں۔ ۱۸۶۰ تک زیادہ تر یہی کیفیتیں تورگینیف کا موضوع رہیں۔ اس کی اپنی طبیعت حزن و یاس کی طرف مائل تھی اور اس کی تصانیف کا رنگ بھی ایسا ہی ہے۔ مگر اس کی مایوسی بیجا نہیں تھی اور اگر اس کی تصانیف سے یہ ظاہر ہوا کہ خوش حال روسی اس نئی زندگی کے قاعدے برتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اس میں حقیقت کے خلاف کوئی بات نہ تھی۔ واقعات نے دکھا دیا کہ وہ نسل جس نے کسانوں کو آزاد کرایا آگے قدم بڑھانے کی ہمّت نہیں رکھتی تھی، کیونکہ اس کی ذہنیت اور اس فضا نے جس میں اس نے تربیت پائی تھی اسے قومی زندگی کی تعمیر کے لیے بالکل ناموزوں بنا دیا تھا۔ تعمیر کا حوصلہ اس کے بعد کی نسل میں نظر آتا ہے اور "باپ بیٹے" میں تورگینیف نے نئی نسل کے ایک مثالی نمونے کا پچھلی نسل کے لوگوں

[1] زمینداروں کو ۱۸۶۱ سے پہلے اپنے کاشتکاروں سے بلا اجرت ہر قسم کا کام لینے کا پورا حق تھا۔ کاشتکاروں کی آزادی کے بعد انھیں لگان تو ملتا رہا، مگر چونکہ سیر پر کام کرانے کی اجرت دینا پڑتی تھی اس لیے ان کی آمدنی میں بہت کمی ہو گئی۔

سے مقابلہ کیا ہے۔ نئی نسل کا نمایندہ "منکر" تھا[1] اور تورگینیف نے اس کے چال چلن اور خیالات میں "منکریت" کی ایک تصویر کھینچی۔ اس کی نقاشی میں کوئی کسر نہیں تھی، اس کی نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی، دل میں کھوٹ نہیں تھا، اپنے "منکر" ہیرو سے اس کو نہ کوئی عداوت تھی اور نہ ناول میں عداوت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن عام طور سے ناظرین اور نقادوں کو بدگمانی ہوگئی کہ وہ نئی اور پرانی نسلوں کا مضحکہ اڑا رہا ہے اور اس بدگمانی نے تورگینیف کے نام میں بٹہ لگا دیا۔ قومی حوصلوں سے وہ ہمدردی، قومی سیرت سے گہری واقفیت رکھنے کا وہ اعتبار جو اس کی پچھلی تصانیف نے قایم کیا تھا بالکل جاتا رہا اور تورگینیف کے دل کو ایسی سخت چوٹ لگی جس کے درد سے اسے تمام عمر تکلیف رہی۔

"باپ بیٹے" کے بعد چھ سال تک تورگینیف بالکل خاموش رہا اور پھر "دھویں" میں قومی مسائل اور مشکلوں کا پس منظر ایسے رنگ میں دکھایا جس سے مایوسی ٹپکتی ہے۔ "دھویں" کے بعد پھر نو سال تک تورگینیف نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ "اچھوتی زمین" (۱۸۷۶) کی تصنیف کے وقت تک اس نے قوم کی ناقدردانی اور کج فہمی معاف کردی تھی، اور اس کے علاوہ قوم میں بلند حوصلگی اور ایثار کی ایسی علامتیں نظر آنے لگی تھیں کہ اس کی ڈھارس بندھ گئی اور وہ پھر تعمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ ترقی کی علامتیں

---

[1] ملاحظہ ہو باب: "سیاسی تحریکیں اور سیاسی تصانیف"۔

تھیں "منکروں" کی تحریک کا پھیلنا، مضبوط ہونا اور اپنی قربانیوں سے قوم میں عزّت اور وقار حاصل کرنا، اس کے ساتھ ہی ایک اور تحریک کا آغاز جسے اچھوت سیوا سمجھنا چاہیے، جس کے پیرو دنیا اور دنیاوی حوصلے چھوڑ کر قوم کے سب سے نچلے اور پست طبقوں میں جا ملے تھے اور ان کی خدمت اور تعلیم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ سب سے زیادہ ہمت افزا بات یہ تھی کہ ان دونوں تحریکوں میں عورتیں اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں شریک تھیں اور دنیا کی تاریخ میں شاید ہی عورتوں کی کسی جماعت کی ایسی مثال ملے گی جو ان لڑکیوں اور عورتوں کی صداقت، خلوص، جانفشانی اور اعلیٰ اخلاق کا مقابلہ کر سکے۔ تورگنیف ایک مدت سے روس نہیں گیا تھا، اسے سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے "اچھوتی زمین" کو سرسبز کرنے والوں کی داستان اپنے وجدانی علم پر بھروسہ کر کے لکھی۔ اس کی تصنیف نے ان خاص لوگوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا جن کی زندگی اور جدوجہد اس کا موضوع تھی، پھر بھی اگر ہم ناول پڑھ کر اصلی تاریخی حالات اور واقعات پر غور کریں تو تورگنیف کی حقیقت بینی اور نکتہ رسی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

وہ زمانہ جس کے ظاہر اور باطن سے تورگنیف واقف تھا نظر سے اوجھل اور یاد سے محو ہو گیا تھا، وہ لوگ جن کی سیرت اور مزاج اور فلسفۂ حیات کو وہ جانتا اور سمجھتا تھا مر چکے تھے اور نئی نسل کے مستقبل

کی نسبت پیشین گوئیاں کرنا نئی زندگی کی پہیلیاں بوجھنا اس کی قدرت سے باہر تھا۔ تورگنیف کے اس دور کے افسانے اس کی پہلی کہانیوں سے بہت مختلف ہیں۔ گوگول کی طرح اس پر بھی بڑھاپے میں ایک مذہبی کیفیت طاری ہوگئی جس نے اس کے حقیقت کے معیار کو بالکل پلٹ دیا اور اس کے افسانوں میں مافوق الفطری قوتوں کو بہت دخل ہونے لگا۔ لیکن ان افسانوں سے بہت زیادہ اہم اور گراں قدر اس کی "نثر میں نظمیں" ہیں۔ ان میں دو چار افسانے بھی ہیں، ایک دو جگہ سیاسی اور دیگر مسائل پر رائے ظاہر کی گئی ہے، مگر ان میں زیادہ تر بڑھاپے کے تصورات ہیں، ایک ایسے شخص کے جو روسی کہاوت کے مطابق "اپنی زندگی بھر جی چکا تھا" اور دنیا سے رخصت ہونے کو تیار بیٹھا تھا۔

"شکاری کے مشاہدات" میں تورگنیف نے قوم کو کسانوں کی اصلی حالت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا۔ اس موضوع پر بہت سے ناول اور افسانے لکھے جا چکے تھے اور روسی کسانوں کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں تھا جو انشا پردازوں کی نظر سے چھپا رہا، مگر تورگنیف کا اپنا الگ انداز ہے جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس کا نقطۂ نظر کسانوں کے ہمدرد یا حامی کا نہیں، زمینداروں کی زیادتیاں بھی بظاہر اس کے دل کو نہیں دکھاتی ہیں، اسے حق اور انصاف اور راست بازی کے اعلیٰ معیار سے بھی کوئی سروکار نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی جتنا اثر روشن خیال لوگوں پر اس کے "شکاری کے مشاہدات" کا ہوا اس کا مقابلہ کوئی اور تصنیف نہیں کر سکتی۔ "مشاہدات"

کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ تورگنیف کی طرح کیرکٹر کا خاکہ اُتارنا اور زندگی کی کیفیتیں بیان کرنا کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اپنے کیرکٹروں سے ظاہری بے تعلقی دکھا کر وہ اپنے بیان میں ایک خاص تاثیر پیدا کر دیتا ہے اور اس کا نشتر دل میں اور زیادہ چبھتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی تورگنیف مناظرِ قدرت کا شیدائی تھا، روسی سرزمین اور آب و ہوا، پرند اور جانور، پہاڑ جنگل اور پھول پتیاں اسے اس قدر عزیز تھیں کہ وہ ان کے ہر رنگ اور کیفیت کو سمجھتا تھا اور اس کی شدید محبت نے اس کے قلم میں ہر چیز اور ہر حالت کا نقش اُتارنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ انسان اور انسانی قانون کا جور و ستم غلاموں اور غلامی کے دردناک منظر "مشاہدات" کے ناظرین کو اس وجہ سے اور بھی زیادہ نفرت انگیز معلوم ہوتے کہ ان کا پس منظر بہت ہی دلکش تھا، انسانی زندگی کی کہانی فطرت کی کتاب میں لکھی گئی تھی، مگر وہ ایک خوش نما حاشیے میں ایک بھدّی عبارت تھی۔

یہاں اس کی گنجایش نہیں کہ ناظرین کے سامنے روسی کسانوں اور ان بیچاروں کی زیادہ مثالیں پیش کی جائیں جو آقا کے کھیت جوتنے کے بجائے اس کے گھر کا کام کرتے تھے۔ تورگنیف نے کسان اور خانگی غلاموں کے بہت سے خاکے اُتارے ہیں اور ان میں سے ہر ایک یکساں عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ وہ کسان جس کی ہستی قانوناً تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی اس وجہ سے کہ پچھلی مردم شماری میں اس کا نام لکھنا رہ گیا تھا، یا وہ جسے دنیا

میں ایک کُتّے کے سوا کسی زندہ چیز سے محبت نہیں اور جس سے محبت کرنے والا بھی اس کُتّے کے سوا کوئی نہیں، تورگنیف کی مصوری کے ایسے نمونے ہیں جہاں اس نے قلم کی ذراسی جنبش سے پورے پورے نقشے بنادیے اور چند الفاظ میں ایک دردناک داستان سُنادی جس کا اختصار اس کے اثر کو دوگونہ کر دیتا ہے۔ کسانوں کی لیسپی کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو جہاں یہی ایجاز پھر اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔

"سٹیپ کے بادشاہ لی ئیر" میں ایک مجسٹریٹ کسانوں کو باضابطہ اطلاع دیتا ہے کہ ان کا مالک بدل گیا ہے اور محض رسمًا پوچھتا ہے۔

"تم میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں کرنا ہے؟"

موت کی سی خاموشی۔

"کیوں شیطان کے بچّو، کیا تم جواب نہیں دو گے؟"

آخر کار ایک بڈھا جو سپاہی رہ چکا تھا آگے بڑھ کر بولا:

"جی نہیں حضور، ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اس کے ساتھیوں نے حیرت سے بڈھے کی طرف دیکھا، ایک حیرت جس میں مجسٹریٹ بھی شامل تھا، اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہنے لگے

"دیکھو بہادر آدمی ایسے ہوتے ہیں!"

"شکاری کے مشاہدات" کے بعد بھی تورگنیف اکثر دیہاتی زندگی اور خانگی غلاموں کی داستانیں سناتا رہا۔ اس سلسلے میں" پونِن اور بابورِن" کا افسانہ جو اس نے ۱۸۷۴ میں" اچھوتی زمین" کے قبل ہی لکھا خاص طور سے

قابل توجہ ہے۔ گو وہ کسانوں کے قانوناً آزاد ہونے کے تیرہ سال بعد تصنیف ہوا، اس کا قصہ غلامی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، اس کا ہیرو ہا بورن ایک غریب آدمی ہے جس کا نوکری کے سوا اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں لیکن اس ذلیل پیشے کے باوجود وہ ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر عمل کرتا ہے جو اسے اس کے دل نے سکھائے ہیں یا ان اخلاقی تصانیف نے جن کا وہ مطالعہ کرتا رہا ہے۔ چونکہ اس کے اصول غلامی اور آقائی کے ماحول میں نہیں کھپ سکتے، اس کا کہیں گزر نہیں ہوتا اور اسے ہر قسم کی مصیبتیں اُٹھانا پڑتی ہیں لیکن وہ اپنے ارادے کا ایسا پکا ہے کہ اپنی ساری تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے اور اس کی ہمت اور انسانی ہمدردی دوسروں کا سہارا بن جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ ایک غریب آدمی کا فرض ہے کہ دوسرے غریب آدمی کی مدد کرے، وہ اپنے دوست پونن کی پرورش اپنے ذمہ لیتا ہے اور پونن مرتے دم تک اسی کے بھروسے پر بسر کرتا ہے۔ اسی طرح بابورن ایک لڑکی موزا کو جو کسی زمیندار کی ناجائز اولاد ہے، اپنی حمایت میں لے لیتا ہے، اسے کھلاتا پلاتا ہے اور باوجودیکہ وہ ایک نوجوان زمیندار کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے اور ایک عرصہ تک اس کی غیر منکوحہ بیوی بن کر رہتی ہے، بابورن اس کی خطا معاف کر دیتا ہے اور جب نوجوان رئیس اسے نکال باہر کرتا ہے تو خود اس سے شادی کر لیتا ہے۔ آخر میں بابورن کسی سازش کے سلسلے میں گرفتار ہو کر سائبیریا کے ایک دور افتادہ مقام پر بھیج دیا جاتا ہے، وہاں وہ ایک اسکول قایم کر کے بچوں کی تعلیم میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کام

میں موزا بھی بڑے انہماک سے شریک ہو جاتی ہے۔ ۱۸۶۱ میں کسانوں کے قانوناً آزاد کر دیے جانے کی خوشی میں وہ ننگے سر بارش میں دوستوں کو خبر سنانے کے لیے شہر بھر میں گھومتا پھرتا ہے، اس بے احتیاطی کی وجہ سے اسے زکام اور بخار ہو جاتا ہے اور اسی میں اس کی جان جاتی ہے۔ موزا اس کے کام کو جاری رکھنا اپنا عین فرض سمجھتی ہے اور بڑے استقلال سے اس میں لگی رہتی ہے۔

بابورن دراصل غلام نہیں ہے، مگر وہ رئیسوں اور زمینداروں کے طبقے کا بھی نہیں اور اس کا قوم کی بہبود اور اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کا شیدائی ہونا روس کی ذہنی بیداری کی ایک روشن دلیل ہے۔ تورگنیف نے اس افسانے میں قوم کے اس طبقے کی خیر خواہی کا آخری حق ادا کر دیا جس کی حمایت میں اس نے پہلے پہل قلم اُٹھایا تھا۔ یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ تورگنیف تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے بہت مایوس تھا، اس کے وہ تمام ہیرو جو تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں آخر میں ناکامیاب ہوتے ہیں اور سب کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہیں، مگر بابورن کامیاب رہا، موزا جیسی لڑکی کو جو اس سے شروع میں نفرت کرتی تھی اپنی شخصیت کا قائل اور اپنے اصولوں کا معتقد بنا لیا اور جہاں گیا وہاں خود بخود اپنے خاص حلقے کا رہبر اور رہنما بن گیا۔ تورگنیف نے اپنا کمال انھی کیرکٹروں کا خاکہ اُتارنے میں دکھایا ہے جو مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اگر کوئی استثنا ہے تو بابورن۔ اس کا کیرکٹر تورگنیف کے کارناموں میں

سے ہے اور اس کی شخصیت روسی سیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ۔

"مشاہدات" کے بعد دس سال تک تورگنیف پر مایوسی کا غلبہ رہا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب زار نکولائی کا جبر انتہا کو پہنچ گیا تھا، تقریر اور تحریر کی آزادی اس قدر محدود ہو گئی تھی کہ سارا ملک ایک قید خانہ سا بن گیا تھا اور آزاد خیال لوگوں کے لیے چین سے زندگی بسر کرنا محال ہو گیا تھا۔ اس پستی کا الزام بڑی حد تک ریاست پر رکھا جا سکتا تھا، لیکن تورگنیف کے مشاہدے نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ خود روسی قوم اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور خوش حال روسی بھی اس افسوس ناک حالت کے ذمہ دار ہیں۔ "گوشۂ عافیت" "خطوط" "یاکوف پاسن کوف" "آسیا" اور ان کے علاوہ متعدد مختصر افسانے تورگنیف کے اس خیال کو نہایت شاعرانہ طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض افسانوں میں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن پر خداوندی کا زعم بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا اور وہ کسی ظلم یا بداخلاقی کو اپنے لیے ناجائز نہیں سمجھتے۔ لیرمنتوف کے ہیرو پیچورن کی طرح اپنی اور دوسروں کی زندگی سے بیزار ہیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگی بگاڑنے کے سوا انھیں اور کوئی شغل اپنے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن زیادہ تر تورگنیف کا موضوع روس کے "فضول" لوگ ہیں، جو من چلے ہیں اور بلند آرزوئیں رکھتے ہیں، مگر دل کے کمزور ہیں اور ہمّت کے پست۔ ان کا ایک مثالی نمونہ "فضول آدمی کے روزنامچے" میں پیش کیا گیا ہے۔ اس شخص کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی مصرف کا نہیں پاتا

اسے اپنی زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا اور دوسرے اسے اس لائق ہی نہیں سمجھتے کہ اس سے کوئی توقع رکھیں۔ یوں اس کی عمر اپنے آپ سے یہی پوچھتے گزر جاتی ہی کہ میں آخر پیدا کیوں ہوا۔ "فضول آدمی کے روزنامچے"، کا مصنف تو ایک غیر معمولی قسم کا بیکار اور حقیر وجود ہی، تورگنیف کے بہت سے کیرکٹر ہیں جو کم وبیش اسی کے سے روحانی مرض میں مبتلا ہیں، اگرچہ وہ اسے محسوس نہیں کرتے اور اپنا دکھڑا نہیں روتے پھرتے ہیں۔ تورگنیف کا "فضول" آدمی محض ایک اشارہ ہی ان بے شمار لوگوں کی طرف جو کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھتے کہ ہم دنیا میں آخر کیا کر رہے ہیں اور اپنے وجود سے کسی کو فائدہ پہنچا رہے ہیں یا نہیں۔ ان کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے کوئی صدمہ بھی کافی نہیں، کوئی حوصلہ کوئی تمنا ان کے دلوں میں نہیں پیدا ہوتی جو ان کے نباتات کے سے سکون میں خلل ڈال سکے۔ تورگنیف کو ایسے لوگ روس میں بڑی کثرت سے نظر آئے، لیکن روس کے باہر بھی وہ اسی افراط سے ملیں گے اور دیکھنے والا انھیں ہر جگہ دیکھ سکتا ہی۔ "فضول" آدمیوں سے بہت ملتے جلتے تورگنیف کے من چلے کیرکٹر ہیں، اور ان کے ایک خالص نمونے کا بھی اس نے ایک افسانے میں عکس اتارا ہی جس کا عنوان "من چلا" ہی۔ "فضول" اور "من چلے" آدمی میں سب سے بڑا فرق یہ ہی کہ "من چلے" میں سکون نہیں، اور چین سے رہنا اس کے لیے فطرتاً ناممکن ہی۔ وہ نہ جم کر کوئی کام کر سکتا ہی نہ کوئی خدمت انجام دے سکتا ہی، اور

اس میں اپنی اہمیت یا وقعت کا اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ اپنی بھلائی کی فکر کرے، اپنی حرکتوں کے انجام پر غور کرے، یا اپنے کسی نقصان پر افسوس کرے۔ "فضول" آدمی کے قویٰ کو فضول اور بے مصرف ہونے کا خیال زائل کر دیتا ہے، "من چلے" کو یہی خیال دیوانہ کر دیتا ہے اور اسے کسی چیز کی پروا نہیں رہتی سب سے کم اپنی ذاتی بھلائی کی۔

"من چلے" کا چچا اس سے کہتا ہے: "تیری یہ سب باتیں اور یہ تیری مایوسی بھی بیکاری کا نتیجہ ہے"۔ من چلا جواب دیتا ہے: "مگر چچا جان مجھ میں کچھ کرنے کی، کسی کام میں لگ جانے کی صلاحیت نہیں! کہیے تو اپنی جان جواری کی طرح ایک پتے پر لگا دوں!... یہ تو مجھ سے ہو سکتا ہے! آپ مجھے بتائیے کہ کیا کروں۔ کس مقصد کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال دوں۔ میں اسی وقت تیار ہو جاؤں گا!..."

"مگر تم سلامتی سے کیوں نہیں رہ سکتے؟... جان جوکھم میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا! آپ فرماتے ہیں تم سمجھ سے کام نہیں لیتے... مگر میں اور کیا کروں کیا؟... سوچنا شروع کروں تو خدا کی پناہ! کیا کیا خیالات دماغ میں نہیں پہنچ جاتے! سوچنا تو صرف جرمنوں کے بس کی بات ہے"۔

من چلے میں ہمت، نیکی، فیاضی، انسانی ہمدردی کی کوئی کمی

نہیں، لیکن اس میں استقلال مطلق نہیں، عقل سلیم سے وہ بالکل محروم ہے، اعلیٰ حوصلے رکھنے کا وہ اپنے کو اہل نہیں سمجھتا اور یہ کمزوریاں اس کی تمام خوبیوں کو مٹی میں ملا دیتی ہیں۔ جو ذرا سا سدھرنے کا امکان ہے بھی وہ شراب خواری کی لت باقی نہیں چھوڑتی اور من چلا دوسروں کی توجہ اور امداد کے باوجود آپ اپنے ہاتھوں تباہ ہوتا ہے۔

"فضول" اور "من چلے" آدمی روس کی مستقل خصوصیات ہیں اور ان کا پتہ دینا تورگنیف کی حقیقت بینی کی ایک بڑی دلیل ہے، مگر شروع میں تورگنیف کی توجہ روسیوں کے ایک اور گروہ کی طرف تھی جس کی اہمیت فضول اور من چلے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا اخلاقی معیار بلند تھا، آرزوئیں گرم تھیں، مگر جو ہمّت اور عملی استعداد سے بالکل محروم تھے۔ ۱۸۴۵ سے ۱۸۵۵ تک، جب ریاست کا جبر انتہا کو پہنچ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی خانہ سازی کا بہت غوغا تھا، اس قسم کے لوگوں کی خوبیاں اور خامیاں بہت صاف اور شوخ رنگوں میں نظر آنے لگیں۔ تورگنیف کا ان سے بہت سابقہ پڑتا تھا، کیونکہ یہ لوگ عموماً اس کی طرح خوش حال، تعلیم یافتہ جہاں دیدہ ہوا کرتے تھے، یورپ کے حالات سے بخوبی واقف، یورپی ذہنی تحریکوں سے آشنا تھے، اور خوب جانتے تھے کہ یورپ میں کون سے طریقے قومی اصلاح کے لیے اختیار کیے گئے۔ لیکن اس تمام سازوسامان کے باوجود ان میں ہمت کی اتنی کمی تھی، اور جمود

یا مجہولیت کی طرف اتنا قوی میلان کہ وہ کوشش اور محنت کو فضول قرار دے کر اپنی کامیابی کی جڑ خود ہی کاٹ دیتے تھے۔ تورگنیف نے اس طبیعت اور ذہنیت کے نمونے ہر جگہ دیکھے، روس کے دور افتادہ گانوؤں میں، ماسکو اور پیٹر برگ میں، یورپ کے بڑے اور مشہور شہروں میں اور ہر جگہ اسے وہ ایک ہی بیماری میں مبتلا نظر آے اور ایک ہی انجام ان کی قسمت میں لکھا ہؤا معلوم ہؤا۔ "آسیا" جرمنی کے شہر ہائی ڈل برگ کے ایک روسی عاشق کا قصہ ہے جس میں ہر دل لبھانے والی صفت تھی، ایک زندگی کا جسے سنوارنے کے لیے ہر سامان موجود تھا اور ایک لڑکی کا جو زندگی سنوارنے اور اسے فائدہ مند اور کامیاب بنانے کی اہل تھی، لیکن یہ امکانات ایک سراب بن کر رہ گئے، ایک جھلک دکھلا کر غایب ہو گئے، اس لیے کہ وہ ذرا سی ہمّت اور کوشش جو انھیں صلیبت کا رنگ روپ دینے کے لیے درکار تھی میسّر نہ ہو سکی۔ "خطوط" روس کی ان لڑکیوں کا گلا ہے جنھیں آسیا کے ہیرو جیسے نوجوان امیدوں کے نشے سے مست کر دیتے تھے اور پھر مایوسی کے زہر سے اس نشے کو اتارتے تھے۔ معصوم اور ناتجربہ کار لڑکی اس کی منتظر رہتی ہے کہ وہ شخص جس کے لیے اس کی روح تڑپ رہی تھی نظر آئے، آخر کار وہ نمودار ہوتا ہے۔۔۔ لڑکی کے دل میں مسرت، محبت، خیالات کے چشمے بہنے لگتے ہیں تو اس کی بے چینی جاتی رہتی ہے، شک دور ہو جاتے ہیں، اسے اپنے دوست کی ہر بات حق کی گفتار معلوم ہوتی ہے، وہ اپنے دوست کی پرستش کرتی ہے

اپنی خوشی کو حد سے گزرتے دیکھ کر اسے شرم آتی ہے، وہ دوست سے ہر بات
سیکھتی ہے، دوست کی ہر بات سے اسے محبت ہو جاتی ہے ... اگر اس کا
دوست واقعی ہمّت اور حوصلے والا ہو تو وہ اس میں بے انتہا جوش پیدا
کر سکتا ہے، اسے ایثار کی راہ رسم سے واقف کر سکتا ہے اور پھر کوئی ایثار
نہ ہوگا جو اس لڑکی پر گراں گزرے! لیکن آج کل ہمّت اور حوصلے والے
جواں مرد ہوتے ہی نہیں، وہ راگ جس کا اُٹھان اس شان سے ہوتا ہے
بہت بے میل سُروں پر ختم ہوتا ہے۔ اس خط کی مصنفہ آگے چل کر بیان
کرتی ہے" میں نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اغراض اور
ذلیل سے ذلیل سلامت روی کے اصول انتہائی جوش کے پہلو بہ پہلو
پائے جاتے ہیں" یوں ان دوستوں کی جدائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور
خوش قسمت ہے وہ لڑکی جو محسوس کرے کہ داستان یہاں پر ختم ہو گئی ہے اور
جو دل کو بہلانے کے لیے بھی اس کے جاری رکھنے کی امید نہ رکھے!
"رودِن" میں تورگنیف نے شکایت کا یہی سلسلہ جاری رکھا ہے، مگر بڑے
پیمانے پر اور دوسرے انداز میں۔ دمیتری نکولاپئچ رودِن ایک نہایت
وسیع معلومات کا، ذہین اور حوصلہ مند آدمی ہے۔ اس کے اخلاق اور
آداب اتنے خوشگوار ہیں، گفتگو اور بحث کے فن میں وہ ایسا ماہر اور مشاق
ہے کہ اس کی ہر گھرانے میں بہت خوشی اور شوق سے آؤ بھگت کی جاتی
ہے، وہ سوسائٹی کا ایک لاڈلا بیٹا بن جاتا ہے اور بغیر اسے محسوس کیے کہ
اس کی حیثیت کیا ہو گئی ہے وہ نہ اپنی روزی کی فکر کرتا ہے نہ اپنے لیے

کوئی مناسب شغل نکالتا ہی۔ چنانچہ اس کا ایک معترض کہتا ہی "وہ کوئی بڑا عالم نہیں، اپنی پرورش کا بار دوسروں پر ڈالنا بڑا آدمی بننا اسے خاص طور سے پسند ہی... جی ہاں، اس کا دل برف کی طرح سرد ہی، وہ اسے جانتا ہی اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہی کہ اس کے دل میں آگ ہی آگ ہی۔ بُرائی کی بات یہ ہی کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلتا رہتا ہی۔ اس کی ذات کو اس بات سے تو کوئی خطرہ نہیں، یہ تو ظاہر ہی، کیوں کہ وہ کسی داؤں پر اپنی ایک کانی کوڑی یا ٹوٹا بال تک نہیں لگاتا، مگر اور لوگ اس کے کمال پر اعتبار کرکے اپنی روح تک ایک داؤں پر لگا سکتے ہیں... ایک اور بُرائی کی بات یہ ہی کہ وہ کافی دیانت دار بھی نہیں، وہ ذہین آدمی ہی، اسے چاہیے کہ اپنے قول کی اہمیت محسوس کرے، ہر بات یہ سمجھ کر کرے کہ اس کی کچھ قیمت ہی... نوجوانوں کا جوشیلی تقریریں کرنا معاف کیا جا سکتا ہی، مگر رودن کے سن میں کسی کا آپ اپنی تقریروں کا شور سن کر لطف اُٹھانا اور خواہ مخواہ بڑا آدمی بننا تو شرم کی بات ہی۔" رودن کی یہ تمام کمزوریاں ناول کی مختصر داستان میں واضح ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک رئیس خاتون کے یہاں جا کر مہمان ہوتا ہی اور اسے خاندان کی صحبت میں پانچ منٹ نہیں گزرتے کہ اس کا رعب سب پر ہو جاتا ہی اور سب اس کی حاضر جوابی، ذہانت، علم، شخصیت، اور خیالات کے قایل ہو جاتے ہیں اور جو نہیں ہوتے وہ اسے مجمع پر حاوی دیکھ کر خود ہی کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس مجمع میں صاحبِ خانہ کی

سترہ برس کی لڑکی نتاشا بھی شامل ہے۔ وہ رودن کی شخصیت سے اور دل کی بہ نسبت بہت زیادہ مرعوب ہوتی ہے، رودن اسے کمالات کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے اور وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر لیتی ہے کہ رودن ہی وہ شخص ہے جو دنیا میں اس کی رہبری کر سکتا ہے اور اس کے قدموں پر اسے اپنی جاں نثار کر دینا چاہیے۔ رودن خود بھی اتنا مردم شناس ہے کہ نتاشا کا جوہر فوراً پہچان لیتا ہے اور اسے ظاہر کرنے میں مطلق تکلف نہیں کرتا، گو وہ نتاشا کا کسی طرح گرویدہ نہیں اور دوستی کے سوا اور کوئی تعلق نہ قایم کرنا چاہتا ہے نہ قایم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نتاشا کے نوجوان دل میں رودن کی محبت عجیب عجیب کیفیتیں اور ہزاروں آرزوئیں پیدا کر دیتی ہے، اور وہ تہیہ کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو دل و جان سے اس کے حوالے کر دوں گی۔ ایک مرتبہ جب دونوں شام کو چھپ کر ملتے ہیں تو نتاشا کی ماں کا ایک اور مہمان انھیں دیکھ لیتا ہے اور صاحب خانہ کو سارے معاملات کی خبر ہو جاتی ہے۔ نتاشا کی ماں، جو رودن کی بہت ہی معتقد تھی، یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بالکل مفلس ہے اور اسے کسی حال میں یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی لڑکی ایک غریب آدمی سے شادی کرے۔ یہی اس نے نتاشا کو دوسرے روز بلا کر سمجھا بھی دیا۔ مگر نتاشا یوں سر تسلیم خم کرنے پر راضی نہیں تھی اور اس امید میں کہ رودن اسے خاندان کے پنجے سے رہا کرنے کی کوئی صورت نکالے گا اس نے ایک اور خفیہ ملاقات کے لیے وقت اور جگہ مقرر کی۔ ملاقات ہوئی تو اس نے

رودن کو سارا ماجرا سنا کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ رودن جانتا تھا کہ نتاشا کو اس سے بہت گہری محبت ہے، اسے اس کا بھی اندازہ تھا کہ نتاشا جیسی لڑکیوں کا جذبۂ محبت کس قدر قوی ہوتا ہے اور اگر کوئی ہمت اور ایثار کا قدردان مل جائے تو کوئی ایسا کرشمہ نہیں جو یہ جذبہ دکھا نہ سکے گا۔ رودن کا اپنا دل بھی نتاشا کی طرف بہت مائل تھا، لیکن وہ اپنی کمزوریوں سے واقف تھا، انتہائی غربت اسے کئی مرتبہ اپنی ڈراؤنی شکل دکھا چکی تھی اور اس وقت بھی اس کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا سوا ایک حقیر سی جائداد کے جس سے روپے کے بجائے مقدمے اور مفت کے جھگڑے وصول ہوتے تھے۔ وہ بہرصورت کوئی ایسی تدبیر نہیں کر سکا جسے نتاشا اور اس کے خاندان اور جان پہچان والے پسند کر سکتے تھے اور نتاشا کو مارا مارا پھرانا اسے کسی طرح منظور نہ تھا۔ اس لیے آخری ملاقات کے وقت وہ نتاشا کو بس یہ مشورہ دے سکا کہ اسے اپنی ماں کی اطاعت کرنا چاہیے، اگرچہ اس کے معنے یہ تھے کہ نتاشا کو ان آرزوؤں کو خیرباد کہنا چاہیے جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ نتاشا نے مجبوراً یہی کیا۔ رودن بھی دل میں درد لیے ہوئے رخصت ہو گیا اور اس کے بعد کئی سال تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسے کہیں قدم جما کر ٹھہرنا، کسی مفید کام میں مصروف ہو جانا نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ ہر وقت اسی فکر میں پریشان رہتا تھا، اس کی عمر بالکل بےکار ضایع ہوئی۔ اگر کچھ شان تھی تو اس کی موت میں، کیونکہ ۱۸۴۸ میں

جب نپولین سوم نے فرانس میں جمہوریت کے بجائے اپنا ذاتی راج قایم کیا تو رودن اس کے خلاف بغاوت میں شریک ہوا اور سُرخ جھنڈا ہاتھ میں لیے جمہوریت کے فدائیوں کی ہمّت بڑھاتے ہوئے پیرس کی ایک سڑک پر مارا گیا۔ رودن کی سیرت پر مجموعی رائے قایم کرتے ہوئے روسی نقادوں نے اس بات کو بیجا اہمیت دی ہے کہ وہ نتاشا کی محبت کا اہل ثابت نہیں ہوا اور اس کے جذبے کو اپنی اور قومی زندگی کی تعمیر کے کام میں نہیں لا سکا۔ لیکن نتاشا کی محبت ایک شخص کی آخری آزمایش تھی جس کی قسمت کا بہت پہلے فیصلہ ہو چکا تھا اور ناول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورگنیف رودن کو اس معاملے میں اتنا قابل مذمت نہیں سمجھتا جتنا ناول کے نقاد اور آخر میں جب رودن کا سارا بھرم کھل جاتا ہے، وہ اسی معترض کی زبانی جس کی رائے اوپر دی جا چکی ہے، رودن کی تعریف میں کہتا ہے: "اس میں جوش اور امنگیں ہیں اور میری بات مانیے، میں تو کافی بلغمی آدمی ہوں، ہمارے زمانے میں یہ سب سے زیادہ قابلِ قدر صفت ہے۔ ہماری سب کی معقولیت، سرد مہری اور سستی اب حد سے گزر گئی ہے۔ ہم سوتے سوتے سردی کھا گئے ہیں، اور وہ شخص ہمارا محسن ہے جو ہمیں دم بھر کے لیے بھی جگا دے، ہمارے بدن میں گرمی پیدا کر دے ... رودن خود کچھ نہیں کرتا ہے، کیونکہ اس میں جان نہیں ہے، خون نہیں ہے، لیکن یہ کہنے کا کس کو حق ہے کہ اس نے فائدہ نہیں پہنچایا ہے، اور اس کی تقریروں نے بہت سے بھلائی

کے بیج ایسے نوجوانوں کے دلوں میں نہیں بو دیے ہیں جنھیں قدرت نے علمی استعداد اور اپنے ارادے پورے کرنے کی قوت سے محروم نہیں رکھا ہے؟"

"رودن" کی تصنیف کے تین سال بعد "رئیسوں کا اڈا" شایع ہوا۔ یہ ناول بالکل اور ہی رنگ کا ہے۔ اس میں قومی مسائل پر بحث نہیں کی گئی ہے، اس کے قصے کا وہ پس منظر نہیں رکھا گیا ہے جو "رودن" یا "صبح امید" کا۔ اس کی دلچسپی کا مرکز اس کی داستان ہے، اس کے کیرکٹر، اس کا پُر درد انجام فنی اعتبار سے تورگینیف کے کل جوہر اس ناول میں نظر آتے ہیں اور اگر قومی اور معاشرتی مسائل سے بے تعلق ہونا ایک خامی بھی سمجھی جائے تو اس میں بے شمار خوبیاں ہیں جو اس کی تلافی کر سکتی ہیں۔ اس کا ہیرو لاف ریٹز کی ان رئیسوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جن کی تربیت اور تعلیم نے انھیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ کوئی صحیح مسلک اختیار کریں اور اپنی زندگی کو مفید یا کامیاب بنائیں۔

لاف ریٹز کی کا باپ اسے بچپن میں اسکاتستان کے پہاڑیوں کا لباس جس میں گھٹنے کھلے رہتے ہیں، پہنایا کرتا تھا، اس خیال سے کہ بچہ مضبوط ہو جائے گا۔ نوجوانی میں اسے عورتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنا سکھایا گیا، کہ آگے چل کر وہ اپنا مردانہ وقار قایم رکھ سکے۔ لاف ریٹز کی بعد کو یونیورسٹی میں داخل ہوا، اسے مطالعہ کا شوق تھا، اور اس نے کتب بینی کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ مگر سیرت میں

جو عیب غلط اور بے اصول تربیت پیدا کر دیتی ہے وہ محض کتب بینی اور مطالعہ کا شوق نہیں دور کر سکتا۔ لاف ریٹز کی نے شروع ہی میں ایک ایسی حماقت کی جس نے اس کی زندگی چوپٹ کر دی اور ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے کے سوا اسے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ باپ کی تعلیم نے اسے عورتوں سے الگ رکھا تھا اور یوں اسے وہ تجربہ حاصل نہ ہو سکا جس کے بغیر ازدواجی زندگی کی بنیاد بہت کمزور رہتی ہے، بلکہ اکثر قایم ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ بیوی کے انتخاب میں جو غلطی ہوتی ہے اس کی تلافی کے لیے بعد کو کوئی صورت نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ لاف ریٹز کی کے ساتھ یہی پیش آیا۔ اس نے ماسکو کے تھیٹر میں ایک لڑکی دیکھی، اس پر عاشق ہو گیا اور بغیر اس کی سیرت پر غور کیے جلدی سے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کی بیوی وار ورا پاؤلو فنا، نہایت اوچھی، عیار اور فضول خرچ لڑکی تھی، جس کا دنیا میں بس یہ حوصلہ تھا کہ اپنے گرد بہت سے مرد جمع کرے، ان کی زبان سے اپنی تعریف سنتی رہے اور لباس اور اداؤں کے حسن سے ان کو اپنا گرویدہ بنائے۔ شادی کے چند سال بعد تک لاف ریٹز کی پیرس میں رہا اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پیرس کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا، اُس کی بیوی بھی ساتھ تھی، مگر وہ اس کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتا تھا۔ اتفاق سے اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی کی ایک فرانسیسی سے آشنائی ہے، اور یہ آشنائی اتنی گہری ہو گئی ہے کہ اب کسی حسن ظن کی گنجایش بھی نہیں۔ اس واقعہ سے لاف ریٹز کی

کے دل پر سخت چوٹ لگی، وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اطالیہ چلا گیا اور چار سال تک وہاں کسی گانو میں پڑا رہا، اس کے بعد وہ وطن واپس آیا اور اپنے گانو میں جو شہر او ... کے قریب تھا، جانے سے پہلے وہ اپنی ایک دور کی رشتہ دار ماریا دمیتر فنا سے، جس کا مکان شہر میں تھا ملنے گیا یہاں اس کی ماریا دمیتر فنا کی بڑی لڑکی لیزا سے ملاقات ہوئی اور چند روز کے اندر ہی اسے لیزا سے بہت محبت ہو گئی۔ اس دوران میں لاف ریٹزکی کے پاس ایک اخبار آیا جس میں اس کی بیوی کے مرنے کی خبر تھی۔ لاف ریٹزکی نے اپنے آپ کو آزاد پا کر لیزا کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کیا اور اس نے اپنے منگیتر کو جو اسے ناپسند نہیں تھا جواب دے دیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب ایک روز اچانک لاف ریٹزکی کی بیوی پہنچ گئی اور اس کی ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔ لیزا سے شادی کرنے کی اب کوئی صورت نہ تھی، لاف ریٹزکی نے بیوی کے رہنے کے لیے ایک گانو میں انتظام کر دیا اور خود کچھ دنوں آوارہ گردی کرنے کے بعد زراعت میں مشغول ہو گیا۔ لیزا سے جدا ہو کر اسے نہ جینے کی امید تھی نہ چین ملا۔ اسے زندگی بالکل دوبھر ہو گئی، مگر اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ اپنے دن کسی نہ کسی طرح گزار دے اس کی بیوی کچھ دن گانو میں ہی، پھر پیٹر برگ چلی گئی اور آخر میں پیرس جا کر وہیں ٹھیر گئی۔ ایک زمانے میں روسی رئیس اپنے اڈے یوں ہی بنایا کرتے تھے۔

ناول کی ہیروئن لیزا ان معمولی ہستیوں میں سے ہے جن میں تورگنیف

کے قلم نے بغیر کسی مبالغے یا کسی نادر خصوصیت پر بھروسہ کیے ایک عجیب دل کشی پیدا کر دی اور اس کی شخصیت بہت ہی پیاری بنا دی ہے۔ لیزا نہ خوب صورت ہے نہ ذہین نہ شوخ۔ چند نسوانی صفتوں کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں جو دل یا نظر پر خاص اثر ڈال سکے، اور یہ صفتیں بھی ایسی نہیں ہیں جو فوراً محسوس ہوں۔ لیکن ناول پڑھنے والے کو شروع ہی سے لیزا سے ایک لگاؤ ہو جاتا ہے جو کسی انوکھی یا نمایاں خصوصیت کا اثر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک جذبہ ہے جو ایک انسان کو دوسرے کی طرف کھینچتا ہے، ایک دل کو دوسرے سے ملا دیتا ہے، اور ہم خود نہیں سمجھ سکتے کیوں۔ یہ تو روسی حقیقت نگاری کی عام صفت ہے کہ وہ معمولی انسانوں، معمولی واقعات کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ وہ دل چسپ اور نرالے معلوم ہونے لگتے ہیں، لیکن تورگینف کے قلم نے جس معجز نگاری سے کیرکٹروں کی تصویر دکھائی ہے، جس انداز سے وہ رفتہ رفتہ ہمیں ان کی شخصیت اور زندگی کی طرف متوجہ کر کے ہمارے دلوں کو محبت اور ہمدردی سے لبریز کرتا ہے، وہ کچھ اور ہی چیز ہے، اور تورگینف کے کمال کی لیزا سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں۔ لیزا کی داستان بھی بہت دردناک ہے۔ اس کے دنیاوی حوصلے بہت کم تھے، اپنی نسبت اسے کوئی ایسا مغالطہ نہیں تھا جس کی بنا پر وہ تقدیر سے کسی خاص رعایت کا تقاضا کرتی یا دنیا میں کسی خاص قدردانی یا کامیابی کی امید کرتی۔ وہ نیک، خدا ترس اور اطاعت گزار تھی، جیسے روس میں سادہ لوح اور شریف طبیعت کی لڑکیاں عموماً ہوا

کرتی تھیں، پابندی سے گرجا جایا کرتی تھی اور ہر مصیبت کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتی تھی۔ اسے نہ یہ خواہش تھی نہ اس کی امید کہ اس کا شوہر کوئی غیر معمولی شخص ہوگا، اس کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت کو محبت کیش اور وفادار ہونا چاہیے اور اس کی شادی کسی سے بھی ہوتی، وہ یہ اصول برتنے کو تیار تھی۔ لاف ریٹز کی نے اسے یہ سکھایا کہ اس شخص سے شادی کرنا غلط ہے جس سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہو، اور جس کی محبت سے یہ توقع نہ کی جاسکے کہ وہ زمانے کے ساتھ بڑھتی اور گہری ہوتی جائے گی۔ لیزا اس اصول کی بالکل قایل تو نہیں ہوئی، لیکن اس تعلیم کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنے منگیتر کو جواب دے دیا۔ لاف ریٹز کی سے اس کو محبت پہلے سے تھی، منگیتر کو جواب دینے کے بعد جب لاف ریٹز کی سے شادی ہونا طے پا گیا تو اس کی محبت اور بڑھ گئی۔ مگر جب عین وقت پر لاف ریٹز کی کی بیوی نے آکر ساری تدبیریں اُلٹ دیں تو لیزا نے اس کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھا اور دنیا کو خیرباد کہہ کر عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی۔

قصہ ختم کرتے ہوئے تورگینف لکھتا ہے: "کہتے ہیں ایک بار لاف ریٹز کی اس دور افتادہ خانقاہ میں بھی گیا جہاں لیزا رو پوش ہوئی تھی اور اسے دیکھا بھی۔ گرجا میں ایک حصّے سے دوسرے کی طرف جاتے ہوئے وہ بالکل اس کے پاس سے گزری، مگر لاف ریٹز کی کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا... اس وقت ان دونوں کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی؟ یہ کون معلوم کر سکتا ہے، کون بیان کر سکتا ہے؟ زندگی میں ایسے لمحے، ایسی

کیفیتیں ہوتی ہیں۔۔۔ہم ان کی طرف گزرتے ہوئے اشارہ کر سکتے ہیں اور بس۔"
"صبح امید" کی ہیروئن یے لینا لیزا کے مقابلے میں بالکل ہی اور سیرت اور خیالات رکھتی ہے۔ اس نے اپنے روزنامچے میں ایک موقع پر لکھا ہے: "کاش کہ مجھ سے کوئی یہ کہنے والا ہوتا کہ دیکھ، تجھے یہ کرنا چاہیے! طبیعت کا اچھا ہونا کوئی خاص خوبی کی بات نہیں، بھلائی کرنا۔۔۔ ہاں زندگی میں اصل چیز یہی ہے۔" جس ماحول میں وہ رہتی ہے اس میں اس کی آرزوئیں پوری ہونے کی مطلق کوئی صورت نہیں۔ اس کا باپ، جو فلسفی کہلاتا ہے اور فلسفی کہلانا بہت پسند کرتا ہے، اپنی بیوی کی صحبت سے اکتا گیا ہے اور زیادہ تر وقت ایک بدچلن بیوہ کے یہاں گزارتا ہے جس سے اس کی آشنائی ہے۔ یے لینا کی ماں ایک نازک مزاج کمزور اعصاب کی اور بے مغز عورت ہے جس کا اپنی تیمارداری کے سوا دنیا میں اور کوئی شغل نہیں۔ بزرگوں میں ایک حضرت اوفار ادا نوورچ، یے لینا کے دور کے رشتہ دار بھی ہیں جو ہر وقت کرسی پر ڈٹے رہتے ہیں اور ہر شخص سے ڈانٹ کر کہا کرتے ہیں کہ ہمیں مت چھیڑو۔ یے لینا کے مکان میں ایک نوجوان پاول یاکوف لے وچ شوبن بھی رہتا ہے جو اس کی ماں کا ایک عزیز ہے اور وہی اس کو خرچ دیتی ہے۔ ایک اور نوجوان، آندرے تی پترووچ برسنیف یونیورسٹی کا طالب علم، جسے بہت گہرا علمی ذوق ہے اور جو پروفیسر بننے کی تیاری کر رہا ہے اکثر یے لینا سے ملنے آتا ہے، ان دونوں کے سوا یے لینا کو اور کوئی صحبت نہیں ملتی اور یہ دونوں بھی کچھ ایسے ویسے ہی ہیں۔ شوبن ہر وقت مسخرے پن

کی باتیں کیا کرتا ہی برسنیف کو صرف اپنی کتابوں سے دلچسپی ہی۔ یہ ماحول یے لینا کے لیے بہت تنگ ہی اور وہ ایسے شخص کی امید میں رہتی ہی، جو اس کی قدر کرے، جس کے اعلیٰ حوصلے ہوں اور جو انھیں پورا کرنے کے لیے اس کی مدد مانگے۔ شوبن یے لینا کی نسبت برسنیف سے کہتا ہی "کسی نہ کسی کی وہ منتظر تو ہر صورت سے ہی... تم سمجھے ان الفاظ کا پورا مطلب: وہ منتظر ہی!" آخر کار وہ شخص جس کی یے لینا منتظر تھی، نظر آیا۔ وہ ایک بلغاری وطن پرست، دمیتری اِن سَروف ہی، جس نے اپنی زندگی اپنی قوم کی خدمت اور اپنے وطن کو ترکوں سے آزاد کرنے کے لیے وقف کر دی ہی۔ چند ملاقاتوں کے بعد ہی اِن سَروف اور یے لینا میں گہری دوستی ہو گئی۔ یے لینا نے تہیہ کر لیا کہ اِن سَروف کی شریک کار ہو کر اس کی خدمت اور مدد کروں گی اور ہر مصیبت میں اس کا ساتھ دوں گی، اس نیت سے اس نے ان سروف سے شادی کر لی، اور گھر، عزیز و اقارب اور وطن چھوڑ کر اس کے ساتھ بلغاریہ کے لیے روانہ ہو گئی۔ میدانِ عمل میں قدم رکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اِن سَروف کو موت نے آگھیرا، مگر یے لینا اپنے ارادے پر قایم رہی اور اس جنگ میں جو بلغاریوں اور ترکوں میں چھڑ گئی تھی، بلغاری سپاہیوں کی تیمارداری میں مشغول ہو گئی۔ ان سروف کا انتقال شہر وے نس میں ہوا تھا، یہیں سے یے لینا نے اپنے والدین کو اپنے ارادے سے مطلع کیا اور بعد کو اس کی نسبت صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ زخمی سپاہیوں کی تیمارداری

کرتی رہی ۔ پھر کیا ہوا یہ کوئی بتا نہ سکا۔

یے لینا کی ہمت اور جوش ایثار ہی وہ مژدہ ہے جس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے تورگنیف نے اپنے ناول کا عنوان "صبح امید" رکھا ہے، اس کے سوا ناول کا جو علمی اور تبلیغی رنگ ہے وہ بہت کچا ہے اور جلد اُڑ جانے والا۔ اِن سروف کی سیرت اور شخصیت میں نہ اصلیت ہے نہ جان اور محض یہ بات کہ وہ روسی نہیں بلغاری ہے اس کی دلیل ہے کہ تورگنیف اس کی سیرت کی تصویر کھینچنے میں زیادہ کامیابی کی امید نہیں رکھتا تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان سروف کا کیرکٹر تورگنیف کی اپنی ایجاد نہیں، بلکہ سلاف دوستی کی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے ایک صاحب کی فرمائش پر تیار کیا گیا۔ فرمائش کے ساتھ ہی تورگنیف کو وہ اوصاف بھی بتا دیے گئے تھے جن سے اس کے خیالی ہیرو کو آراستہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بجز اس کے کہ ان سروف کا کیرکٹر مصنوعی ہے اور اپنے ماحول میں بالکل نہیں کھپتا "صبح امید" میں کوئی اور نقص نہیں اور فنی اعتبار سے وہ ناول نویسی کے کرشموں میں سے ہے۔ ہر کیرکٹر، ہر منظر، ہر گفتگو تورگنیف کی نکتہ رسی، حقیقت بینی اور مختصر نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے، وہ خاص فضا جس کی تنگی اور گرانی تورگنیف اس قدر محسوس کرتا تھا ناول میں اپنی کل کیفیتوں کے ساتھ پیدا کر دی گئی ہے، وہ لوگ جن سے تورگنیف کو ایسی محبت اور اتنی شکایتیں تھیں ہو بہو نظر آتے ہیں، اور پڑھنے والے کے سامنے ان کی زندگی

کی داستان اس طرح پیش کر دی جاتی ہے کہ دیکھے ہوئے اور سُنے ہوئے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ دیکھیے ادفاراوانووِچ، جن کا جمود ویلینا کی سیمابی کیفیت کا پورا جواب ہے، خود مع اپنے فلسفۂ حیات اور طرزِ زندگی کے کس کمال کے ساتھ چند جملوں میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ شوبن نے ان سے ایک بات کہی ہے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"ادفاراِوانووِچ نے کانکھ کر کہا "تم سے کہتے ہیں ہم کو مت چھیڑو..." شوبن نے قہقہہ لگایا اور بھاگ گیا۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ چلّائے" اے او ۔ دہی... دودکا کا گلاس"۔ لڑکا کشتی میں وودکا اور اس کے ساتھ کھانے کے لیے سوکھی مچھلی لایا۔ ادفاراِوانووِچ نے آہستہ سے کشتی میں سے گلاس لیا اور دیر تک بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھتے رہے، گویا ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے ہاتھ میں کیا چیز ہے۔ پھر انھوں نے لڑکے کی طرف دیکھا اور پوچھا "تیرا نام داسکا ہے نا؟" اس کے بعد اُنھوں نے غمگین صورت بنا کر وودکا پی، کچھ مچھلی کھائی اور جیب سے رومال نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ خادم نے کشتی اور وودکا کی صراحی لے جا کر اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دی، جو مچھلی باقی بچی تھی وہ کھا لی اور اپنے آقا کا لبادہ اوڑھ کر سو بھی گیا، مگر

اوفاراوا نوورچ اسی طرح ہتیلی پر ناک کے سامنے رومال رکھے بیٹھے رہے اور کبھی کھڑکی کے باہر، کبھی زمین، کبھی دیواروں کو دیکھتے رہے۔"

ناول کے آخر میں تورگینف انھیں بزرگ کے ذریعہ سے اپنی مایوسی اور اپنا درد ظاہر کرتا ہے، ایسی طرح کہ ہر روشن ضمیر روسی کے دل پر سخت چوٹ لگے۔

"شوبن نے کچھ دن ہوئے اوفاراوا نوورچ کو لکھا تھا: "آپ کو یاد ہے میں نے اس وقت[1] آپ سے پوچھا تھا "کیا ہم میں ابھی کبھی مرد آدمی پیدا ہوں گے" اور آپ نے جواب دیا تھا، "ہاں ہوں گے"... اور اب میں اس دور کے مقام سے... پھر پوچھتا ہوں، "بتائیے، اوفاراوا نوورچ، ہم میں بھی کبھی مرد آدمی پیدا ہوں گے؟"

اوفاراوا نوورچ نے انگلیاں بجائیں اور سامنے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔"

جن مردوں کی نسبت شوبن نے دریافت کیا اور اوفاراوا نوورچ نے جواب میں انگلیاں بجائیں وہ تو کبھی پیدا نہیں ہوئے، لیکن روسی زندگی میں ایک اور مظہر نمودار ہوا۔ یہ ایک خاص ذہنیت کے لوگ تھے جن کا وجود انشاپردازوں میں سب سے پہلے تورگینف نے محسوس کیا اور جن کی سیرت اور فلسفۂ حیات کو سب سے پہلے اس نے

---

[1] جب یے لینا کی ان سروف سے شادی ہوئی تھی۔

بیان کیا۔ یہ لوگ "منکر" تھے اور ان کے عقیدے "منکریت" کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے ناول "باپ بیٹوں" میں تورگینیف نے بازاروف کی شکل میں منکروں کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا اور اس کی سرگزشت میں منکریت کے اصولوں کی عملی صورت دکھلائی۔ بازاروف یونیورسٹی میں طبعیات کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، طبعیات کے علاوہ کیمیا، نباتیات، حیاتیات تشریح اور طب میں بھی اس کی معلومات خاصی تھیں اور طالب علموں کے حلقوں میں علم اور ذہانت کی بنا پر اس کا بہت ادب کیا جاتا تھا۔

تورگینیف اپنی داستان یوں شروع کرتا ہے کہ بازاروف اپنے ایک معتقد اور دوست آرکادی کرسانوف کے یہاں چھٹیاں گزارنے کو جاتا ہے اور وہاں اس کی آرکادی کے باپ اور چچا سے ملاقات ہوتی ہے۔ آرکادی کا باپ تو ایک سیدھا سادہ بودا اور کمزور آدمی، یا بقول بازاروف "اللہ میاں کی گائے" ہے اور اپنے بیٹے اور اس کے دوست کے خیالات اور فلسفۂ حیات معلوم کر کے فرض کر لیتا ہے کہ جو وہ دونوں کہتے ہیں ٹھیک ہوگا اور گو اس کی عمر چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہے ان نوجوانوں کا رنگ دیکھ کر وہ خود ہی اقرار کر لیتا ہے کہ میں بڑھا گیا ہوں اور نئے خیالات اور حالات پر رائے دینے کے لائق نہیں رہا۔ لیکن پاول کرسانوف، آرکادی کا چچا، جو جوانی میں بہت حسین اور رنگیلا آدمی تھا، فوج میں افسر رہ چکا تھا اور رئیسانہ آداب اور اخلاق سے صرف واقف نہیں ہے بلکہ ان کے برتنے پر اصرار کرتا ہے، فوراً آرکادی اور اس کے

استاد بازاروف کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ تینوں میں بحثیں ہوتی ہیں اور ان کے ذریعے سے تورگنیف منکروں کی ذہنیت اور ان کا فلسفۂ حیات بیان کرتا ہے۔ بازاروف کہتا ہے: "پہلے ہم شکایت کرتے تھے کہ ہمارے یہاں ریاست کے ملازم رشوت لیتے ہیں، ہمارے یہاں سڑکیں نہیں، تجارت نہیں، عدالت میں انصاف نہیں کیا جاتا... اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ محض بکواس کرنا... فضول ہے... ہم نے دیکھ لیا کہ وہ لوگ جو لایق اور عقلمند کہلاتے ہیں... کسی مصرف کے نہیں، ہم لغویات میں پھنسے ہیں، ایک چیز جسے آرٹ کہتے ہیں اس پر، تعمیر اور تشکیل زندگی کی خلقی اُمنگوں پر، پارلیمنٹ اور وکلا کے معاملات اور خدا جانے اور کن کن مسائل پر باتیں کیا کرتے ہیں، جب اصل دشواری پیٹ پالنا ہے، جب وحشیانہ اوہام پرستی ہمارے ذہن کا گلا گھونٹے دیتی ہے، جب ہماری تجارتی کمپنیاں محض اس وجہ سے بیٹھ جاتی ہیں کہ ایماندار آدمی ڈھونڈھے نہیں ملتے، جب خود اس آزادی کا جس کے لیے ریاست اتنی کوشش کر رہی ہے مفید ہونا اتنا مشتبہ ہے، کیونکہ ہمارا کسان خوشی سے اپنی جیب کترنے پر تیار ہے کہ مے خانے میں جاکر شراب پیے اور بے ہوش ہو جائے"۔ اس بنا پر بازاروف ہر چیز پر جو صریحًا فائدہ مند نہیں ہے اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، وہ اپنے آپ کو "منکر" کہتا ہے، اور انکار کے معنے ہیں "کسی بات کو تسلیم نہ کرنا" یا جیسا کہ اس کے مخالف پاول کرسانوف کا قول ہے "کسی چیز کا احترام نہ کرنا"۔ عمومًا وہ لوگ جو مذہبی عقیدوں کو

فضول اور مہمل سمجھتے ہیں، سائنس سے بہت مرعوب ہوتے ہیں، لیکن سائنس کے متعلق بھی بازاروف کے خیالات منکریت سے بالکل بری نہیں۔ وہ ایک موقع پر کہتا ہے "میں نے عرض کر دیا ہے کہ میں کسی چیز کا معتقد نہیں ہوں، اور سائنس ہے کیا چیز؟ مختلف علوم تو ہیں، جیسے مختلف پیشے اور معاش کے ذریعے؛ لیکن سائنس کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں" ظاہر ہے آرٹ اور ادب اور حسن کو وہ کن نگاہوں سے دیکھتا ہوگا۔ آرٹ اس کے نزدیک "یا روپیہ کمانے کا طریقہ ہے یا ایک بیماری ہے، اور کچھ نہیں۔" مناظرِ فطرت میں اسے کوئی حسن نظر نہیں آتا، فطرت کوئی دیر یا حرم نہیں بلکہ کارخانہ ہے اور انسان اس کارخانے کا ایک مزدور ہے۔ بازاروف فلسفے کو "صریحی رومانیت" یعنی جذبات پرستی قرار دیتا ہے اور تاریخ کو بالکل بیکار بتاتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر بھی آدمی بھوکا ہو تو منہ میں روٹی ڈال سکتا ہے۔ وہ رسمیں جن کا انسان وحشت اور جاہلیت کے زمانے سے پابند رہا ہے، زندگی کے وہ طریقے، اخلاق کے وہ اصول جو تجربے اور غور و فکر اور مذہب نے سکھائے ہیں بازاروف کے "انکار" سے محفوظ نہیں رہتے۔ جب اس کا چیلا یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اس کے باپ کو اس لڑکی سے جسے اس نے اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے نکاح کر لینا چاہیے تو بازاروف کو بہت حیرت ہوتی ہے۔ "تم بھی نکاح کی رسم کو اہمیت دیتے ہو! مجھے یہ توقع نہ تھی کہ تمہارے خیالات ایسے ہوں گے۔" اپنے ماں باپ کا نہ بازاروف لحاظ کرتا ہے نہ ادب،

نہ کسی بات سے یہ ظاہر ہونے دیتا ہے کہ اس کو ان سے ذرا بھی محبت ہے، کیوں کہ وہ خاندان اور عزیز داری اور ان جذبات کو جو اسے قایم رکھتے ہیں یکساں لغو اور فضول سمجھتا ہے "گوشت کی بوٹی کیمیاوی نقطۂ نظر سے بھی روٹی کے ٹکڑے سے بہتر ہے" اور اس بنا پر بازاروف آسایش اور آرام کو نفس کشی پر ترجیح دیتا ہے، روسی کسانوں کی مظلومیت اور بے کسی دیکھ کر اُس کا دل درد سے بھر نہیں آتا، بلکہ وہ ہر موقع پر کسان کی چالاکی کا ذکر کرتا ہے اور اس کے برتاؤ میں کوئی ہمدردی یا محبت نظر نہیں آتی۔ "باپ بیٹے" کی داستان بازاروف کی سیرت اور اس کے عقیدوں کے مضبوط اور کمزور، غلط اور صحیح پہلو دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں پرانا فلسفۂ حیات اور پرانے طرز کے لوگ بھی بڑی خوبی سے بطور پس منظر کے رکھے گئے ہیں۔ کرسانوف کے خاندان میں منکریت کا نشتر کسی قدر جسمانی اور ذہنی اصلاح کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ وہ امراض جو امیری اور بے فکری نے پیدا کیے ہیں آخرکار بازاروف کے اثر پر غالب آجاتے ہیں اور بازاروف کا خاص چیلا آرکادی کرسانوف بھی اسے بعد کو اس طرح بھولتا ہے کہ یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بازاروف اپنے ماں باپ کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہ اس کے عقیدوں کے اعتبار سے صحیح ہے، مگر ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے، ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ نہایت کنڈا آدمی ہے اور اس کی طبیعت اور خیالات میں لوچ بہت کم ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بازاروف کا جنسی فلسفہ ہے۔ وہ عشق کو

ڈھکوسلا سمجھتا ہے، کسی اخلاقی قاعدے اور اصول کو صحیح اور قابلِ تقلید تسلیم نہیں کرتا اور جب وہ کسی خوب صورت عورت کو دیکھتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے محل میں لے جا کر اس کی چیر پھاڑ کرے۔ لیکن ایسے خیالات اور ایسا مذاق رکھتے ہوئے بھی جب وہ آنّا الک سے یفنا اودِن ٹسوف سے ملتا ہے اور اپنے چیلے آرکادی کے ساتھ جا کر چند روز اس کے یہاں مہمان رہتا ہے تو اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو ایک عاشقِ زار کی، اپنے ارادے کی پوری قوت عمل میں لا کر بھی وہ بڑی مشکل سے اپنی طبیعت پر قابو پاتا ہے اور اس کے عشق کی جو کیفیت تھی وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مرتے وقت اس کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آنّا الک سے یفنا کو کسی طرح آخری بار دیکھ لوں۔

تورگنیف نے اس ناول کی اشاعت کے بعد ایک خط میں لکھا تھا: "آرٹ کے سوا ہر مسئلے میں مجھے بازاروف کے خیالات سے اتفاق ہے"، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنے ہیرو کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا ہے اور اس کی سرگزشت بہت ہمدردی کے ساتھ سنائی ہے۔ پی سارف، جو اس زمانے میں انتہا پسند گروہ کا رہنما تھا اور روس کا بہترین نقاد، اپنے مضامین میں ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ بازاروف منکروں اور منکریت کا سچّا نمونہ ہے اور تورگنیف نے اسے بہت صحیح اور اچھے طریقے سے پیش کیا ہے، مگر وہ طوفان جو ناول کی اشاعت کے وقت برپا ہوا کسی طرح نہ تھم سکا۔ قدامت پسند

لوگ تورگنیف سے اس بات پر خفا ہوئے کہ اس نے بلاوجہ پُرانے طرز کے لوگوں اور ان کے خیالات کا مذاق اُڑایا ہی، انتہا پسند نوجوانوں کا فرقہ یہ سمجھ کر خفا ہو گیا کہ تورگنیف نے روسی زندگی کے نئے مظہر، یعنی منکرینِ کی توہین کی ہی۔ اصل میں دونوں غلطی پر تھے، لیکن تورگنیف اپنا مطلب سمجھا نہ سکا اور دونوں گروہوں میں اس کی ساکھ جاتی رہی۔

تورگنیف کی مایوسی اور ناظرین کی غلط فہمی سے اس کے دل پر جو چوٹ لگی تھی وہ اس کے ناول "دھویں" میں بہت صاف طور پر محسوس ہوتی ہی۔ "دھواں" ایک عشقیہ داستان ہی، اس میں قومی مسائل کا ذکر آتا ہی تو محض ضمناً اور ایسے طنزیہ انداز میں کہ بس بے کار لوگوں کی بک جھک معلوم ہوتا ہی۔ ناول کا ہیرو لتوی نوف ایک شریف طبیعت کا، تعلیم یافتہ اور کسی قدر حوصلہ مند آدمی ہی، روسی زمینداروں کا ایک اچھا نمونہ، مگر انھیں کی طرح علمی استعداد سے بالکل محروم۔ ناول کی ہیروئن ایرینا یا فلوفنا ایک حسین، ذہین، جذبیلی اور چالاک عورت ہی جس کی روسی طبیعت پر یورپی تہذیب کا اثر کچھ مفید نہیں ثابت ہوا ہی۔ ایرینا خاندان کی بہت اچھی مگر مفلس لڑکی تھی، لتوی نوف اس کی غربت کے زمانے میں اس سے ملا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ ایرینا کے ماں باپ ان کی شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئے اور چند سال کے بعد جب لتوی نوف کی ایرینا سے پھر ملاقات ہوئی تو وہ بالکل ہی اور رنگ میں نظر آئی۔ جس نے اسے غربت کی

پابندیوں اور مجبوریوں سے چھڑا دیا تھا اور سوسائٹی میں وہ ایسی کامیاب ہوئی تھی کہ جنرل رات میروف نے، جو ایک بڑے عہدے پر معمور تھا، اس سے شادی بھی کر لی۔ ازدواجی زندگی اور امیرانہ رہن سہن نے ایرینا کی آزادی میں فرق نہیں ڈالا، اس کے مکان پر ہر قسم کے لوگ، امیر اور غریب، بانکے چھبیلے اور پھٹے حال جمع ہوتے تھے اور وہ سب سے یکساں بے تکلفی سے پیش آتی۔ لتوی نوف کے عشق کی ساری کیفیت اسے معلوم تھی اور جرمنی کے شہر بادن میں جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایرینا نے لتوی نوف کو اپنے شیدائیوں کے زمرے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی۔ تھوڑے عرصے تک تو وہ کامیاب رہی اور لتوی نوف کو خودداری اور عشق کی کشاکش نے بہت حیران کیا۔ مگر آخر میں اس کی خودداری کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے ایرینا سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ ایرینا کو بھی لتوی نوف سے محبت تھی، لیکن دولت کی ہوس اور مردوں کے دل لبھانے کا شوق اس کی طبیعت پر ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وفاشعاری کے لیے گنجائش ہی نہیں رہی۔ لتوی نوف سے جدا ہونے کے بعد وہ روسی دارالسلطنت کی سوسائٹی پر راج کرتی رہی، اس کا حسن ہر ایک سے تعریف کا خراج وصول کرتا رہا۔ مگر سب اس کی تیزی اور تنک مزاجی سے ڈرتے بھی تھے اور جو تھوڑا بہت لگاؤ پیدا ہوتا اسے یہ خوف زائل کر دیتا۔

تورگینف کی اپنی عمر کا ایک خاصا حصہ ایک خاتون کی خدمت گزاری میں صرف ہوا جن کی سیرت اور شخصیت ایرینا سے بہت مشابہ تھی، اور لتوی نوف کی سرگزشت تورگینف کی آپ بیتی سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن "دھویں" کے ہیرو اور ہیروئن روسی سوسائٹی کے کوئی غیر معمولی مظہر نہیں۔ ایرینا کی سیرت میں جو خود غرضی، امارت، عیش پسندی اور اعلیٰ اخلاق کی طرف سے بے پروائی ہے امیر روسی عورتوں میں عام طور سے پائی جاتی تھی اور عموماً ایرینا کی بہ نسبت زیادہ شوخ اور ناگوار شکلوں میں۔ تورگینف نے ایرینا کی سیرت میں طبیعت کی آزادی، مساوات پسندی اور جذبیلے پن کی جو آمیزش کی ہے وہ ایرینا کی ہستی کو بہت نرالی اور دل فریب بنا دیتی ہے۔ وہ ہر گزان نسوانی کیرکٹروں میں سے نہیں ہے جنھیں تورگینف نے قومی زندگی میں رونق اور وطن پرستوں کے دلوں میں ولولے پیدا کرنے کے لیے خانگی زندگی کے تنگ حلقے سے نکال کر ادبی دنیا میں جلوہ افروز کیا مگر تورگینف کا کوئی کیرکٹر اس خوبی اور ادا شناسی سے نہیں بیان کیا گیا ہے جیسے ایرینا کا۔ اس سے محبت ہونا مشکل ہے لیکن اس کے حسن اور ذہانت کے رعب کا دل سے نقش مٹانا بھی دشوار ہو جاتا ہے اور اگرچہ اسے زندگی میں کوئی ایسے صدمے نہیں پہنچے کہ ہم اس سے ہمدردی کریں، لیکن اس کی حسرتیں اور آرزوئیں، اس کے اعلیٰ جذبوں کا ادنیٰ اغراض پر نثار ہونا دل میں درد ضرور

پیدا کرتا ہی۔

"دھویں" کی تصنیف کے بعد تورگینف کی توجہ پھر قومی مسائل کی طرف منتقل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے جس کے آغاز کی "باپ بیٹوں" میں قوم کو خبر دی گئی تھی اور اسی ذہنیت کے لوگ نے جن کا مثالی نمونہ تورگینف نے بازاروف کی شکل میں پیش کیا تھا روس کی سیاسی زندگی پر حاوی ہوگئے۔ ان لوگوں کی ہمت اور ان کے ایثار نے جس طرح سے ریاست کے جبر کا منہ چڑھایا، جس ہمت سے اُنھوں نے اپنی سزائیں بھگتیں، جس استقلال سے اپنے عقیدوں پر قایم اور اپنے کام میں محو رہے اس سے تورگینف بہت مرعوب ہوا اور گو ان لوگوں کے طرزِ عمل سے اسے پورا اتفاق نہیں تھا، قوم کی بیداری نے اس کے دل میں بھی امیدیں پیدا کر دیں۔ "اچھوتی زمین" تورگینف کا آخری ناول جو اس تحریک کے اثر میں لکھا گیا، ایک لحاظ سے کسی قدر بعد از وقت ہی۔ جب وہ تصنیف کیا گیا تو یہ تحریک ترقی کر چکی تھی اور اس نے بالکل دوسری اور بہت زیادہ مکمل صورت اختیار کر لی تھی، مگر تورگینف نے اسے شروع ہوتے ہوئے دکھایا ہی۔ وہ ان شخصیتوں کا خاکہ نہیں اُتار سکا جو ناول کی تصنیف کے زمانے میں اس تحریک کی رہبری کر رہی تھیں اور جن کی ذات ہی در اصل ایسی تحریکوں کو حقیقت کا رنگ روپ دے سکتی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تورگینف کا مقصد محض ایک خاص تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانا تھا تو

"اچھوتی زمین" کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ مگر تورگنیف نے اپنا مقصد محدود نہیں رکھا، روس کے معاصر واقعات صرف ایک محرک تھے جنھوں نے اسے روسی تحریک کے ایک نئے پہلو کی طرف متوجہ کیا، اسے ایک نئے جذبے، ایک نئی اُمنگ کا پتہ دیا جس کے وجود کا اسے پہلے علم نہ تھا اور اس بنیاد پر اس نے ایک عمارت بنائی جو اس وقت کے خاص ماحول اور اس زمانے کی سیاسی تحریکوں سے زیادہ پائدار نکلی اور جس کا مشاہدہ انسان کے بہت ہی گہرے اور موثر جذبات بیدار کرتا ہے۔

تورگنیف نے ناول کا عنوان "اچھوتی زمین" اس لیے رکھا تھا کہ روس کی نئی سیاسی تحریک نے اور ان لوگوں نے جن کا ناول میں ذکر ہے قوم کے اس طبقے کو اپنا میدانِ عمل بنایا جس کی اس وقت تک کسی نے پروا نہیں کی تھی، جس کی مخفی قوت اظہار اور استعمال سے ناآشنا تھی، جیسے نئی زمین جس پر کبھی ہل نہ چلا ہو۔ اس نئی زمین کو زرخیز بنانے کے لیے کئی قسم کے حوصلہ مند نکلتے ہیں، لیکن تورگنیف کی نظر خاص طور سے دو پر جمتی ہے، نثردنوف اور سولومن۔ نثردنوف کو اس کی طبیعت اس نئے اور مشکل کام کا بیڑا اُٹھانے پر مجبور کرتی ہے اور اس کی طبیعت ہی اس کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتی ہے۔ "جمالیات سے شوق رکھنے والے کے لیے عملی زندگی سے واسطہ رکھنا بہت مشکل ہے۔" نثردنوف شاعرانہ مزاج کا آدمی ہے اور گو وہ اپنی شعر کہنے کی استعداد ان حوصلوں پر نثار کرنے کو آمادہ ہے جو اس کے دل کو زیادہ عزیز ہیں، پھر بھی وہ

محسوس کرتا ہے کہ شعر و شاعری نے اس کے مزاج میں ایک نفاست اور نزاکت پیدا کر دی ہے جو اس کے کام میں بہت حارج ہوتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ عوام میں گھل مل کر اپنے خیالات کا پرچار کرے، کسانوں کو آزادی کا شیدائی بنائے اور انھیں آزادی حاصل کرنے کا شوق دلائے۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میں بہت خوش بیان مانا جاتا ہے، لیکن کسانوں سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ اسے معلوم ہے کہ جو ووڈکا نہیں پیتا اسے عوام میں گھل مل جانے کا حوصلہ نہ کرنا چاہیے، مگر کوشش کے باوجود بھی وہ ووڈکا نہیں پی سکتا اور پیتا ہے تو فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ عوام میں انقلابی خیالات کے پرچار کرنے کی پہلی کوشش کا حال وہ خود یوں سناتا ہے:

"اول تو مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ عوام کا سا بھیس بنا کر ان میں شامل ہو جانا بے حد آسان کام ہے: مجھ پر کسی نے ذرا بھی شبہ نہیں کیا۔۔ بس ایک گلاس ووڈکا منگا کر اپنے مخاطب کے سامنے رکھ دو اور جو جی چاہے، جھوٹ سچ بک ڈالو۔۔۔ دوم یہ کہ جتنے لوگوں سے میں نے باتیں کیں سب کے سب غیر مطمئن ہیں، لیکن آسودگی حاصل کرنے کے ذریعوں کا ذکر بھی سننے پر راضی نہیں ہیں! مگر میں تبلیغ کے لیے بہت کمزور نکلا۔ دو رسالے آنکھ بچا کر ہوٹل کے کمروں میں ڈال آیا، ایک کسی گاڑی میں چھپا دیا، چار آدمیوں کے سامنے رسالے پیش کیے۔ ایک نے پوچھا "کیا یہ مذہبی کتاب ہے"؟ اور لینے سے

انکار کیا، دوسرے نے کہا کہ ان پڑھ ہوں، مگر اس نے اپنے بچوں کے واسطے ایک رسالہ لے لیا، کیوں کہ اس کے سر ورق پر تصویر تھی، تیسرا پہلے ہاں میں ہاں ملاتا رہا... پھر مجھے اچانک گالیاں دینے لگا اور رسالہ نہیں لیا، چوتھے نے آخر کار رسالہ لیا اور میرا شکریہ بڑی دیر تک ادا کرتا رہا، لیکن میں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی معلوم ہوتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ ایک کُتّے نے میرے پیر میں کاٹ کھایا، ایک عورت نے جو اپنے جھونپڑے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی مجھے سیخ دکھا کر دھمکایا... ایک سپاہی میرے پیچھے چلاتا رہا "ٹھیرو جی ٹھیرو، ہم تمھیں بھی جلا وطن کر کے چھوڑیں گے" اور پھر میرے ہی داموں سے شراب پی کر مست ہو گیا... اب میں بھوکا ہوں اور ووڈکا سے سر چکر کھا رہا ہے" طبیعت کی ناموزونیت رفتہ رفتہ ترزنوف کے عقیدے کو کمزور کر دیتی ہے اور آخر کار وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس سولومن، اچھوتی زمین کا دوسرا کاشتکار، بہت زیادہ مضبوط ارادے اور مستقل مزاج کا آدمی ہے، طبیعت کی روشنی اس کے لیے بلا نہیں ہو گئی ہے، وہ کسی خبط میں نہیں مبتلا ہوتا اور صدمے نہیں اُٹھاتا۔ عوام کو بیدار کرنا اور ان کی بیداری کو قومی زندگی کی تعمیر کا ذریعہ بنانا۔ اس کے دل میں ایک شاعرانہ اُمنگ نہیں ہے، وہ روسی عوام کو خوب سمجھتا ہے، اپنے کام کے خطروں اور دشواریوں سے بخوبی واقف ہے اور بہت احتیاط سے اور پھونک

پھونک کر قدم رکھتا ہی۔ اس میں صبر اور سلامت روی کا اتنا مادہ ہی کہ اسے نہ اپنی امیدیں دھوکا دے سکتی ہیں نہ دوسروں کا جوش اور وہ اپنی زندگی اور اپنے قومی کام کو ویسے ہی باضابطہ کرتا ہی جیسے اس کارخانے کا انتظام جس کا وہ مہتمم اور کارپرداز ہی۔ روس میں اس قسم کے لوگ ایک بالکل نیا مظہر تھے، اور تورگنیف سولومن کی شخصیت کو اس خوبی اور نکتہ بینی سے نہیں بیان کر سکا جیسے نژدنوف کی سیرت کو، لیکن روس کی انقلابی تحریکوں کی داستان یہ ضرور ثابت کر دیتی ہی کہ تورگنیف کے وجدان نے اسے دغا نہیں دی۔ نژدنوف کی طبیعت اور ذہنیت کے لوگ شروع سے آخر تک ناکامیاب رہے، کیوں کہ ان کے تعمیری حوصلے محض ایک دلفریب مگر ناقابل اعتبار ذہنی جوش اور ہیجان کا نتیجہ تھے، جس کی شدت نے ان کی عملی استعداد کو بالکل برباد کر دیا۔ سولومن برخلاف اس کے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہی جو تورگنیف کے وقت تک میدان میں نہیں آئے تھے، لیکن عرصے سے روس کی انقلابی تحریک کی روح رواں رہے تھے اور ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد سے روسی زندگی کی عمارت اپنے کندھوں پر سنبھالے ہیں۔

سولومن کے کیرکٹر میں جو خامیاں رہ گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کی شخصیت کی تاثیر بہت کم ہو جاتی ہی "اچھوتی زمین" کی ہیروئن ماری آننا میں نہیں نظر آتیں۔ تورگنیف نے ماری آننا کو جوش اور جانفشانی اور قوم پرستی کا مجسمہ بناتے ہوئے بھی حقیقت کا اتنا

لحاظ رکھا ہے اور نفس انسانی کا ایسا گہرا اور سچا علم دکھایا ہے کہ ماری آننا کی صورت اور سیرت اور سرگزشت پر کہیں ذرا بھی مبالغے یا جذبات پرستی کا گمان نہیں ہوتا۔ سولومن ایک موقع پر کہتا ہے: "آپ سب، آپ روسی عورتیں اس وقت بھی ہم سے زیادہ کام کی ہیں، ہم سے زیادہ کام کرتی بھی ہیں اور آپ کا مرتبہ ہم مردوں سے بہت زیادہ بلند ہے۔" اور ناول سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سولومن کی رائے صحیح ہے۔ ماری آننا نے اپنے ماموں سیب یاگن کے یہاں پرورش پائی ہے۔ وہ بہت رئیس آدمی ہے اور اس کی بیوی کوشش کرتی ہے کہ ماری آننا ایک بہت خوش حال زمیندار سے جو قریب ہی رہتا ہے شادی کر لے لیکن ماری آننا کے دل میں سرفروشی کی تمنا ہے، وہ اس شادی پر راضی نہیں ہوتی اور جب نژدونوف سیب یاگن کے یہاں بطور استاد کے ملازم ہو کر آتا ہے اور ماری آننا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کن خیالات اور کیسے حوصلوں کا آدمی ہے تو وہ بغیر کسی جھجھک یا گھبراہٹ کے ماموں کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہے اور قوم کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دیتی ہے۔ وہ صرف دلیر نہیں ہے بلکہ گھر سے یہ امید لے کر نکلی ہے کہ اسے قوم پر اپنی جان نثار کرنے کا فخر حاصل ہوگا اور اگر وہ اس عزت سے محروم بھی رہی تو کم از کم وہ غریبوں میں رہ کر غریبوں کی زندگی تو ضرور بسر کر سکے گی، جو کچھ اسے آتا ہے دوسروں کو سکھا سکے گی اور قوم کی سیوا میں وہ مسرت اور روحانی تسکین حاصل کرے گی جو اس کے

معیار کے مطابق زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسے نژدنوف سے محبت ہے، لیکن نژدنوف کی ذات سے زیادہ اس کے حوصلوں سے اور جب آخر میں نژدنوف خودکشی کر لیتا ہے تو وہ اس کا ماتم نہیں کرتی، بلکہ سولومن کے ساتھ شادی کر کے اس کے کام میں مدد دینے لگتی ہے، کیوں کہ اسے محبت اپنے نصب العین سے اور اپنی قوم سے ہے کسی ایک شخص کی ذات سے نہیں۔

تورگنیف کا آخری ادبی کارنامہ "نثر میں نظمیں" ہیں۔ ان میں اس نے مختلف موضوعوں پر مختصر مضامین لکھے ہیں اور زبان اور خیالات کے رو سے اس کے یہ مضامین دنیا کی بہترین شاعری کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایک "نظم" میں اس نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ میں سڑک پر جا رہا تھا، مجھے ایک فقیر نے روکا اور بھیک کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر جیبیں تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا ہوں، نہ روپے نہ گھڑی، نہ رومال۔ میں نے محبت سے فقیر کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا اور معافی مانگی۔ فقیر نے کہا "کوئی پروا نہیں بھائی ... یہ سلوک بھی ایک احسان ہے"۔ ایک اور "نظم" میں جس کا عنوان "آستان" ہے، تورگنیف نے یہ دکھایا ہے کہ اس وقت کی روسی لڑکیاں کس صدق دل اور ہمت اور بے غرضی سے اپنے آپ کو قوم پر نثار کر رہی تھیں۔ "وہ کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول" ایک نظم ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے چند منظر دکھائے ہیں جن کی یاد اس کے

دل پرنقش ہو گئی ہے اور اب بڑھاپے کے ساتھ تازہ ہوتی جاتی ہے۔

نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو:

"قندیل کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے، بجھ رہی ہے... یہ کون تھا جو ابھی اس طرح کھانسا جیسے اس کا گلا پڑ گیا ہے اور سینے میں دم نہیں؟ میرے پیروں پر میرا بوڑھا کتا گٹھری بنا پڑا ہے، سکڑ رہا ہے اور کانپ رہا ہے۔ اس کے سوا دنیا میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے... ٹھٹھرا جاتا ہوں... اور وہ سب مر گئے... مر گئے...

"وہ کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول!"

"نثر میں نظمیں" قطعی طور پر یہ ظاہر کر دیتی ہیں کہ تورگینف سے بہتر روسی زبان نہ کسی نے لکھی ہے نہ کوئی لکھ سکتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے ناولوں اور افسانوں کی اہمیت اور شان میں اس وقت تک کوئی فرق نہیں آسکتا جب تک روسی زبان بولی اور لکھی جاتی ہے۔ فصاحت اور بلاغت تورگینف کی تمام تصانیف میں یکساں پائی جاتی ہیں اور اسے محل اور موقع کا اس قدر خیال رہتا ہے، اس میں اس قدر متانت اور ضبط ہے کہ اس پر زبان کی خوبیوں سے موضوع یا تصورات کی خامیاں پوری کرنے کا الزام کبھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اپنی زبان اور الفاظ کی دولت وہ اس سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ

کہیں بھی ایک زائد حرف یا جملہ نظر نہیں آتا اور محض اختصار اور ایجاز کے نقطۂ نظر سے اس کی تصانیف اسلوب بیان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ لیکن تورگنیف زبان اور مضمون میں اتنی مناسبت اور ہم آہنگی اس وجہ سے پیدا کرسکا کہ وہ اپنے فن میں کامل تھا، اور قبل اس کے کہ وہ زبان کے زیور سے آراستہ کیے جائیں اس کے پلاٹ اور کیرکٹر ایسی شکل اختیار کرلیتے تھے کہ یہ زیور ان کے عیبوں کے چھپانے کا کام نہ دے بلکہ ان کے حسن کو اُبھارنے کا۔ تورگنیف کی زبان کی تو وہی قدر کرسکتے ہیں جو روسی جانتے ہوں، پلاٹ کی ساخت اور ناول کو شکل و صورت دینے میں تورگنیف ہر جگہ اُستاد مانا جاتا ہے اور حقیقت میں تالستائی کے سوا دنیا میں کوئی ناول نویس نہیں گزرا ہے جو اس فن میں اس کے لگ بھگ بھی ہو۔ اس کے ناول سب مختصر ہیں مگر نہایت مکمل، اس کے پلاٹ بہت صاف اور سُلجھے ہوئے ہیں، ان میں جزو اور کل کا ایسا تناسب ہے جو یونانی مورتوں اور مغل بادشاہوں کی عمارتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہی کمال تورگنیف نے اپنے ناولوں کے کیرکٹر اور سراپے بیان کرنے میں دکھایا ہے۔ اس کے قلم کی ذراسی جنبش ہماری نظر کے سامنے ایک جیتی جاگتی صورت کھڑی کردیتی ہے اور ہم حیرت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایجاز میں موضوع کو روشن کرنے کی ایک صفت ہے جو وضاحت اور تفصیل کو شرمندہ کرتی ہے۔

زبان اور فن کے علاوہ تورگنیف میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا

موضوع ہمیشہ بلند رہتا ہے اور اس کی تصانیف اشتعال انگیزی اور ہوس پرستی سے بالکل پاک ہیں۔ انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کی حقیقت بیں نگاہ سے چھپا نہیں رہتا اور اس کی طبیعت میں وہ جھوٹی پارسائی نہیں جو اس طرف نظر ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے۔ اس کے مختلف افسانوں اور ناولوں میں ایسے لوگ ہیں جن کی بداخلاقی کی نسبت وہ کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتا لیکن عام اور خصوصاً فرانسیسی ناول نویسوں کی طرح وہ اشتعال انگیزی کو ہر دل عزیزی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا، اور اگر اس کی نظر پستی کی طرف رُخ بھی کرتی ہے تو صرف اس غرض سے کہ بلندی پر واپس پہنچنے کا شوق دو بالا ہو جائے۔ اس شوق کی شدّت اس کے قومی ناولوں میں خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ تورگنیف کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس نے حقیقت کو حسن پرست کی نظر سے دیکھا، حسن اور جمالیات کو خلاقی امنگوں اور حوصلوں کا محرک بنایا اور یوں حقیقت، جمالیات اور اعلیٰ اخلاقی معیار کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم کر دیا جس سے تینوں انسان کی بصیرت افروزی، مسرت اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ البتہ تو ضرور ہے کہ تورگنیف کی مایوسی اس کی امیدوں کے شہ پر کاٹتی رہتی ہے اور اس کی روشن سے روشن فضا پر بادل کی طرح چھائی رہتی ہے۔ لیکن تورگنیف یاس مشرب نہیں تھا، اس کی مایوسی کا عقیدے اور فلسفۂ حیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کی تصانیف کو پڑھ کر کوئی مایوس اور روسی قوم یا نوع انسان کی طرف سے ناامید نہیں ہو سکتا۔

پانچواں باب

فیوڈر میخائلووچ دستہ ئف سکی

دستہ ئف سکی کی شخصیت اور تصانیف کے خاص انداز کو نظر میں رکھیے تو یہ واقعہ بھی معنی خیز ہی کہ وہ ایک ہسپتال میں پیدا ہؤا اور ایسے خاندان میں جس کی آمدنی اور خرچ کا تناسب کسی صورت سے اطمینان بخش نہیں تھا۔ اُس کے باپ کو، جو ہسپتال میں ایک معمولی عہدے پر نوکر تھا، اپنے افلاس کا بہت شدید احساس تھا اور اسے آئندہ کے بارے میں اتنے اندیشے تھے کہ وہ ہمیشہ مایوس اور مغموم رہتا اور ایک لمحے کی خوشی اور بے فکری بھی اپنے اوپر حرام سمجھتا۔ بچوں کی تربیت اسی رنگ میں ہوئی اور یہ بات شروع سے اُن کے ذہن نشین کر دی گئی کہ زندگی کھیل نہیں ہی اور اُنھیں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے اور دنیا کی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ماں کی زندہ دلی اور خوش مزاجی اس فضا کی افسردگی اور غمگینی کو جو باپ کے فلسفۂ زندگی نے پیدا کی تھی کم نہ کر سکی

اور بچپن ہی سے دستہ ئف سکی کے مزاج کے توازن میں کچھ خلل پڑ گیا۔ ممکن ہے اگر اسے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کا موقع ملتا تو اُس کے باپ کی تعلیم کا اثر کسی قدر زائل ہو جاتا اور اس کی نشو و نما میں کوئی خاص رُکاوٹ نہ ہوتی مگر وہ اس نعمت سے بالکل محروم رہا۔ سوا ان چند دنوں کے جب سارا خاندان ماسکو کے قریب ایک گانؤ میں چلا جاتا تھا، دستہ ئف سکی کا سارا بچپن مکان کے چند کمروں میں گزرا۔ جب اسکول جانے کے دن آئے تب بھی اُسے قید سے رہائی نہیں ملی۔ وہ اپنے بھائی میخائیل کے ہمراہ اسکول جاتا، اُسی کے ساتھ واپس آتا اور اُسے دوسرے لڑکوں کی صحبت سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید تھی۔ باپ نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا لیکن اس تربیت نے دستہ ئف سکی کے مزاج اور طبیعت میں ایسی خامیاں پیدا کردیں جنھیں وہ آگے چل کر بھی دور نہیں کر سکا۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد دستہ ئف سکی پیٹر برگ کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہؤا اور ۱۸۴۳ء میں اس کو اسی محکمہ میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ملازمت سے اس کی طبیعت بہت جلد گھبرا گئی۔ اسے انشا پردازی کی مطلق مشق نہیں تھی، اُس کی تعلیم سائنس اور ریاضیات میں ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس نے انشا پردازی کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا اور ناول لکھنے لگا۔ اس کی پہلی کوشش بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے پہلے ناول "غریب آدمی" (۱۸۴۶ء) کا ادبی حلقوں میں بہت چرچا ہؤا۔ دستہ ئف سکی نے اس کامیابی کی بنا پر جو اُمّیدیں

باندھیں وہ غلط ثابت ہوئیں اور "غریب آدمی" کے بعد اس نے جو دوچار افسانے شایع کیے وہ عام طور سے اُس کے مداحوں کو بھی پسند نہیں آئے۔ اسی زمانے میں وہ پیتراشفسکی کے حلقے کا رکن بن گیا جس میں اشتراکیت کی تعلیم پر بحث ہوا کرتی تھی اور جس کے اراکین زیادہ تر اشتراکی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں کسی جرم کی بنا پر جس سے ادارے کے نوجوان اراکین خود بھی واقف نہیں تھے، سب کو موت کی سزا کا حکم دیا گیا۔ آخر وقت میں جب ان بیچاروں کو گولی مارنے کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں انھیں اطلاع دی گئی کہ زار کی عنایت سے ان کے لیے موت کے بجائے سائبیریا میں جلاوطنی اور قید بامشقت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ ایک دو روز میں دستہ لفسکی اور "مجرموں" کے ساتھ سائبیریا روانہ کر دیا گیا۔ یہاں وہ چار سال قید خانے میں رہا اور اس کے بعد جبری فوج میں بھرتی کر دیا گیا۔ پیٹربرگ آنے کی اجازت اسے ۱۸۵۹ء کے آخر میں ملی۔ دستہ لفسکی کو بچپن میں جیب خرچ کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا تھا اور جب وہ اسکول میں داخل ہوا تب بھی اس کی جیبیں ہمیشہ خالی رہیں۔ اس وجہ سے اسے خرچ کرنے کا ڈھنگ بالکل نہیں آیا۔ وہ اپنی آمدنی نہایت بے تکے طریقے سے اڑا دیتا تھا اور زیادہ تر اسی سبب سے بہت تکلیفیں اٹھاتا رہا۔ قید اور جلاوطنی نے اس کے افلاس کو اور بھی بڑھا دیا۔ جب وہ سائبیریا سے واپس ہوا تو اس پر بہت قرضہ ہو گیا تھا اور کتابیں لکھنے کے سوا قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ۱۸۶۰ء کے دوران میں اس نے اپنا ناول

"بے کس اور مظلوم" لکھا اور ۱۸۶۱ء میں اپنے بھائی میخائیل کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ "زمانہ" جاری کیا۔ اس رسالے میں اس نے اپنی قید کے حالات "مُردوں کے گھر" کے عنوان سے بہ اقساط شایع کیے۔ اس وقت تک وہ خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ "زمانہ" بہت جلد ہر دل عزیز ہو گیا اور دستہ ئف سکی کو اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ اپنے قرض کا کچھ حصّہ ادا کرے مگر ۱۸۶۳ء میں ریاست کے حکم سے رسالہ بند کرا دیا گیا۔ دستہ ئف سکی ایک نیا رسالہ جاری کرنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہو گیا اور علاوہ اس قرضے کے جو وہ چھوڑ گیا تھا اس کے بیوی بچوں کی پرورش بھی دستہ ئف سکی کے سر پڑ گئی۔ اس کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں کی کوئی انتہا نہیں تھی، مگر اس نے کسی نہ کسی طرح سے رسالے کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور ۱۸۶۴ء میں "دَور" کے نام سے اسے جاری کر دیا۔ یہ رسالہ بھی ریاست نے ایک سال کے اندر بند کرا دیا، اور دستہ ئف سکی پر اس قدر قرضہ ہو گیا کہ قید خانے سے بچنے کے لیے وہ روس سے فرار ہو گیا۔ ۱۸۶۵ء کی گرمیوں میں وہ جرمنی کے شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر افلاس نے وہاں رہنا بھی دشوار کر دیا اور وہ اسی سال پھر روس واپس آ گیا۔ "جرم اور سزا" (۱۸۶۶) لکھ کر اس نے اپنے قرضے کا بوجھ کچھ ہلکا کیا، مگر قرض داروں کے تقاضوں نے اسے ایسا تنگ کیا کہ اگلے سال وہ پھر یورپ چلا گیا۔ اگر وہ کفایت شعاری سے رہتا تو ممکن تھا اسے اس کا موقع ملتا کہ ایک دو سال میں ناول لکھ کر اپنی مالی حالت کسی قدر ٹھیک کرے، مگر جوا

کھیلنے کی عادت نے اس کا امکان نہیں رہنے دیا۔ دستہ ئفسکی چار سال یورپ میں رہا، کبھی جرمنی، کبھی سوئٹستان، کبھی فرانس میں اور اس عرصہ میں دو لمبے ناول "مجذوب" (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹) اور "بھوت پریت" (۱۸۷۰ - ۱۸۷۱) لکھے، لیکن چاروں سال فاقہ مستی میں گزرے یہاں تک کہ اکثر کپڑے اور جوتے رہن رکھنے کی نوبت آجاتی تھی۔ اتفاق سے اس کی نئی بیوی جس سے اس نے یورپ جانے سے پہلے شادی کی تھی، ایسی باسلیقہ اور کفایت شعار نکلی کہ بڑی عادتوں کے باوجود دستہ ئفسکی کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور ۱۸۷۱ء میں جب اسے روس میں گزر اوقات کرنے کی صورت نظر آئی تو وہ واپس چلا آیا۔ اسے صرف دس سال اور جینا نصیب ہوا، مگر بیوی کے حسن انتظام کی بدولت یہ عرصہ مقابلتاً آسودگی میں بسر ہوا۔ اس کے ناولوں نے اسے تالستائی کے دوش بدوش روسی انشا پردازوں کا سرتاج بنا دیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے شاعر پشکن کی برسی میں ایک تقریر کی جس نے اس کی شہرت کو عروج پر پہنچا دیا۔ اسی سال موت نے اسے اچانک آگھیرا اور اس کی عظمت کا یہ ایک ادنی ثبوت تھا کہ اس کا جنازہ اس شان سے اٹھا جس پہ بادشاہ بھی رشک کر سکتے تھے۔

دستہ ئفسکی کی مزاجی کیفیات کا اثر اس کی تصانیف کے ہر صفحہ پر ظاہر ہوتا ہے اور انھیں سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا لازم ہے۔ بچپن میں وہ ہم عمر بچوں کی صحبت سے

محروم رکھا گیا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں سے الگ رہتا تھا، کچھ اس وجہ سے نہیں کہ وہ غریب تھا اور اس کے ساتھی امیر بلکہ محض اس لیے کہ وہ صحبت سے گھبراتا تھا اور مہذب زندگی کے رسوم و آداب سے بالکل ناواقف تھا۔ اپنے بھائی میخائیل کے سوا اُس نے کبھی کسی سے دل کھول کر یا بے تکلفی سے باتیں نہیں کیں۔ اُس کے دل میں دوسروں کی طرف سے بیجا شبہے پیدا ہو جایا کرتے تھے اور اس میں صاف گوئی کا اتنا مادہ بھی نہیں تھا کہ اپنی بدگمانی کو ظاہر کر کے لوگوں کو اس کے رفع کرنے کا موقع دے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو تنہائی کی زندگی میں خوش رہتے ہیں۔ لیکن دستہ ئف سکی میں یہ بات بھی نہیں تھی، اس لیے کہ اسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں تھا، خرچ کی تنگی کے باوجود جب کبھی اُس کے ہاتھ میں روپیہ آتا تو وہ فضول چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا اور جب ضرورتیں ستاتیں تو کڑھا کرتا یا اپنی قسمت کو روتا۔ ایسی وہمی اور کمزور طبیعت والے آدمی کو دوستی سے بہت سہارا مل سکتا ہے۔ اور عموماً ایسے لوگ دوست پیدا بھی کر لیتے ہیں۔ دستہ ئف سکی نے جب ملازمت ترک کر کے انشا پردازی شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھا تو ماسکو کے ادبی حلقوں میں اُس کے بہت ایسے قدرشناس تھے جو اُس سے دوستانہ تعلقات قایم کرنا چاہتے تھے، لیکن دستہ ئف سکی نے اُن کے لیے اس رشتے کا نباہنا بہت ہی دشوار کر دیا۔ وہم کے ساتھ ہی اس کی طبیعت میں خود پسندی بھی بہت تھی

وہ ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور ہر وقت ہر شخص کی نسبت یہ بدگمانی رکھتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہی یا مجھ پر رشک کرتا ہی یا میری رسوائی اور بدنامی چاہتا ہی۔ بے لن سکی، جو دستہ ئف سکی کے پہلے ناول "غریب آدمی" کی اشاعت کے زمانے میں روس کا ادبی رہبر مانا جاتا تھا، دستہ ئف سکی کا بڑا مداح اور اُس کے ہنر کا سچا قدردان تھا۔ لیکن محض اس بنا پر کہ "غریب آدمی" کے بعد جو دو چار افسانے دستہ ئف سکی نے لکھے ان کی اُس نے حسبِ دلخواہ تعریف نہیں کی، دستہ ئف سکی اس سے نہ صرف خفا ہو گیا بلکہ اُس کے تمام احسان بھلا کر لوگوں سے اس کی چھوٹی شکایتیں کرنے لگا۔ ماسکو کی ایک ادبی مجلس میں اُس کے ہم عصر ناول نویس تورگینف نے جو اس کے طرز کو پسند نہیں کرتا تھا، "غریب آدمی" کے ہیرو جے دوش کن کی ایسی نقل اُتاری کہ وہ دستہ ئف سکی سے بہت مشابہ معلوم ہونے لگا اور دستہ ئف سکی اس بات پر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے تورگینف ہی سے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں سے جو وہاں موجود تھے ملنا چھوڑ دیا، اور جب کبھی رستہ چلتے مڈبھیڑ ہو جاتی تو منہ پھیر لیتا۔ اگر اس معاملے میں وہ اپنی بات کا پکّا ہوتا اور اپنی بے نیازی ثابت کر دیتا تو نقصان کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کو کچھ فائدہ بھی پہنچتا اور اس کی طبیعت میں مضبوطی اور خودداری پیدا ہو جاتی لیکن فضول خرچی کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی دشواریوں میں مبتلا رہتا تھا اور اکثر اُسے انھیں لوگوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جن کی

طرف سے اس کے دل میں ہزاروں بدگمانیاں اور شکایتیں تھیں۔ غیرت وحمیت اور مجبوری کی اس کشمکش نے دستہ لفت سکی کی طبیعت کا توازن بالکل بگاڑ دیا۔ اپنی بُری عادتوں اور سیرت کی کمزوریوں کے احساس نے اُسے اپنی نظروں میں اتنا حقیر کر دیا کہ گو دوسرے اسے مغرور سمجھتے تھے مگر وہ خود اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت قایم رکھنے کی جو کوشش میں کر رہا ہوں وہ بے کار ہی اگرچہ اس کا اقرار کرنا اُسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ سیرت اور مزاج کی ان خامیوں نے دستہ لفت سکی کے لیے چین سے رہنا دشوار کر دیا اور سوا عمر کے آخری دس بارہ سال کے جب اس کی بیوی نے اُسے اپنے قابو میں کر لیا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے بچپن میں اُس کے ماں باپ نے، دستہ لفت سکی کے لیے زندگی ایک عذاب تھی۔

دستہ لفت سکی کی سیرت پر غور کرتے ہوئے ہمیں دو باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیے کیونکہ ان کا اس کے فلسفۂ حیات سے بہت گہرا تعلق ہی: ایک تو موت سے وہ مڈبھیڑ جب اس کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، دوسرے اس کا مرگی کا مرض، جس کے پہلے دورے سائبیریا میں ہوئے۔ موت سے مڈبھیڑ کا قصہ دستہ لفت سکی نے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا ہی:-

"آج ۲۲ دسمبر[1] کو، ہم سب سیمیونوف سکی[2] چوراہے پر پہنچائے گئے

---

[1] ۱۸۴۹ء [2] ایک مقام جہاں پر عموماً مجرموں کو گولی ماری جاتی تھی

وہاں ہمیں سزا کا حکم سنایا گیا، چومنے کے لیے صلیب دی گئی، ہمارے سروں پر خنجر توڑے گئے اور اس کے بعد ہمیں وہ سفید قمیص پہنا دی گئی جو ہمارا کفن ہونے والی تھی۔ تب ہم میں سے تین کے ہاتھ کھمبوں سے باندھ دیے گئے اور وہ سزا کی تکمیل کے لیے کھڑے کیے گئے۔ میں صف میں چھٹا تھا، ہم تین تین کر کے مارے جانے والے تھے، اس لیے میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی تھے... مجھے بس اتنی فرصت تھی کہ پلش چے ئیف اور ڈورو ف سے جو میرے پاس تھے گلے مل لوں اور رخصت ہو لوں۔ لیکن اسی وقت سپاہیوں کو (جو گولی چلانے والے تھے) واپسی کا حکم ملا، وہ تینوں جن کے ہاتھ کھمبوں سے بندھے تھے رہا کر دیے گئے اور ہمیں زار کا فرمان سنایا گیا جس میں اس نے ہماری جان بخشی کی تھی...“ دستہ ئفسکی کے ساتھیوں میں سے ایک پاگل ہو گیا اور خود دستہ ئفسکی کی کیفیت جنون سے کچھ کم نہیں تھی۔ ان چند لمحوں میں اس کے دل پر جو کچھ گزری وہ اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کیا ہی اور اس سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہی کہ اس حادثے کے بعد اس کی وہی حالت تھی جو ایک بڑے درخت کی ہوتی ہی جب کوئی زلزلہ اس کی جڑیں اس طرح سے ہلا دے کہ وہ نہ تو اتنا کمزور ہو کہ گر پڑے یا غذا نہ پہنچنے سے سوکھ جائے، نہ اتنا مضبوط کہ زمین سے پوری غذا حاصل کرے اور پھر سرسبز اور شاداب ہو جائے۔ دستہ ئفسکی کا مزاج اور اس کے احساسات اس واقعہ کے بعد کبھی ”طبعی“ انسان کے سے نہیں ہو سکتے تھے اور

اس کی نظر میں زندگی کی کبھی نہ صورت نہیں ہو سکتی تھی جو "طبعی" انسان کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ مرگی کے مرض نے اس کی ذہنیت کو طبعی حالت سے اور بھی دور کر دیا۔

دستہ ئف سکی کے ناولوں میں کئی ایسے کیرکٹر ملتے ہیں جو اسی "مقدس مرض" میں مبتلا ہیں اور ان کے بیان سے اس کیفیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو دستہ ئف سکی پر دورے سے پہلے گزرتی تھی۔ "بھوت پریت" میں ایک شخص کہتا ہے: "کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے گویا یکبارگی کل کائنات کا اندرونی نظام سمجھ لیا اور کہا: "ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے!...... یہ محض ایک پُر اثر کیفیت نہیں ہے، بلکہ ایک مسرت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ دل پر سب سے زیادہ دیرپا نقش اس بات کا ہوتا ہے کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں اور میرے جو احساسات ہوتے ہیں وہ بالکل صاف اور روشن ہوتے ہیں اور ہر احساس ایک عجیب مسرت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ حالت پانچ سکنڈ سے زیادہ قایم رہے تو میری روح اس کی تاب نہ لاسکے اور یقیناً ہلاک ہو جائے"۔ دستہ ئف سکی کو ان دوروں کے آتے وقت کائنات اور وجود کی اصلیت جس شکل میں نظر آتی تھی، کائنات کے جو راز اس پر فاش ہو جاتے تھے، اُس کے فلسفے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اسے اُس جستجو کا سودا ہوا جو اُس کے ناولوں کا اصل موضوع ہے اور یہ جستجو اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ آیا یہ کیفیت ایک بیماری ہے، یا اس میں ایک حقیقت کبھی کبھی اپنی ایک جھلک دکھلا جاتی ہے۔

دستہ لف سکی جس حقیقت کی تلاش میں نکلا وہ اس کے خیال میں خارجی زندگی اور بیرونی اثرات سے بہت کم تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ناولوں میں "واقعات" کا بہت کم ذکر ہے، انسان کی اندرونی کیفیات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، ان کی اہمیت پر اتنا اصرار کیا گیا ہے کہ وہ ناول کی ساری فضا پر چھا جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا ہستی کا اور کوئی پہلو ہی نہیں۔ روزمرّہ زندگی میں ان کیفیتوں کا جو دستہ لف سکی کے ناولوں میں ایک معمولی چیز قرار دی گئی ہیں، شاذ و نادر ہی تجربہ ہوتا ہے اور جس قسم کے انسانوں سے اس کی دنیا آباد ہے وہ ہمیں اپنی دنیا میں شاید ہی کبھی دکھائی دیتے ہوں۔ اس بنا پر بعض لوگ جو دستہ لف سکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتے اسے مزاج اور ذہن کی بیماریوں کا محقق اور "پاگل خانے کا شیکسپیر" ٹھیراتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے، کیونکہ دستہ لف سکی نے علم نفسیات میں بہت سی معلومات کا اضافہ کیا ہے اور نفسیات کے عالموں کو خوابوں کی ماہیت سمجھنے میں اس کی تصانیف سے بہت مدد ملی ہے۔ "دہری شخصیت" کا مظہر بھی سب سے پہلے اسی کی تصانیف میں نظر آتا ہے اور نفسیات کے ماہروں نے بعد کو اس کے متعلق جو کچھ معلوم کیا وہ محض دستہ لف سکی کے بیان کی تصدیق ہے۔ دہری شخصیت محض ایک مثال ہے، دستہ لف سکی نے "بیماری" کے بہانے سے نفس انسانی کے ہزار ہا راز فاش کیے ہیں۔ حقیقت کے ناگوار پہلو پر پردہ ڈالنا حفاظتِ نفس کی طرح انسان کی ایک جبلی

خواہش ہے۔ اہلِ علم ان رازوں سے اس لیے ناواقف رہے ہیں کہ یہ انسانی شخصیت کی تہ میں چھپے رہتے ہیں، ان کا احساس وجدان کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، علم کی ان تک رسائی نہیں۔

نقادوں نے دستہ ئفسکی کو بیمار ذہن اور روگی فطرت کا محقق بنا کر اس کی تصانیف کو بالکل اور ہی حیثیت دے دی ہے، دستہ ئفسکی خود حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ جو شخص بے معنے روز مرّہ زندگی اور واقعات کا پردہ اُٹھا کر دیکھے گا اسے حقیقت اسی شکل میں نظر آئے گی۔ اپنے خطوط میں اس نے جا بجا اس مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے: "حقیقت نگاری کا مفہوم جو میرے ذہن میں ہے ہمارے معمولی "حقیقت نگاروں" اور نقادوں کے خیالات سے بالکل مختلف ہے۔ معاذاللہ! اگر کوئی وہ ساری کیفیتیں جو ان گزشتہ دس سالوں میں ہم روسیوں کے دلوں پر گزری ہیں صاف صاف بیان کر دے... تو یہی حقیقت نگار چیخ اٹھیں گے کہ یہ محض خبط ہے! لیکن اس بیان کی حقیقت میں کلام نہیں ہو سکتا! ایسی ہی حقیقت نگاری سچی اور گہری ہو سکتی ہے، وہ جو عام طور سے رائج ہے محض سطحی اور حقیر ہے"! یوں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دستہ ئفسکی کے ناولوں پر "بیماری" کی فضا کیوں چھائی رہتی ہے۔ وہ علم نفسیات کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اسے اس کی فکر ہے کہ کسی طرح انسانی زندگی اور انسانی ہستی کی اصل حقیقت معلوم کرے اور جیسے ایک سائنس

کے عالم کو انسانی جسم کے نظام اور کاروبار کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب اس نظام میں کوئی خلل پیدا ہو، دستہ لفسکی بھی بیماری اور بیماروں کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ انسان اگر تندرست اور خوش حال ہو تو اپنی خواہشوں اور آرزوؤں میں مبتلا رہتا ہے اسے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی ہستی کے معنوں پر غور کرے اور وہ اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ لیکن غربت، مصیبت اور بیماری میں اس کی توجہ جسمانی زندگی سے ہٹ جاتی ہے اور تب وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا مقصد، کائنات میں اپنے وجود کا مصرف کسی طرح اپنے آپ کو سمجھائے اور پھر اپنی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ دستہ لفسکی کا موضوع ایسے ہی انسانوں کے خیالات اور احساسات ہیں اور اسی وجہ سے خود حقیقت نگاری کا یہ تقاضا تھا کہ اس کے کیرکٹر مصیبت زدہ یا کسی نہ کسی لحاظ سے "بیمار" ہوں، سکون اور نجات حاصل کرنے کو تڑپ رہے ہوں اور انھیں خارجی زندگی کے ان مسائل اور معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو جو تندرست انسان کے ذہن پر حاوی ہوتے ہیں۔ دستہ لفسکی کے فلسفۂ زندگی کا یہ اصول ذہن نشین کر کے ہم اس کی تصانیف پر سلسلہ وار غور کر سکتے ہیں۔

اس کا پہلا ناول "غریب آدمی" اور دوسرا "بیکس اور مظلوم"، چند افسانے جو اس نے ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان لکھے "سدا سہاگی" "ماموں جان کا خواب" اور "ستے پان چی کوو" اس کی

تصانیف کا جداگانہ حصہ ہیں اور موضوع کے اعتبار سے اُن ناولوں سے
بہت مختلف ہیں جن کا سلسلہ " مردوں کے گھر" سے شروع ہوتا ہے لیکن
دستہ ئف سکی کا طرزِ ان شروع کی تصانیف میں بھی وہی ہے جو بعد کے
ناولوں میں پایا جاتا ہے اور ان میں بھی اس کی قوتِ ادراک اور انسانی
سیرت کے وجدانی علم کا وہی عالم ہے۔ " غریب آدمی" گوگول کے افسانے
" لبادے" سے ملتا جلتا ہے، اس کا ہیرو بھی خاکسار اور مسکین ہے، ایک
" بیچارہ" جس کا حال سُن کر ترس آتا ہے، لیکن " غریب آدمیوں" کی
اور " لبادے" کی حقیقت نگاری میں یہ بڑا فرق ہے کہ گوگول نے
جگ بیتی سنائی ہے اور دستہ ئف سکی نے آپ بیتی، گوگول نے مصوری
کا کمال دکھایا ہے اور دستہ ئف سکی نے مشاہدۂ نفس کا، گوگول کا ہیرو
روسی قوم کا ایک فرد ہے، دستہ ئف سکی کا ہیرو جے دوش کن، جس کے
دل میں خودی کا اتنا احساس بھی باقی نہیں رہا ہے کہ وہ اپنی سنگدل
معشوقہ کی اجازت کے بغیر ہنسے یا خوش ہو سکے، خود دستہ ئف سکی
کی ایک خاص ذہنی کیفیت کا مجسمہ ہے۔ نقاد بے لن سکی نے " غریب آدمی"
کو پڑھ کر ٹھیک کہا تھا کہ جے دوش کن کی ہستی کوئی نادر شئی نہیں ہے،
بلکہ روسی زندگی کا ایک عام اور عبرت انگیز منظر ہے۔ " بیکس اور مظلوم"
میں بھی دستہ ئف سکی نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے، اس کا ہیرو
وانیا ایک ناول نویس ہے، اور اس کی سیرت دستہ ئف سکی سے بہت
مشابہ ہے۔ ناول کا قصہ بہت دردناک ہے۔ ایک بڑے رئیس زمیندار

وال خوف سکی نے، جو عیاش اور بدمعاش ہی اور جسے معصوم لڑکیوں کو دھوکا دے کر بے حرمت کرنے میں خاص لطف آتا ہی، اپنی جائداد کے مستعد اور ایماندار منتظم ایرخ مے لِفت کو جھوٹے الزام لگاکر نکال دیا ہی اور اس پر کئی ہزار روبل غبن کرنے کا دعویٰ دائر کر دیا ہی۔ بے چارہ ایرخ مے لفت مقدمے کی پیروی کے لیے پیٹر برگ آتا ہی، اور یہاں اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوتی ہی۔ اُس کی لاڈلی بیٹی نتاشا گھر چھوڑ کر وال خوف سکی کے لڑکے ال یوشا کے ساتھ بغیر نکاح کیے بیوی کی طرح رہنے لگتی ہی۔ ناول نویس وانیا جس نے ایرخ مے لفت کے گھر میں پرورش پائی تھی اور جو خود نتاشا سے بہت محبت کرتا تھا اپنا فرض سمجھتا ہی کہ نتاشا کے جذبۂ محبت کا احترام کرے اور اسے اس حرکت کے بُرے نتائج سے جہاں تک ہو سکے بچائے۔ نتاشا کے افسانے کا انجام یہ ہوتا ہی کہ ال یوشا اپنے باپ کے کہنے سے ایک مال دار لڑکی سے شادی کر لیتا ہی اور وانیا بڑی مشکل سے نتاشا کے ماں باپ کو اسے اپنے گھر واپس بلانے پر آمادہ کر لیتا ہی۔ نتاشا اس معاملے میں پھر بھی خوش قسمت رہی۔ "بیکس اور مظلوم" میں ایک اور لڑکی کا قصہ بھی ہی جس کی عزت اور زندگی وال خوف سکی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اُس کے باپ نے مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا اور اس کی اپنی بچی نلی بھی دل میں شکایت لیے ہوئے دنیا سے گئی۔

"بیکس اور مظلوم" کی داستان میں دستہ لف سکی نے ایک تو یہ

دکھایا ہی کہ انسان فاعل مختار ہونے کا جو دعوے کرتا ہی، اُس کی دراصل کوئی حقیقت نہیں اور دوسرے یہ کہ فلسفیوں نے جو حکم لگایا ہی کہ ہر انسان اپنی بھلائی چاہتا ہی، اکثر غلط ثابت ہوتا ہی۔ "بیکس اور مظلوم" ان بیچاری ہستیوں کے دردِ دل کی کہانی ہی جو اپنے پاک جذبات کو دنیاوی اغراض اور "بھلائی" کی خواہش پر نثار نہیں کر سکتی ہیں، اور محض اس وجہ سے کہ ان کے دل پاک ہیں اور اُن کے جذبات قوی اُنھیں دنیا میں ہر طرح کی رسوائی اور ذلت اُٹھانا پڑتی ہی۔ یہی مجبوری کسی قدر ظریفانہ انداز سے "سدا سہاگی" میں دکھائی گئی ہی۔ ترو سوت سکی، ایک خوش حال آدمی، فطرتاً شادی کرنے پر مجبور ہی، اس کی بیویاں اسے ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں اور بے وفائی کرتی ہیں اور اسے یہ معلوم بھی ہی، لیکن پھر بھی وہ شادیاں کرتا رہتا ہی اور ایسی ہی عورتوں سے جن کی تلوّن مزاجی اور عیش پسندی انھیں وفادار نہیں رہنے دیتی[1]۔ علم نفسیات کے رو سے ایک خواب جو اس ناول میں بیان کیا گیا ہی، بہت اہمیت رکھتا ہی۔ ایک مرتبہ ول چانی نوف، جس کا ترو سوت سکی کی بیوی سے

---

[1] دستہ ئفسکی کی لڑکی لیو بوف دستہ ئفسکیہ کا بیان ہی کہ اس ناول میں دستہ ئفسکی نے آپ بیتی سنائی ہی۔ اس کی پہلی بیوی جس سے اس کی سائبیریا میں شادی ہوئی تھی، ترو سوت سکی کی بیویوں کی طرح عیاش اور بیوفا تھی لیکن لیو بوف دستہ ئفسکیہ نے اپنے باپ کی سوانح عمری میں اس قدر اُلٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں کہ اس کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

یارانہ تھا، ترو سوت سکی کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص خنجر لیے ہوئے اس کے پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ جب وہ پاس پہنچ گیا تو اُس نے وِل جانی نوف کے گلے پر خنجر مارا، اور ول جانی نوف نے وار سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔ اس وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں سے خون بہہ رہا ہے اور ترو سوت سکی اس کے پاس کھڑا ہے۔ اگر ول جانی نوف نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو ترو سوت سکی کا خنجر اُس کے گلے پر پھر جاتا۔

"سدا سہاگی" دستہ ئفسکی نے ۱۸۵۹ء میں لکھی اور یہ اس کے پہلے طرز کی آخری تصنیف ہے۔ ۱۸۶۲ء میں "مُردوں کے گھر" کی تصنیف کے ساتھ اس کی ناولوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا موضوع انسان کی شخصیت اور اُس کے وجود کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ وہ روحانی یا جذباتی مجبوری جو نتاشا جیسی شریف اور شائستہ لڑکی کو بد اخلاق عورتوں کے زمرے میں شامل کر دیتی ہے ان ناولوں میں بہت زیادہ شوخ رنگوں میں نظر آتی ہے۔ اپنی بھلائی کی طرف سے بے پرواہی اور دنیاوی اغراض کی تحقیر جو نتاشا اور نلی کی ماں محسوس کرتی ہیں ایک شیطانی ضد اور تکبر میں منتقل ہو جاتی ہیں جو خیر و شر کے معیار کو پلٹ دیتا ہے۔ لیکن ہم ان مسائل کو اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم دستہ ئفسکی کے فلسفے کی تدریجی نشو و نما پر غور کر لیں۔

دستہ ئف سکی کے خیالات کی محرک دراصل ان لوگوں کی شخصیتیں تھیں جن سے اس نے سائبیریا کا قید خانہ یا "مردوں کا گھر" آباد پایا۔ اس ناول کا ہیرو قید خانے سے رخصت ہوتے ہوتے کہتا ہے:۔ وہ کتنوں کی زندگی، کتنوں کی طاقت ان دیواروں میں دفن رہی اور بے کاری میں ضائع ہوئی!۔ اس جوانی اور اس قوت کو دنیا آخر کسی نہ کسی مصرف میں تو لا ہی سکتی تھی۔ میں اس معاملے میں اپنے خیالات ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا: یہ بدقسمت لوگ غالباً ہماری قوم کے سب سے زیادہ مضبوط ارادہ رکھنے والے آدمی اور کسی نہ کسی لحاظ سے اس کے سب سے زیادہ ہونہار افراد تھے۔ ان کی ساری جسمانی اور روحانی طاقت ضایع ہو رہی ہے۔ یہ آخر کس کی خطا ہے؟"۔ فقط یہ کہ دینا کہ یہ لوگ مجرم ہیں اور اپنے جرم کی سزا بھگت رہے ہیں صرف ناکافی نہیں بلکہ غلط ہے، یہ غلط نہ ہوتا تو اس مسئلے میں کوئی دشواری یا پیچیدگی نہ ہوتی۔ دستہ ئف سکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسے مجرم جنھوں نے ضعیف بڈھوں اور معصوم بچوں کا انتہائی بے دردی سے خون بہایا تھا، اپنی حرکتوں پر بالکل نادم نہیں ہوتے، بلکہ اکثر یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ انھوں نے کسی قسم کی غلطی کی ہے اور کبھی کبھی تو ان کا ضمیر انھیں یقین دلاتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا۔ جب ان لوگوں کو اپنی معصومیت کا اتنا یقین ہے اور ان کی سزا ایسی بے تاثیر، تو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم ہیں یا قید خانے میں اپنے جرم کی سزا پا رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ تسلیم

کرلیں کہ یہ لوگ بالکل بے خطا ہیں یا اگر بے خطا نہیں تو انھیں سزا دینا ہمارے امکان سے باہر ہے، تو پھر مظلوم معصوموں کی فریاد کو بیجا قرار دینا ہوگا، یا اس کا اقرار کرنا ہوگا کہ انسانی فطرت کسی قانون کی پابند نہیں کی جاسکتی، قانون بنانا محض حماقت ہے اور کسی مذہبی یا اخلاقی معیار کا سہارا ڈھونڈھنا انسان کی ایک مضحک کمزوری ہے۔

دستہ ئفسکی کو علم اور عقل پر زیادہ اعتبار نہیں تھا، جرم و سزا کی منطق کے اس چکّر نے اسے اور بھی یقین دلا دیا کہ زندگی کے گہرے مسائل کا فیصلہ کرنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ اگر ہم جرم کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مجرم کی شخصیت سے، اس کے جذبات سے اور اس کے شعور کے ان پوشیدہ محرکوں سے واقف ہونا چاہیے جو ان جذبات کو پیدا کرتے ہیں۔ "پاتال کے مراسلات" میں جو اس نے ۱۸۶۴ میں شایع کی، اس نے پہلی بار انسانی شعور پر بحث کی اور اس سوال کا ایک حد تک جواب دیا جو "مردوں کے گھر" میں رہنے سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ "مراسلات" کے دو حصے ہیں، پہلے میں اس کا فرضی مصنف اپنا فلسفۂ حیات بیان کرتا ہے، دوسرے میں اپنی زندگی کے چند واقعات جو اس کے فلسفے کو اور واضح کر دیتے ہیں۔

"پاتال کے مراسلات"، کا مصنف پوچھتا ہے: "وہ کون تھا جس نے پہلی بار یہ کہا، پہلی بار اس بات کا اعلان کیا، کہ انسان محض اس وجہ سے ذلیل اور مضر حرکتیں کرتا ہے کہ اُسے اپنی بھلائی کی تمیز نہیں اور اگر

اس کا دماغ روشن کر دیا جائے، اس کی آنکھیں کھول دی جائیں، کہ وہ اپنے حقیقی مقاصد/اپنے سچے مفاد سے واقف ہو جائے تو وہ فوراً ذلیل اور مضر حرکتیں کرنا چھوڑ دے گا، فوراً اچھا اور شریف بن جائے گا... اس لیے کہ اچھائی میں اسے اپنا فائدہ نظر آئے گا... یا یوں کہیے کہ اچھائی کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو جائے گا!... مگر ان ہزارہا مثالوں کا کیا کیا جائے جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ انسان جان بوجھ کر، یعنی اپنے مفاد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے... ایک کٹھن نامعقول راستہ جس پر اسے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے یہ خودسری اور خودرائی اپنے مفاد سے زیادہ پسند ہے... مفاد ہوتا کیا ہے؟ اسے آپ ٹھیک ٹھیک سمجھانے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں کہ انسان کا مفاد کس بات میں ہے اور کس میں نہیں؟... کیا مفاد کی جو صورتیں تصور کی گئی ہیں وہ بالکل قابلِ اعتبار ہیں؟... انسان ہمیشہ اور ہر جگہ، خواہ وہ کوئی بھی ہو، وہی کرنے سے خوش ہوتا رہتا ہے، جو اس کی طبیعت چاہتی ہے، اس بات سے ہرگز نہیں جو اس کی عقل اس سے کہتی ہے یا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے؛ انسان کی ایسی خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں جو اس کے مفاد کے خلاف ہوں بلکہ کبھی کبھی اپنا فائدہ نہ چاہنا اس کے لیے قطعاً ضروری ہو جاتا ہے... انسان کو حاجت ہے۔ آزاد اور خودمختار خواہشوں کی، اس آزادی اور خودمختاری پر خواہ اسے

کچھ بھی نثار کرنا ہو، اس کا انجام چاہے کچھ ہی ہو۔۔ عقل، حضرات، ایک اچھی چیز ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن عقل محض عقل ہے اور وہ صرف انسان کی ذہنی قوت کو کام میں لاتی ہے، لیکن خواہشوں میں انسان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، جس میں عقل مع اپنی تمام سرگردانیوں کے شامل ہے۔۔"

غرضے کہ انسان کا سب سے قوی جذبہ خودی کا اثبات اور کائنات میں اپنی اہمیت جتانے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش اس کے خیر وشر کے معیار کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ اس کی عاقبت اندیشی، اس کی عقل کا منہ چڑھاتی ہے۔ "پاتال کے مراسلات" کا مصنف بھی دراصل اسی خواہش کا شکار بنا ہے؛ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہتے رہتے اس کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ اسے اپنی ذلت اور رسوائی میں مزہ آنے لگا ہے، وہ "مراسلات" کے دوسرے حصّے میں یہ قصّہ سناتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ چکلے میں جاکر ایک لڑکی کو سمجھایا کہ اسے اپنا پیشہ چھوڑ دینا چاہیے اور جب وہ کچھ روز بعد اس کے پاس آئی اور اپنا پیشہ ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے لڑکی کو بے عزّت کر کے چھوڑ دیا۔ یہ کمینی حرکت کچھ کلبی فلسفے کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس جذباتی قوت کا اظہار جسے اپنے اثبات کی اور کوئی صورت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ "مراسلات" کے مصنف کو اپنی حرکت پر بہت سخت صدمہ ہوتا ہے، لیکن اپنے نزدیک اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ دنیا بھر میں

نہ ذلیل سمجھا جاتا تھا، ایک بار اسے بھی اپنی شخصیت جتانے کا موقع ملا اور اس نے ایک ہستی کو اپنے سے بھی زیادہ ذلیل کر کے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ اگر اس کی حرکت سے ایک بیچاری لڑکی کے دل پر چوٹ لگی تو افسوس کی بات ہی مگر وہ بھی تو ایسے موقع کا انتظار کرتے کرتے عاجز آگیا تھا۔

اسی طرح دستہ ئفسکی نے "مردوں کے گھر" میں ایک مجرم کا قصہ بیان کیا ہی جس نے اپنی نیکی، فرماں برداری اور حلم کی بنا پر قید خانے میں شہرت حاصل کر لی تھی اور قید خانے کے حاکموں نے اسے قیدیوں کی ایک جماعت کا سردار بنا دیا تھا۔ ایک دن اس پر یکایک جنون سا سوار ہو گیا اور اس نے ایسی حرکتیں کیں کہ اسے مجبوراً دیوانوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ دینا پڑا۔ دستہ ئفسکی اس واقعے کی بس یہی تشریح کر سکا کہ اس مجرم نے برسوں اپنے جذبات کو دبایا تھا اور انھوں نے آخر کار اس خطرناک طریقے پر اپنا زور دکھایا۔ اس مجرم نے لوگوں کے سر پھوڑے، "پاتال کے مراسلات" کے مصنف نے ایک غریب لڑکی کا دل دُکھایا۔ دونوں حرکتیں ایک سی ہیں، ان کا محرک ایک ہی ہی۔ "مراسلات" کے مصنف نے تو کہہ دیا ہی کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان اپنی بھلائی چاہتا ہی اور جو کوئی بھی اپنی شخصیت محسوس کرتا ہی اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ "مراسلات" کا مصنف کمزور کھسیانا آدمی تھا، لیکن وہ "تو ہی شخصیتیں جو بیمار ہو کر مجرم بن جاتی ہیں" دراصل سب اسی کی

طرح اپنی شخصیت ظاہر کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ دستہ ئف سکی کو
رفتہ رفتہ یقین ہوگیا کہ جرم کا مظہر جو مسائل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے
وہ دراصل نفسیات کے معمے نہیں ہیں، ان کا تعلق ایمان اور کفر، تسلیم
اور بغاوت سے ہے۔ خود دستہ ئف سکی دین عیسوی کا پیرو تھا۔ وہ حضرت
عیسیٰ کی شخصیت اور خیر و شر کے اس معیار کو جو انھوں نے قایم کیا تھا
معیار مطلق سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں شکوک تھے، ایسے شکوک
جنھیں عقل اور دلیلیں دور نہیں کر سکتیں اور جب تک یہ موجود تھے اُسے
کسی قسم کے روحانی سکون کی اُمید نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تمام روحانی کشمکش
اور نزاع، انسانی شخصیت کو نامعلوم راستوں سے درجۂ کمال تک پہنچانے
کی وہ تمام کوششیں جن پر دستہ ئف سکی نے اپنے ناولوں میں بحث کی ہے
دراصل عکس ہیں اُس کے اپنے شکوک کا اور نتیجے ہیں اِس دنیا اور اُس
کے مسلمہ اخلاق اور فلسفۂ حیات کو تہ و بالا کر کے ایک نئی دنیا اور نیا
اخلاقی نظام قایم کرنے کی اُن آرزوؤں کا جو اس کے دل میں امنڈتی تھیں۔
مرگی کے دورے سے پہلے کائنات جس شان سے دستہ ئف سکی کو نظر
آتی تھی اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ اس کی بصیرت اور ادراک اور روشن
ضمیری کی انتہا تھی، ایک دیدار جس کے لیے اس کی روح للچایا کرتی تھی،
ایک کیفیت جس نے اس کی نگاہوں میں انسان کے مستقبل کو عجیب
دلکش صورت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دستہ ئف سکی کو انتہائی
پستی کا بھی تجربہ ہوا کرتا تھا، اس پر دیوانگی کے لمحے گزرتے تھے جب

شیطانی خواہشیں اس کا دل ہلا دیتی تھیں اور وہ اپنی وحشت سے پناہ مانگتا تھا۔ وہ مظہر جو نفسیات کی اصطلاح میں "دہری شخصیت" کہلاتا ہے اور جسے دستہ ئف سکی نے دریافت کیا تھا، دراصل اُن متضاد کیفیتوں اور اُمنگوں کا مجسمہ ہے جو دستہ ئف سکی اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا۔

بہر حال اس کے لیے کائنات اور انسانی سیرت کے اسرار معلوم کرنے کا یہی طریقہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو جرم اور شک کا مجسمہ بنا لے، جرم اور شک اور انکار میں تشکیل زندگی کی جو قوت ہو اُسے آزمائے اور اس دنیا کو بگاڑ کر اگر کوئی بہتر دنیا بن سکتی ہو تو بنائے۔ چنانچہ "جرم اور سزا" اور "بھوت پریت" میں دستہ ئف سکی نے جرم اور انکار اور بغاوت کے فلسفۂ حیات پر غور کیا ہے اور اپنے زمانے کے چند واقعات کو پلاٹ کے طور پر رکھ کر مجرم، منکر اور باغی لوگوں کی نفسی کیفیات اور ان کی جد وجہد کا انجام دکھایا ہے۔ انسانی شخصیت کے اظہار کا ایک رنگ یہ ہے۔ دوسرے پر "مجذوب" اور "برادران کرمازف" میں بحث کی جاتی ہے اور ہمیں ان چار ناولوں پر اسی ترتیب سے نظر ڈالنا چاہیے۔

۱۸۶۱ کے بعد "منکریت"[1] کی تحریک نے بہت زور پکڑا اور "منکروں" نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ہی روس کو اندرونی دشمنوں سے پاک کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ معمولاً ریاست کے بڑے عہدے داروں پر حملے کیے جاتے تھے، لیکن ۱۸۶۵

---

[1] دیکھیے پہلا باب، "سیاسی تحریکیں اور سیاسی تصانیف"۔

میں ایک طالبِ علم نے کسی بوڑھی عورت کو جو سود پر قرضہ دیا کرتی تھی مار ڈالا اور عدالت میں بیان کیا کہ میں نے بڑھیا کو مار کر کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ہزاروں غریب آدمیوں کو ایک بلا سے نجات دلائی ہے اور ایسے لوگوں کو مار ڈالنا جو اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچائیں قوم اور انسانیت کی ایک قابلِ قدر خدمت ہے۔ دستہ ئف سکی پر اس واقعے کا اور اس جرم کی منطق کا بہت اثر ہوا۔ "جرم اور سزا" میں اصل بحث اسی پر ہے کہ جرم خیر کا ذریعہ ہو سکتا ہے یا نہیں اور اگر کوئی شخص انسانی مفاد کے ارادے سے خون بہائے تو وہ انسانیت کو اور اپنی ذات کو فروغ دے سکتا ہے یا نہیں۔

"جرم و سزا" کا ہیرو راس کول نی کوف ایک ہونہار مگر بہت غریب طالب علم ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ کسی بلند نصب العین یا اعلیٰ فلسفۂ حیات پر جانیں نثار کرنا کوئی جرم نہیں اور تاریخ میں اس کے ہزار ہا ثبوت ملتے ہیں کہ جن شخصیتوں نے زندگی کو ایک بہتر شکل دی ہے کبھی خون بہانے سے نہیں ڈری ہیں۔ اپنی ذات کے لیے وہ اس عام اصول سے یہ خاص نتیجہ نکالتا ہے کہ اُسے ایک بڑھیا کو جس کے پاس اُس نے کچھ چیزیں گروی رکھائی تھیں اور جو بہت مالدار تھی مار کر نقد روپے پر قبضہ کر لینا چاہیے اور یہ دولت حاصل کر کے ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہیے جس میں اسے اپنے حوصلے پورے کرنے کا بہتر موقع ملے۔ کچھ کشمکش کے بعد وہ ایک دن جا کر کلہاڑی

سے اس بڑھیا کا سر پھوڑ دیتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن کا جو اتفاق سے کمرے میں آجاتی ہے۔ ان دونوں کو مار کر اور نوٹوں کی ایک تھیلی چرا کر وہ گھر بھاگ جاتا ہے۔ اس نے جرم نہایت بھونڈے طریقے سے کیا تھا اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن وہ اپنے اصل ارادے کو عمل میں نہیں لا سکا، اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جرم کرنا آسان ہے، مگر اسے ایک نئی زندگی کی بنیاد بنانا بہت مشکل ہے اور جن تاریخی شخصیتوں نے خون بہا کر اپنی زندگی کو فروغ دیا ان کی سرشت ہی کچھ اور تھی۔ راس کول نی کوف کے جرم نے اُس کے حوصلوں کا خون چوس لیا، اس کے ارادے کی قوت چھین لی، منزلِ مقصود کو اس کی نظر سے چھپا دیا۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ راس کول نی کوف دل سے اخلاقی خیر و شر کے معیار کا قائل نہیں تھا، جب تک اس کا جرم محض ایک ارادہ تھا اُسے یہ خیال رہا کہ میں ایک اصول کے ماتحت عمل کر رہا ہوں، میری کوششوں کا ایک مقصد ہے۔ بڑھیا کو قتل کرتے ہی اس کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ نئی زندگی جو دور سے اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد شروع ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی قریب پہنچنے پر سراب کی طرح فضائے نامحدود میں غرق ہو گئی۔

قتل کے بعد راس کول نی کوف کے روحانی ڈراما کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی منطق کا اس قدر قائل تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کی پشیمانی یا قصور کا احساس نہیں پیدا ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اُس کی روحانی تکلیف اور بھی بڑھ گئی، کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو

مجرم نہیں مانتا تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ اخلاقی قانون اور خیر و شر کا وہ معیار بھی جس کی خاطر اس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا اور جسے وہ اپنی نئی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا چاہتا تھا، درصل کچھ بھی نہیں، محض ایک خیالِ خام ہی۔ اس احساس نے اس کے نفس میں ایک روحانی اور اخلاقی خلا پیدا کر دیا جسے برداشت کرنے کی اس کول نکوف میں ہمت نہ تھی اور جسے درصل کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس خلا سے خوف کھا کر اس نے ان تاریخی ہستیوں میں شامل ہونے کا حوصلہ چھوڑ دیا جن کی پیروی میں اُس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا اور اس کی آرزو کرنے لگا کہ کسی طرح سے عوام کی ذہنیت اختیار کر لے اور اپنے دل میں اس معیار کو پھر قایم اور استوار کر دے جس پر عوام کا فلسفۂ حیات مبنی ہوتا ہی۔ اس نے سونیا سے اپنے جرم کا اقبال کیا۔ سونیا ایک غریب، مسکین اور پاک دل لڑکی تھی جس نے اپنی سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں کو فاقے سے بچانے کے لیے مجبوراً ایک ذلیل پیشہ اختیار کیا تھا اور وہ نہ صرف ایثار کا ایک پُردرد مجسمہ تھی بلکہ اُس عقیدت کا ایک اعلیٰ نمونہ جو انسان میں روحانی تکلیفیں برداشت کرنے کی حیرت انگیز قوت پیدا کر دیتی ہی۔ سونیا کے کہنے سے راسکول نی کوف نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا، اور اُس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی آمادہ ہوگیا، لیکن پھر بھی وہ اپنے دل میں خطا کا احساس نہیں پیدا کر سکا، اپنی منطق کی خامی کا قایل نہیں ہوا اور اپنی ناکامی کا الزام اپنی پست ہمتی اور اس بڑھیا پر لگاتا رہا جسے اس نے قتل کیا تھا۔

اس کی ذہنیت میں انقلاب اُس وقت ہؤا جب وہ سائی بی ریا میں ڈیڑھ سال رہ چکا تھا۔ اُس نے ایک خواب دیکھا کہ ایشیا کی طرف سے ایک نئے قسم کا طاعون آیا ہے جو ہزاروں بستیوں کو ویران کر رہا ہے، اس بیماری کے جراثیم بھی نئی قسم کے ہیں، ان میں عقل اور ارادے کی قوت ہے اور جس کسی کے جسم میں وہ اپنا گھر کر لیتے ہیں وہ فوراً پاگل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے عقل مند، روشن ضمیر اور بلند حوصلہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس خبط میں مبتلا ہونے سے لوگوں میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے، ایک دوسرے کا احترام کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی، وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں، جانیں ضایع ہونے لگتی ہیں، زندگی تہ و بالا ہو جاتی ہے اور چند برگزیدہ ہستیوں کے سوا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہتا۔ اس خواب نے راس کول نی کوف کو اس اصول کے آخری اور لازمی نتیجے سے آگاہ کر دیا جس پر عمل کرنے کا اسے حوصلہ تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر ہر شخص اثبات خودی کو زندگی کا مقصد بنائے، ایک برگزیدہ شخصیت بن بیٹھے اور ہر قسم کا جرم اپنے لیے روا رکھے تو انسانی زندگی ناممکن ہے۔ اثبات خودی کا اصول غلط ہے، اس پر زندگی تعمیر نہیں ہو سکتی، بلکہ جو کچھ انسان نے اپنی محنت اور تکلیفوں سے تعمیر کیا ہے وہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس خواب کے بعد راس کول نی کوف کا دل انسانی ہمدردی اور محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، اس میں نہ غرور رہتا ہے نہ خود رائی اور سونیا اور وہ ایک نئی زندگی کے خوابوں سے اپنی مصیبت کے دن روشن کرتے ہیں۔

راس کول نی کوف کے اصول کی غلطی "جرم و سزا" کا ایک پہلو ہی۔ اس کا دوسرا پہلو شعور اور جذبات کی وہ کیفیتیں ہیں جو ہر دلیل سے زیادہ راس کول نی کوف کی گمراہی عیاں کرتی ہیں۔ ناول کے شروع ہی میں ہم کو معلوم ہو جاتا ہی کہ گو راس کول نی کوف نے جرم کا پختہ ارادہ کر لیا ہی اور ہر وقت اپنے آپ کو یہ یاد دلا کر کہ ایک مہم اُس کے درپیش ہی اپنے دل کو مضبوط کرتا رہتا ہی، نہ تو اُس کی ذہنیت ایک مجرم کی سی ہی نہ سرشت۔ بڑھیا کو قتل کرنے سے پہلے وہ ایک خواب دیکھتا ہی کہ بہت سے کسان نشے میں ایک دبلی کمزور گھوڑی کو بے دردی سے پیٹ رہے ہیں اور بیچاری کو پیٹتے پیٹتے مار ڈالتے ہیں۔ اس خواب کے بعد وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہی اور ارادہ ترک کرتے ہی اس کے دل پر سے ایک بوجھ اُتر جاتا ہی، اُس کی طبیعت صاف ہو جاتی ہی اور زندگی اس کی نظروں میں ایک دل فریب شکل اختیار کر لیتی ہی لیکن سڑک پر جاتے ہوئے وہ کہیں سُن لیتا ہی کہ بڑھیا چھ بجے شام کو گھر پر ہو گی، اور اس پر پھر قتل کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو فروغ دینے کی آرزو اپنا جادو کر دیتی ہی۔ وہ بڑھیا کو قتل کرتا ہی، مگر اس جرم کا اس پر جو اثر ہوا اور اس کے علاوہ سونیا اور اُس کے شرابی باپ اور دیوانی سوتیلی ماں کے ساتھ جو سلوک وہ کرتا ہی، یہ سب اس کا ثبوت ہیں کہ وہ طبیعتاً نہایت شریف، بھولا اور محبت والا آدمی ہی اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا بہت قوی جذبہ ہی۔ مجرم میں یہ اوصاف نہیں ہوتے اور جس میں یہ اوصاف

ہوں وہ جرم کرکے کچھ حاصل نہیں کرسکتا لیکن راس کول نی کوف نے جرم کے فلسفۂ حیات کا اپنی طبیعت پر بہت گہرا رنگ چڑھا لیا تھا، اسے اپنی طبیعت کا اصل رنگ یاد ہی نہیں رہا اور اس طرح وہ بھلائی کرنے کے باوجود اس روحانی تقویت سے محروم رہا جو بھلائی کرنے سے انسان کی شخصیت کو ہوتی ہے۔

"جرم و سزا" میں سونیا کی شخصیت انسانی شعور کی تاریک اور طوفانی فضا میں کچھ روشنی پیدا کرتی ہے اور منزلِ مقصود کی ایک جھلک دکھا دیتی ہے، "بھوت پریت" میں اتنی تسکین بھی نہیں ملتی۔ "جرم و سزا" کی طرح اس ناول کا اصل قصہ بھی بہت مختصر ہے۔ ستاف روگن، کریلوف، ورخوویسکی اور شاتوف سر برآوردہ رکن ہیں ایک جماعت کے جو روس میں اخلاقی اور معاشی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ انقلاب پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں، مگر یہ نوجوان، جن کے اصل رہبر ستاف روگن اور اس کا پٹھو ورخوویسکی ہیں، اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ انھیں عنقریب کامیابی ہونے والی ہے اور جب ستاف روگن اور ورخوویسکی آخر میں دیکھتے ہیں کہ ان کی جماعت مایوس ہو کر منتشر ہونے والی ہے تو وہ شاتوف پر، جس کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے، غداری کا الزام لگا کر اسے بڑی بے دردی سے مار ڈالتے ہیں۔ کریلوف پہلے ہی خودکشی کر چکا ہے، اس جرم کے بعد ورخوویسکی غائب ہو جاتا ہے اور ستاف روگن بھی خودکشی کر لیتا ہے۔ دستہ لفسکی نے اس داستان کا جو پس منظر رکھا ہے

اور جو ضمنی قصے اس میں جا بجا چھڑتے جاتے ہیں، وہ اس کو بظاہر بہت پیچیدہ بنا دیتے ہیں اور یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ساری رام کہانی محض ہذیان ہے۔ لیکن جو لوگ انقلابی جماعتوں کے اندرونی کاروبار سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں یا جن پر وہ کیفیتیں گزر چکی ہیں جب جذبات میں ہیجان ہوتا ہے، دل میں اُمنگیں جوش کرتی ہیں، انسان ہر وقت اپنی شخصیت کا پورا زور دکھانے پر تلا رہتا ہے، مگر اسے اپنی طاقت اور قابلیت دکھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا اور اس کے حوصلے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رہ جاتے ہیں، ایسے لوگ فوراً تسلیم کرلیں گے کہ دستہ ئفسکی نے حقیقت نگاری میں کمال دکھلایا ہے، اور یہاں بھی انسانی شعور کی کیفیات کے علم کا خزانہ لٹایا ہے۔

"بھوت پریت" سنکریت کے فلسفۂ حیات اور ضمناً یورپ کی مادیت کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ دستہ ئفسکی نے اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا ہے، ایک ظاہری، دوسرا باطنی، ایک وہ جس کا تعلق عام تہذیب اور تمدن سے ہے، دوسرا وہ جس کا تعلق انسانی شعور اور انسانی شخصیت کی گہری ذاتی ضروریات سے ہے۔ ستاف روگن، کریل لوف ورخووینسکی، شاتوف سب باغی ہیں، جن میں ورخووینسکی نے معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے اور کریل لوف اور ستاف روگن نے انسان کے اخلاقی اور مذہبی معیار، اور کائنات کے کل نظم و نسق کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ ورخووینسکی جیسے لوگ ہر انقلابی

جماعت میں نظر آتے ہیں، وہ ایک کمینی مگر مضبوط طبیعت کا آدمی ہی، ایک مجرم جسے صرف ایذا پہنچانے میں نہیں بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے میں اور اوہام میں مبتلا کرنے میں لطف آتا ہی، جو ایک نظام کو تہ و بالا کرکے دوسرا کسی اعلیٰ غرض سے نہیں قایم کرنا چاہتا، بلکہ محض تباہی اور بربادی کا منظر دیکھنا چاہتا ہی۔ کریل لوف اور ستاف روگن سرکشی اور اثبات خودی کی مثالیں ہیں اور ان کی روحانی سرگزشت اس ناول کا دوسرا اور گہرا پہلو ہی۔

کریل لوف اور ستاف روگن دونوں باغی ہیں، دونوں نہ خدا کی خدائی تسلیم کرتے ہیں نہ انسان کی انسانیت۔ کریل لوف ایک موقع پر کہتا ہی: "اگر خدا ہی تو ہر بات اس کے حکم سے ہوتی ہی اور میں اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں۔ لیکن اگر خدا نہیں ہی تو میں قادر مطلق ہوں اور اپنی قدرت دکھانے پر مجبور ہوں" اور چونکہ اُسے خدا کا وجود تسلیم کرنا منظور نہیں وہ اپنی قدرت دکھانے کے خبط میں مبتلا ہو جاتا ہی۔ انسان کے وجود کا مقصد اس کے خیال میں یہ ہی کہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرے اور اسے تعجب ہوتا ہی کہ لوگ عام طور سے اپنے اس اہم فرض سے غافل ہیں، جب کہ "ساری دنیا محض ایک فریب ہی اور اس کی بنیاد فریب اور انسانی ہستی کی تحقیر پر ہی، جب کہ دنیا کے سارے آئین جھوٹے ہیں اور شیطانوں کا تماشا"۔ خودکشی سے قبل وہ اپنی حرکت کو جائز اور خودداری کا صریحی تقاضا ثابت کرتا ہی "مجھے تعجب ہوتا ہی

کہ سب لوگ کیسے بلا تامل جیتے رہتے ہیں۔ کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد آدمی نہیں ہی جو خدا کے وجود کا خاتمہ کرکے اور اپنی شخصیت کی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملے میں خودمختاری جتلانے کی ہمت کرسکے؟ یہ تو ویسی ہی بات ہی جیسے کسی فقیر کو ورثے میں اشرفیوں کی تھیلی ملے اور وہ یہ یقین نہ کرسکے کہ وہ اس کا مالک بننے کے قابل ہی۔ میں اپنی خودمختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں ہیں اسے ثابت کروں گا، چاہے مجھے ایک بھی پیرو یا شریک کار نہ ملے۔ مجھ پر لازم ہی کہ اپنے گولی مارلوں، کیونکہ اپنے ہاتھوں فنا ہونا خودمختاری کی انتہا ہی۔" ستاف رد گن کی شخصیت دوسرے قسم کی ہی، اس کی بغاوت کا اندازہ کچھ اور ہی۔ اسے کسی وجود یا قوت کا احساس نہیں جو کائنات پر حاوی اور اس کے نظام کی روح رواں قرار دی جاسکے، وہ باغی ہی، مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ کسی عقیدے یا اصول کی بنا پر سر تسلیم خم کرنا غلط سمجھتا ہی، بلکہ محض اس وجہ سے کہ بغاوت اور سرکشی اس کی سرشت میں ہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ستاف رد گن کو اپنے دل میں اور کل کائنات میں ایک خلا نظر آتا ہی، زندہ ہونے اور کل ہستی کا ایک جزو ہونے کا وہ شعور جو انسان کو کائنات سے وابستہ رکھتا ہی اور اس کی زندگی کو ایک خود سے جاری عمل بنا دیتا ہی ستاف رد گن کے ذہن میں معدوم ہو جاتا ہی اور وہ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہر طرف سہارے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہی۔ وہ کوشش کرتا ہی کہ اپنے روحانی خلا کو کسی قوت کا میدان

عمل بنائے، اپنی بے مقصد زندگی کے لیے کوئی مقصد تلاش کرے اور یوں انسانی زندگی اور کائنات سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قایم کرے۔ اسے کامیابی نہیں ہوتی، اس کی باغی فطرت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کو اپنا سردار یا شریکِ کار بنائے، اس کا ادراک ہر وقت اسے بتاتا رہتا ہے کہ وہ تمام مقاصد جن میں وہ یا اور لوگ مصروف ہیں محض ڈھکوسلے ہیں۔ یوں وہ اپنی قوت کو تعمیر کے کام میں نہیں لا سکتا اور چونکہ سکون فطرتاً ناممکن ہے اس لیے یہ قوت تباہی اور بربادی کا ایک خطرناک ذریعہ بن جاتی ہے لیکن شاعر لیرمنتوف کے شیطان کی طرح ستاف روگن کو بُرائی کرنے میں اور دوسروں کو دکھ پہنچانے میں کوئی لطف نہیں آتا، اسے معلوم ہے کہ اس کے مقاصد بھی ویسے ہی لغو اور ہیچ ہیں جیسے کہ دوسروں کے اور اسے کسی قسم کی تسلّی دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ستاف روگن نے پہلے شہوت پرستی اختیار کی اور یہ چاہا کہ اپنی پوری شخصیت کو اس میں محو کر دے۔ لیکن اس کی شہوت پرستی زبردستی کی تھی، اس میں ستاف روگن کو نہ کسی قسم کی لذت حاصل ہوئی نہ شہوانی حرکتوں پر کوئی ندامت ہوئی اور وہ خلا جسے وہ اس طرح سے پُر کرنا چاہتا تھا ویسا ہی رہا۔ اس ناکامی کے بعد ستاف روگن منکروں میں شامل ہو گیا کہ شاید دوسروں کی طرح اس پر بھی کوئی بھوت سوار ہو جائے، یا وہ کسی خبط میں مبتلا ہو جائے۔ منکریت کی تعلیم سے اسے مطلق کوئی عقیدت نہیں تھی، لیکن اس نے انتہائی

عقیدت ظاہر کی اور اس کی بھی کوشش کی کہ دوسرے دل کا عقیدہ پختہ ہو جائے۔ یہاں بھی وہ ناکام رہا اور اس کے عقیدت مندوں کے جوشِ اعتقاد کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر اسے اپنی شخصیت کی قوت جتلانے کی سوجھی، اس نے ایک لنگڑی، بدقطع اور مجنون عورت سے شادی کر کے اس کا ہر جگہ اعلان کیا، اپنے آپ کو انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ بھری محفل میں رسوا کرایا، بغیر آنکھ جھپکائے ایک حریف کے پستول کا سامنا کیا۔ یہ دوا بھی بے اثر رہی۔ اس کے بعد ستاف روگن نے عشق کے سایہ میں پناہ لینا چاہی، مگر اس جذبے میں بھی وہ روحانی خلا، جس سے وہ بچنا چاہتا تھا اسے ستاتا رہا۔ اب اس سے گریز کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، کیونکہ موت کے ذریعے سے نجات پانے کا خیال بھی اسے ایک ڈھکوسلا نظر آیا۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا "مجھے معلوم ہے کہ یہ بھی شرمندگی کا باعث ہوگی۔ خود فریبی کی ترکیبوں میں ایک اور مہمل ترکیب"۔ مگر آخر کار اس نے رہائی کی یہی تدبیر اختیار کی۔

"جرم و سزا" اور "بھوت پریت" میں دستہ ئفِسکی نے دکھایا کہ اثباتِ خودی سے، شخصیت کامل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس میں وہ تمام ذریعے جو انسان کو کامل بنا سکتے ہیں معدوم ہو جاتے ہیں اور انسان یا تو اس کول نکوف کی طرح اپنی تنہائی برداشت نہیں کر پاتا اور خیر و شر کے معیار کی عدم موجودگی سے بے بس ہو جاتا ہے، یا اس کی

زندگی اور خیالات میں ویسا ہی بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسے کستاف روگن کی زندگی میں اور وہ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے لیکن اثبات خودی کے علاوہ بغاوت کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں، ایسے انسان بھی خدا کو اور کائنات کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں جن کی بغاوت میں اپنی کوئی غرض نہیں، جو اپنی شخصیت کا بیجا فروغ نہیں چاہتے جو تکبر کے زعم میں دوسروں کو اپنے مقاصد پر نثار کرنا منطق سے صحیح نہیں ثابت کرتے۔ یہ باغی دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جو مظلوم ہیں، دوسرے وہ جنھیں اوروں کی بےکسی اور مظلومیت کا احساس ہے "مجذوب" میں نستاسیا فلی پوفنا اور "برادران کرمازوف" میں ایوان ان دونوں کی کی مثالیں ہیں۔

نستاسیا فلی پوفنا کا باپ ایک نہایت شریف آدمی تھا جس کی ساری عمر ناگہانی مصیبتوں کا سامنا کرتے گزری۔ اس کی تقدیر کا آخری وار یہ تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر میں آگ لگ گئی، اس کی دو بچیاں تو بچ گئیں مگر اس کی بیوی مع کُل گھر گرستی کے جل گئی۔ اس صدمے نے اسے ہلاک کر دیا اور اس کی دونوں بچیاں لاوارث ہو گئیں۔ توتُس کی، قریب کے ایک خوش حال زمیندار نے رحم کھا کر بچیوں کی پرورش اپنے ذمہ لے لی اور ان کی تعلیم کا انتظام کر کے انھیں اپنی کسی غریب رشتے دار کے سپرد کر دیا۔ بڑی بچی تو چند سال بعد مر گئی، چھوٹی نستاسیا زندہ رہی اور جب اس کی عمر بارہ سال کی ہو گئی تو توتُس کی نے دیکھا کہ وہ حسن اور

ذہانت میں یکتا ہو اور اس سن رسیدہ عیاش کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے نستاسیا کی تعلیم کا اور بہتر انتظام کر دیا اور جب وہ سولہ سال کی ہوگئی تو اپنے دور افتادہ گاؤں میں ایک مکان بنوایا، اسے خوب آراستہ کیا اور اس میں نستاسیا کو اپنی مدخولہ بنا کر رکھ لیا۔ اس کے خیال میں نستاسیا بہت خوش اور مطمئن تھی، نستاسیا کے دل کی کیفیت کا پتہ اس کو تب چلا جب چار سال بعد اسے ایک شریف لڑکی سے شادی کرنے کا حوصلہ ہلا اور وہ نستاسیا سے پیچھا چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ نستاسیا اس کے ارادہ کی خبر سن کر تن تنہا گاؤں سے نکل کر پیٹر برگ پہنچی اور پہلی ہی گفتگو میں توٹس کی کو معلوم ہو گیا کہ اسے ایک سیدھی سادی لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بے حد چالاک اور بے باک عورت سے سابقہ ہے جس کے دل پر اتنے زخم لگ چکے ہیں کہ اب اسے زخموں کا کوئی خوف نہیں، جو دُکھ سہتے سہتے دیوانی ہوگئی ہے اور جسے اپنی زندگی کے بگڑنے کی مطلق پروا نہیں ہے۔ توٹس کی کو اندیشہ تو ضرور تھا کہ اب نستاسیا پر قابو رکھنا اس کے بس کی بات نہیں، لیکن پھر بھی وہ نستاسیا کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جس وقت "مجذوب" کا قصہ شروع ہوتا ہے، نستاسیا پیٹر برگ میں پانچ سال رہ چکی تھی، توٹس کی نے اس کے لیے ایک شوہر تلاش کیا تھا اور وہ اور اس کا دوست جنرل اے پانچن نستاسیا کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کر رہے تھے اور پچھتر ہزار روبل جہیز میں دینے کا لالچ دے رہے تھے۔ نستاسیا کو معلوم تھا کہ وہ شخص جس سے یہ اس کا نکاح کرانا چاہتے ہیں محض روپے کے لالچ

میں شادی کر رہا ہی اور جہیز کا روپیہ ان دنیا داروں کے خیال میں بڑی سے بڑی قیمت ہی جو ایک عورت کی عزت اور آبرو کی ہو سکتی ہی۔ یہ آخری بے حرمتی، ایک ایسا صدمہ تھی جسے وہ برداشت نہ کر سکی اور اس دنیا اور ان اخلاقی معیاروں کا منہ چڑانے کے لیے جو ایسا ظلم روا رکھتے تھے اس نے اپنی پچیسویں سالگرہ کے دن ایک محفل میں جس میں تولٹس کی اور اے پانچن دونوں موجود تھے اپنے آپ کو ایک لاکھ روبل کے بدلے روگوژن ایک خبطی تاجر کے ہاتھ بیچ دیا اور تولٹس کی اور اس کی دی ہوئی دولت اور آسایش کو خیرباد کہہ کر روگوژن اور اس کے شہدوں کے ساتھ چل دی۔

اسی محفل میں نواب لِف نکولا یوچ میشکن "مجذوب" کا ہیرو، جسے کوئی دماغی مرض تھا اور جو اُسی دن اچھا ہو کر سوئٹستان سے واپس ہوا تھا، بن بلائے پہنچ گیا تھا۔ محفل میں جانے سے پہلے اس نے اتفاق سے نستاسیا فلی پوفنا کی تصویر دیکھ لی تھی اور اتفاق سے دونوں کی ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ میشکن کو نستاسیا کی آنکھوں میں ایک باغیرت دل کے درد، پاک آرزوؤں کی تباہی کے غم، اور انسانی فطرت کے کمینہ پن کی شکایت ایسی موثر شکل میں نظر آئی کہ اس کا دل بیتاب ہو گیا اور اس نے اپنا فرض سمجھا کہ نستاسیا کے پاس جا کر اپنے سر کو اس کے قدموں پر رکھ دے اور اس کے درد اور غم اور شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے وہ جو کچھ کر سکتا تھا اور کرنا چاہتا تھا اُس کا وعدہ ایک ناچیز

تحفے کے طور پر پیش کرے۔ اس نے اپنا ارادہ پورا کیا، نستاسیا کو یقین دلایا کہ باوجود توتسکی کی مدخولہ رہنے اور آوارگی اور بداخلاقی کی بنا پر بدنام ہونے کے وہ دراصل معصوم اور بے گناہ ہے، اسے وہ واقعات یاد دلائے جب اس نے ایسی شرافت اور غیرت دکھائی تھی جس کا شائبہ بھی اس کے معترضوں میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میشکن نے کہا کہ میں شوہر کی حیثیت سے تمام عمر آپ کی خدمت، عزت اور دل جوئی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن نستاسیا اب "بغاوت" پر تُل چکی تھی، میشکن کی باتوں کا اور اس کے وعدے کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا، مگر اس نے میشکن کی تجویز منظور نہیں کی۔ وہ بہت کچھ برداشت کر چکی تھی، اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر صورت میں اپنی آزادی محفوظ رکھوں گی اور جس دنیا نے مجھے بے بس پا کر رسوا کیا اس میں طوفان برپا کر کے اپنی طاقت کو دکھاؤں گی۔ محفل میں اپنے آپ کو رد گوژن کے ہاتھ بیچنے کے بعد وہ اس ارادے پر قایم رہی۔ کچھ دن رد گوژن کے ساتھ عیاشی کر کے وہ پیٹرزبرگ سے بھاگ کر ماسکو میں روپوش ہو گئی، کیونکہ رد گوژن اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا؛ پھر جب رد گوژن نے اس کا پیچھا کیا تو نستاسیا نے میشکن کے پاس پناہ لی اور میشکن نے اُس سے نکاح کرنا چاہا تو آخر وقت میں اسے چھوڑ کر رد گوژن کے پاس پھر بھاگ گئی۔ یہی واقعہ دوبارہ پیش آیا اور آخری دفعہ جب وہ رد گوژن کے قبضے میں آئی تو اس نے اسے مار ڈالا۔ "مجذوب" کا آخری سین یہ ہے کہ

روگوژن، میشکن کو، جو نستاسیا کی تلاش میں ہی، اس کمرے میں لے جاتا ہی جہاں اس نے نستاسیا کے سینے میں چاقو بھونک دیا تھا اور میشکن کو اس کی لاش دکھاتا ہی، پھر دونوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اور آخر میں جب دوسرے دن لوگ دروازہ توڑ کر اندر گھستے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ روگوژن اور میشکن دونوں پاس بیٹھے ہیں، روگوژن کو سرسام ہو گیا ہی اور وہ رہ رہ کر چِلّا اُٹھتا ہی، میشکن پھر اُسی دماغی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہی جس سے وہ اچھا ہو کر روس آیا تھا اور اب بالکل پاگل ہی۔ یہ منظر اس قدر پُر درد وحشت انگیز اور دل ہلا دینے والا ہی کہ کوئی صاحبِ دل اسے پڑھ کر اپنے ہوش و حواس میں برقرار رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

نواب میشکن کا دوبارہ پاگل ہو جانا دلیل ہی اس کی ناکامی کی اور اس کی ناکامی میں خود دستہ ئفسکی بھی شریک ہی، کیوں کہ میشکن انسانِ کامل کا پہلا مجسمہ ہی جو دستہ ئفسکی نے بنایا اور بنا کر آزمایش کے لیے دنیا کے میدانِ عمل میں کھڑا کیا۔ میشکن آئینِ عیسوی کا سچا پیرو ہی، گو وہ مذہب پر گفتگو نہیں کرتا، اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کسی اور جذبے کی گنجایش نہیں۔ اس کا سلوک بھی ہر وقت ہر ایک کے ساتھ ویسا ہی ہی جیسے حضرت عیسیٰ کے ایک سچے پیرو کا ہونا چاہیے۔ پہلے پہل اس کی انتہائی سادگی اور سادہ لوحی دیکھ کر لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں، لیکن اسے اپنی

پاک دلی، بے نفسی اور بے ریائی ثابت کرنے میں دیر نہیں لگتی اور لوگ خود بخود اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مردم شناسی اور موقع شناسی، دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی، لوگوں کی فطرت اور ان کی نیت کا وجدانی علم اسے راست گوئی اور راست بازی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کا ذہن اس قدر قوی اور روشن ہے کہ کبھی کوئی اسے بے وقوف نہیں بنا سکتا، گو اس کی طبیعت ایسی ہے جس پر دنیا داروں کا خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ میشکن نے وہ تمام مرحلے بغیر کسی خاص دشواری کے طے کر لیے جن سے آئینِ عیسوی کے "سچے" پیرو کو گزرنا پڑتا ہے، اس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا، خطاؤں سے درگزر کرنا، سچ بولنا، دوسروں کا بھلا چاہنا سکھایا، اُس نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی پیروی دنیاوی اغراض کے لیے بھی مضر یا مخدوش نہیں، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نستاسیا پر اس کی شخصیت کا مطلق اثر نہ ہوا اور یہ ناکامی اس کی تباہی کا سبب ہوئی، کیونکہ نستاسیا کو خدا سے اور دنیا سے خوش نہ کر سکنا گویا یہ تسلیم کرنا تھا کہ دل کے بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی دوا مسیحا کے پاس بھی نہیں۔ میشکن کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان کو اپنے اوپر پورا اختیار ہوتا ہے اور اسے کوئی اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنی بھلائی چاہے۔ عموماً انسان اپنے آپ کو مجبور

سمجھتا ہے اور اس مجبوری کا احساس اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اُسے اپنے اختیار کی مطلق خبر ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کسی انسان کو ویسے ہی رُوحانی صدمے پہنچیں جیسے نستاسیا نے برداشت کیے اور وہ بیزار ہو کر اپنے کل اختیار کو عمل میں لائے تو اُسے کوئی قابو میں نہیں لاسکتا، پھر نہ مسیحی ایثار اور محبت کام آتی ہے نہ دنیاداروں کی نصیحتیں اور عقل سلیم کی ہدایتیں[1]

---

[1] دستہ ئف سکی کے خیالات کو سلسلے سے بیان کرنے میں ہمیں "مجذوب" پر ناول کی حیثیت سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن دراصل "مجذوب" میں فلسفہ بہت کم نمایاں ہے۔ زندگی اور انسانی فطرت کی مصوری کے اعتبار سے وہ دستہ ئف سکی کا بہترین ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ جنرل اے پانچن کی لڑکی اگلایا شوخ، حسین، تنک مزاج، دلیر، جو میشکن سے شادی کرنا چاہتی ہے اور آخر میں نستاسیا فلی پوفنا کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے، بے بچف، خوشامد خوروں کا سرتاج، جو ہر رئیس کے نسب نامے اور کمزوریوں اور عیاشیوں سے پوری واقفیت رکھتا ہے؛ ایپولیٹ، ایک ذہنی باغی جو بڑی دھوم سے ثابت کرتا ہے کہ دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں۔ اور بڑے جوش اور عقیدت سے اعلان کرتا ہے کہ میں خودکشی کرنے والا ہوں، مگر آخر وقت میں اس کا پستول نہیں چلتا اور اسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ مجھے ناکامیابی پستول کی خرابی سے ہوئی، اس میں میری ہمت کا قصور نہیں ہے؛ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے کیریکٹر ہیں جن کی سیرتیں اور مشاغل بیان کرنے میں دستہ ئف سکی نے مصوری کے کرشمے دکھائے ہیں۔ لیکن ان کوششوں کی عظمت کا پورا اندازہ ناول پڑھنے ہی سے ہوسکتا ہے، یہاں اُسے واضح کرنے کی گنجائش نہیں۔

انسان کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا کوئی ایسی نادر بات نہیں ہے۔ نستاسیا فلی پوفنا کی طرح ہر اخلاقی پابندی سے انکار کرنے والے بہت کم ہوئے ہیں اور اختیار کی بدولت اپنی ذات کو نقصان پہنچانے والے اور بھی کم۔ عموماً انسان رسم و رواج، اخلاقی معیار اور مذہبی احکام کی پابندی سے اُسی وقت انکار کرتا ہے جب ان پر عمل کرنا اسے اپنی ذات کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم اس کی سرکشی کو غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز قرار دے سکتے ہیں، لیکن جب اسے وہی شکایتیں ہوں جو نستاسیا کو تھیں، اس کا دل ویسا ہی ہو، آرزوئیں وہی، تو پھر ہر شخص جس میں ہمدردی کی ذرا بھی صلاحیت ہے، اس پر الزام لگانا، یا اس کے رویّے کو ناجائز قرار دینا ظلم سمجھے گا۔ نواب میشکن ہمدردی اور ایثار کا مجسّمہ تھا۔ اس لیے اُس نے کبھی نستاسیا پر نکتہ چینی نہیں کی، ہمیشہ اس کے روبرو اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو قصور وار بتاتا رہا؛ اور آخر میں جب نستاسیا نے اپنے اختیار کی بدولت جان کھوئی تو میشکن کو اس کی تباہی پر اتنا صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی پاگل ہوگیا۔ "مجذوب" کا یہ انجام دستہ ئف سکی کی نزاکت احساس اور نکتہ رسی کی بہت گہری دلیل ہے، مگر گمراہ کا جان کھونا اور رہنما کا دیوانہ ہو جانا جبر و اختیار کے اخلاقی معمے کو حل نہیں کرتا۔ "برادران کرمازوف" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے خود دستہ ئف سکی کو یقین

ہو گیا کہ اگر مفروضہ انسان کامل درد کی صدا سُن کر اسی طرح تڑپ اُٹھے اور بدحواس ہو جائے جیسے نواب میشکن تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے اُس نے انسان کامل کا ایک اور مجسمہ بنایا، درد کی صدا ویسی ہی دلسوز رکھی، مگر اپنے ہیرو کے دل کو پگھل جانے کی کمزوری سے بچالیا۔ "برادران کرمازوف" میں درد کی صدا اِوان کرمازوف بلند کرتا ہے اور وہی باغی بھی ہے، الک سے ئی (الیوشا) کرمازوف، اس کا چھوٹا بھائی مسیحی اوصاف کا نیا مجسمہ ہے۔

"برادران کرمازوف" دستہ ئف سکی کا سب سے لمبا ناول ہے، لیکن پھر بھی اسے نامکمل سمجھنا چاہیے، کیوں کہ دستہ ئف سکی کا ارادہ تھا کہ اُس کے سلسلے کو جاری رکھے اور الیوشا (الک سے ئی) کرمازوف کی مفصل سرگزشت بیان کرے۔ دستہ ئف سکی کو موت نے آگھیرا اور وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا، جس کی وجہ سے الیوشا کی شخصیت کا صرف خاکہ سا بن کر رہ گیا اور اس کے ذریعے سے دستہ ئف سکی نے تشکیلِ زندگی کے جو دل فریب منصوبے باندھے تھے وہ پورے نہیں ہو سکے۔ ناول کا دوسرا پہلو، جس میں شک اور بغاوت نئے رنگ میں دکھائی گئی ہے، بہت زیادہ مکمل ہے، اِوان کرمازوف کا فلسفہ بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور ناول کی موجودہ شکل میں وہی اس کا سب سے زیادہ دل چسپ پہلو ہے۔ الیوشا اور اِوان کرمازوف کے علاوہ ان کا بڑا بھائی مِتیا (دمتری کرمازوف)، ان کا باپ، فیوڈور پاولووچ کرمازوف

سمرجیاکوف، فیوڈور پا فلووِچ کا حرامی لڑکا اور ایک رہبان زو سیما ناول کے ممتاز کیرکٹر ہیں اور ناول کا بہت بڑا حصہ ان کی سرگزشت سنانے میں صرف ہوتا ہے، اس ناول کے نسوانی کیرکٹر بہت کمزور ہیں اور نستاسیا فلی پوفنا، اگلایا، "بیکس و مظلوم" کی ہیروئن نتاشا اور "جرم و سزا" کی ہیروئن سونیا کے مقابلے میں وہ مصنوعی اور بے جان معلوم ہوتے ہیں۔

فیوڈور پا فلووِچ کرمازوف ایک عیاش، بدطینت، خود غرض اور بے حیا آدمی ہے، جس کے ساتھ کسی قسم کی انسانیت برتنا محال ہے اور وہ ایک کسوٹی ہے جس پر دستہ کفسکی نے اس کے تینوں بیٹوں کی فطرت کا امتحان لیا ہے۔ متیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا، دل کا بہت اچھا مگر آوارہ اور شرابی ہے، اُسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں ہے اور وہ شروع سے کھلم کھلا اپنے باپ کی جان لینے کی قسمیں کھاتا رہتا ہے۔ ایوان کرمازوف کا بھی خیال ہے کہ ایسے آدمی کو جینے دینا ایک جرم ہے، لیکن وہ اپنے خیال کو بے تکے پن سے ظاہر نہیں کرتا، وہ متیا کی طرح فضول خرچ نہیں ہے، اسے باپ سے روپے مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے وہ اس مسئلہ پر خیر و شر کے بلند تر مسائل کی تحت میں غور کرتا ہے۔ اس میں اتنا جوش نہیں ہے کہ اپنے خیالات پر عمل کرنے کے لیے بے تاب ہو، مگر جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، فیوڈور پا فلووِچ کے حق میں اس کے خیالات متیا کے ارادوں سے

کچھ بہتر نہیں۔ الیوشا اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے۔ وہ باپ سے لڑتا جھگڑتا نہیں، اس کی نسبت اچھے یا بُرے خیالات نہیں رکھتا اور گو اُسے بھی باپ کی حرکتوں پر بہت صدمہ ہوتا ہے، وہ خاموشی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ایک روز اچانک فیوڈور پافلووِچ اپنے کمرہ میں مرا ہؤا پایا جاتا ہے اور حالات کچھ ایسے ہیں کہ متیا پر شبہہ ہوتا ہے۔ متیا اس رات کو چھپ کر اس کے کمرے تک آیا تھا، لیکن اُسے یکبارگی خیال ہؤا کہ میں اپنے باپ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ اُسے مار ڈالوں تو کوئی تعجب نہیں اور اس خیال نے اس کے دل میں اتنی وحشت پیدا کر دی کہ وہ بھاگ گیا۔ اُس کے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا دشوار کیا ناممکن تھا، اور آخر میں اُسے سزا بھی ہو گئی، لیکن باپ کا قاتل وہ نہیں تھا بلکہ سمر جیاکوف، فیوڈور پافلووِچ کا حرامی لڑکا جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ جرم کی منطق اور مجرم کی نیت کا ادان کرما زوف کے خیالات سے بہت گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ سارا کرمازوف خاندان رہبان زوسیما کی کوٹھری میں جمع تھا۔ رہبان کو معلوم ہؤا تھا کہ ایوان نے کچھ عرصے پہلے ایک مضمون میں کلیسا اور ریاست کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر انسان کی روح کو بقا نہیں ہے تو نیکی کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں" یہ سُن کر رہبان زوسیما نے کہا کہ "اگر تمھارا یہی عقیدہ ہے تو تم یا تو بڑے خوش نصیب ہو یا پھر بہت بد نصیب۔۔۔

تمھارے دل میں ابھی اس مسئلے کا قطعی فیصلہ نہیں ہؤا ہے اور یہی بات تمھیں سب سے زیادہ دکھ پہنچائے گی، کیونکہ تم کو ہر وقت خیال رہے گا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہیے۔" درحقیقت یہ مسئلہ اوان کو ہر لمحہ پیچ و تاب میں رکھتا ہے اور اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ روح کی بقا کا سوال اور بہت سے مسئلوں سے وابستہ ہے جو اوان کے دل اور دماغ کو مصروف رکھتے ہیں اور اُسے کسی عقیدے پر استقلال سے قایم رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ اوان کو اپنی عقل اور دانائی پر گھمنڈ نہیں، وہ خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا، بلکہ شروع ہی سے اُسے تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ خدا کے وجود کی طرح تقدیر کی مصلحتوں کو سمجھنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ وہ یوم جزا کا معتقد ہے، اسے یقین ہے کہ اس روز انسان کے اعمال کا حساب ہوگا اور خدا کے عدل و انصاف اور اس کی رحمت کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بغاوت پر، یا جیسے کہ وہ خود کہتا ہے "خدا کو نہایت ادب کے ساتھ اپنے داخلے کا ٹکٹ واپس دے دینے پر" مجبور پاتا ہے۔ اُسے منظور نہیں کہ انسانی اخلاق کو عذاب اور ثواب کے قانون پر منحصر کیا جائے، ثواب کی امید میں انسان سے بے شمار تکلیفیں اُٹھانے اور دکھ سہنے کو کہا جاتے اور پھر وہ گناہ کرے گا اُسے سزا دی جائے۔ ممکن ہے علت اور معلول کے نظریے سے ثابت کر دیا جائے کہ انسان خود اپنی مصیبت اور دکھ کا ذمہ دار ہوتا ہے،

مگر اس توضیح سے کسی کا دُکھ درد رتی برابر بھی کم نہیں ہوتا اور جس شخص کو دوسروں کے درد کا احساس ہو اور جو اس درد کو بالکل مٹانا چاہتا ہو، اُسے علت و معلول کے نظریے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ اوان کو اپنے اعتراضات کا کہیں بھی خاطر خواہ جواب نہیں ملا ہے، پھر بھی وہ اس پر تیار ہے کہ اپنا دل مضبوط کر کے ان لوگوں کے دکھ درد کو نظر انداز کرے جو سزا و جزا کے قانون سے واقف ہیں، جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں اور یوں سزا کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن اوان کہتا ہے کہ دنیا میں صرف سمجھدار لوگوں کو نہیں بلکہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بھی بے انتہا اذیتیں پہنچی ہیں۔ ان کا کوئی سبب نہیں اور انھیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی جس کے دل میں ذرّہ بھر محبت اور درد ہے اس دنیا میں رہنا اور اس کے نظام کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ "میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ سب یکساں گنہگار ہوتے ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی مصیبتوں کا ان کے گناہوں سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن بچّے تو مجرم اور گنہگار نہیں ہو سکتے اور اگر دراصل وہ بھی اپنے والدین کی بدکرداریوں میں شریک ہوتے ہیں تو جس منطق سے یہ شرکت ثابت کی جاتی ہے وہ اس دنیا کی منطق نہیں اور میری سمجھ میں نہیں آسکتی"۔ اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے:

"اگر سب کو دکھ سہنا اس وجہ سے لازمی ہے کہ پھر دائمی مسرّت حاصل کر سکیں اور زندگی میں کامل ہم آہنگی قائم

ہو سکے[1] تو پھر براہ کرم یہ تو بتاؤ کہ بچوں پر دکھ سہنا کیوں لازمی ہے؟" اوان نے ادھر اُدھر سے واقعات یہ دکھانے کے لیے جمع کیے ہیں کہ بچوں کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا جاتا ہے، وہ کس بے بسی سے خدا سے دعا مانگتے ہیں اور ان کے معصوم دلوں کو کیسے کیسے صدمے پہنچتے ہیں۔ ان کے درد سے اِوان کو اس قدر تکلیف ہوئی ہے کہ وہ روزِ جزا کو، اس بصیرت کو، جو قیامت کے دن مشیت کے کل راز واضح کردے گی اور ہر دل سے کدورت اور شکایت دھو ڈالے گی اور اس وعدے کو کہ دنیا میں جو بے گناہ دُکھ سہے گا اسے جنت کی مسرت آخر میں ملے گی اپنے دل کی تسلی کے لیے کافی نہیں پاتا۔ وہ کہتا ہے: "میں تلافی چاہتا ہوں... قیامت کے روز نہیں، جو خدا جانے کب ہوگا اور کہاں بلکہ اسی دنیا میں اور ابھی، تاکہ میں اسے سمجھ سکوں، میری اپنی آنکھیں اُسے دیکھ سکیں..." اس خوف میں کہ کہیں آخر کار قیامت کے روز پاک دلوں کی محبت کا جلوہ دیکھ کر وہ خود بھی خدا کی شان میں گیت گانے لگے، وہ کہتا ہے: "جب تک موقع ہے میں اپنے آپ کو ہر طرف سے بند اور محفوظ کرلوں گا، اور تب کہہ دوں گا کہ مجھے بلند روحانی

---

[1] عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دینِ عیسوی کی سچی پیروی کی جاتے تو دنیا میں کامل ہم آہنگی قایم ہو جائے گی۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اُن نیک لوگوں کو جنھوں نے حق کے لیے اپنی ساری مصیبتیں صبر سے برداشت کی ہیں، خدا کی مشیت کے تمام راز معلوم ہو جائیں گے۔ اس روز گویا حق کی فرماں روائی ہوگی۔

ہم آہنگی کی حاجت نہیں۔ یہ بلند ہم آہنگی بہت گراں ہے۔ اگر یہ اُس... مظلوم بچی[1] کے آنسوؤں کے مول ملی جس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیاں سینے پر ماریں اور اس گندی کوٹھری میں ایسے آنسو بہا کر جن کا کسی نے بدلہ نہیں لیا اپنے "پیارے اللہ میاں" سے دعائیں مانگیں کہ مجھے مصیبت سے چھڑاؤ، بہت گراں ملی، کیونکہ بچی کے آنسوؤں کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا، اور ان کا بدلہ لینا لازمی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر ہم آہنگی بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا بدلہ لیا جائے تو کس صورت سے... کیا اس طرح سے کہ مجرموں کو سزا دی جائے؟ سزا دینے سے کیا فائدہ... دوزخ کے عذاب سے کیا کام چل سکتا ہے جب یہ بچّے جتنا دکھ سہہ سکتے تھے سہہ چکے ہیں۔ اور پھر یہ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کیسی جس کے ساتھ ساتھ جہنم کا عذاب بھی ہے: میں تو چاہتا ہوں سب کی خطائیں معاف کرنا، سب کو محبت سے گلے لگانا، میں چاہتا ہوں دنیا سے دکھ کو مٹا دینا اور اگر بڑوں کے دکھ کے ساتھ بچوں کا دکھ بھی شامل کرنا ضروری ہے کہ حق کی پوری قیمت دی جا سکے تو میں پہلے ہی سے یاد آکر کہے دیتا ہوں کہ حق کی ہرگز اتنی قیمت نہیں ہو سکتی... میں نہیں چاہتا ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی اور اس وجہ سے نہیں چاہتا کہ مجھے

---

[1] ایوان اس سے پہلے اسی بچّی کا قصّہ سنا چکا ہے۔ بچھونا گندا کرنے کی سزا میں ماں باپ نے سردی کے موسم میں اس کے کپڑے اُتار کر اور اس کے چہرے پر گو لیس کر پاخانے میں بند کر دیا اور خود جا کر چین سے سو رہے۔

انسان سے محبت ہے۔ میں حق کی حکمرانی نہیں تسلیم کروں گا، میں اس دکھ میں محو رہوں گا جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے۔ میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے اس دکھ پر جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے، اپنی شکایتوں اور شکایتوں کے پیدا کیے ہوئے غصّے پر قایم رہوں چاہے میں غلطی ہی پر کیوں نہ ہوں۔ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کی قیمت بہت اونچی لگائی ہے۔ میری جیب میں اتنے دام نہیں کہ داخلے کا ٹکٹ خرید سکوں۔ اس لیے میں داخلے کا ٹکٹ بلا تامل فوراً واپس کردوں گا۔ اور اگر میں ایمان دار آدمی ہوں تو جس قدر جلد ممکن ہو مجھے ٹکٹ واپس کر دینا چاہیے۔ الیوشا[1] میں خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتا، صرف اپنا ٹکٹ نہایت ادب کے ساتھ واپس دے رہا ہوں"۔

اوان کی بغاوت اور اس کی شکایتوں پر اگر واقعی غور کیا جائے تو اُس سکون اور اطمینان کو خیرباد کہنا ہوگا جو مذہب اور عقیدے کے ذریعے سے انسان حاصل کرتا ہے۔ الیوشا، اوان کا چھوٹا بھائی جس میں مذہب کا سچا جذبہ ہے اور جو دین عیسوی کا مخلص پیرو ہے اپنے پختہ عقیدے کے باوجود اوان کی کسی دلیل کو رد نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا۔ آخر میں جب حضرت عیسٰی کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے اور الیوشا حضرت عیسٰی کے ایثار کو معصوموں کے درد کا کفارہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو اوان اسے ایک مضمون سناتا ہے جو اُس نے کچھ عرصے پہلے لکھا تھا۔ اس مضمون کا

---

[1] الکسے ئی کرمازوف، اوان کا چھوٹا بھائی جو اس تقریر میں اس کا مخاطب ہے

عنوان "اسقفِ اعظم"[1] ہی، اور اس میں رومن کیتھلک کلیسا کا ایک بڑا عہدے دار حضرت عیسیٰ کو، جو دوبارہ دنیا میں آئے ہیں، قید کر دیتا ہی اور قید خانے میں جاکر اُنھیں سمجھاتا ہی کہ اُس نے اُنھیں کس وجہ سے قید کیا ہی اور دوسرے روز زندہ جلا دینے کی سزا کیوں دے گا۔ اسقفِ کسی شبہے میں نہیں ہی، اسے بالکل یقین ہی کہ اُس کا قیدی حضرت مسیح کے سوا اور کوئی نہیں، مگر اس کی وجہ سے وہ اپنے قیدی کو سزا دینے پر اور بھی تل جاتا ہی، اس لیے کہ اُسے دینِ عیسوی اور خود حضرت عیسیٰ کی ذات سے بہت شکایتیں ہیں۔ رات کو وہ اپنے قیدی حضرت عیسیٰ کے پاس جاتا ہی، اُنھیں وہ تین ترغیبیں[2] یاد دلاتا ہی جن سے شیطان نے اُنھیں بہکانے کی کوشش کی تھی اور اس پر بہت لعنت ملامت کرتا

---

[1] اس پورے مضمون کا ترجمہ رسالۂ "جامعہ" بابت ۱۹۲۸ء میں شایع ہو چکا ہی۔

[2] پہلی ترغیب یہ تھی کہ شیطان نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ "ان پتھروں کو حکم دو کہ روٹی بن جائیں" مگر حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ "انسان صرف روٹی کے سہارے نہیں جیتا ہی"۔ تب شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک اونچے مینارے پر لے جاکر کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر تمھیں خدا پر بھروسہ ہی تو نیچے کود پڑو۔ حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ خدا کی آزمایش کرنا منع ہی۔ آخر میں شیطان اُنھیں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور کل روئے زمین کا منظر دکھا کر کہا کہ اگر تم میری پرستش کرنے پر راضی ہو جاؤ تو میں تمھیں ساری دنیا کا بادشاہ بنا دوں گا۔ حضرت عیسیٰ نے خفا ہو کر اُسے اپنے سامنے سے بھگا دیا۔

ہے کہ انھوں نے شیطان کا کہنا نہیں مانا۔ پہلی ترغیب یاد دلا کر سقف کہتا ہے:
"تجھے معلوم ہے کہ صدیاں گزرتی جائیں گی اور نوع انسانی اپنی عقل اور علم کے ذریعے سے اس کا اعلان کرے گی کہ انسان مجرم نہیں ہوتے اور ظاہر ہے گناہ گار بھی نہیں، صرف بھوک کے مارے ہوتے ہیں" اور پھر "اگر روحانی غذا[1] کے نام سے تیرے ساتھ ہزار اور دس ہزار ہوں گے تو ان لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں کا کیا انجام ہوگا جن میں اتنی قوت نہیں کہ روحانی غذا کی فکر میں اپنے پیٹ کی بھوک بھول جائیں۔ یا تجھے صرف تیرے ہزار دس ہزار بلند حوصلے اور قوی ارادے والے پیرو عزیز تھے اور باقی، کروڑ در کروڑ بلکہ ساحل کی ریت کی طرح بے شمار انسانی ہستیاں جو کمزور ہیں مگر تجھ سے محبت رکھتی ہیں، صرف اس مصرف کی ہیں کہ تیرے بلند حوصلے اور مضبوط ارادے والوں کا تختۂ مشق بنیں؟" اسقف کا عقیدہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ نے لوگوں کے پیٹ بھرنے کا ذمہ لیا ہوتا اور انھیں روحانی غذا پر پالنے کی فکر کرتے تو انھیں بہت کامیابی ہوتی اور انھوں نے نوع انسانی کی محبت کا دعویٰ ثابت کر دیا ہوتا۔ لیکن اگر انھیں یہ منظور نہیں تھا تو انھیں انسان کی رہبری کا وہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس کی طرف شیطان نے اشارہ کیا تھا: یعنی معجزہ، اس لیے کہ غذا کے برابر اگر انسان کی کوئی ضرورت ہے تو یہ کہ اُس کے ضمیر کا

[1] یعنی سچّی روحانیت اور عقیدت جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں اشارہ کیا تھا کہ "انسان روٹی کے سہارے نہیں جیتا۔"

کوئی محافظ بن جائے اور ضمیر کا محافظ وہ اسی کو بنائے گا جو معجزے کے ذریعے سے اس کے ذہن پر جادو کر دے۔ اسقف حضرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے "کیا تو بھول گیا تھا کہ انسان چین آرام کو، بلکہ موت کو بھی اس پیچ و تاب سے زیادہ قابلِ برداشت سمجھتا ہے جس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی ذمہ داری اسے مبتلا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی آزادی کی انسان کو بہت ہوس ہوتی ہے، لیکن یہ آزادی اس کی سب سے بڑی مصیبت بھی ہو جاتی ہے۔۔۔ دنیا میں تین قوتیں ہیں، صرف تین، جو ہمیشہ کے لیے ان کمزور باغیوں کے ضمیر کو قابو میں لا سکتی ہیں اور اسے فریفتہ کر کے ان لوگوں کی مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور یہ تین قوتیں ہیں معجزہ، مذہبی اسرار اور اقتدار۔ تو نے پہلے دوسرے اور تیسرے سب سے انکار کر دیا، اور اپنی ذات کو اس انکار کی ایک مثال بنا دیا۔۔۔ تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کرتے ہوئے انسان اپنی عقیدت کے استحکام کے لیے خدا کی ذات کو کافی سمجھے گا اور اسے معجزہ کی حاجت نہیں ہو گی۔ لیکن کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جہاں انسان نے معجزے سے بے نیازی ظاہر کی وہ خدا سے بھی پھر گیا، کیونکہ انسان کو حق کی اس قدر تلاش نہیں ہوتی جتنی معجزے کی۔۔۔ ہم نے تیری تحریک کی اصلاح کر کے اسے معجزے، مذہبی اسرار اور اقتدار پر قایم کر دیا اور ان لوگوں کو اس پر بہت خوشی ہوئی۔۔۔"

عام انسان کے اور اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو عام انسانی فطرت

کو سمجھتا ہی آئین عیسوی پر اس سے زیادہ بھاری اعتراضات نہیں کیے جا سکتے جو اسقف اعظم نے اپنے قیدی کو سنائے اور ان اعتراضات کو اگر ان دلیلوں میں شامل کر دیا جائے جن کی بنا پر اِوان نے کائنات اور زندگی کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا تو عقیدت اور مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہی۔ لیکن جیسا کہ اِوان خود تسلیم کرتا ہی "باغی ہو کر جینا مشکل ہی اور میں جینا چاہتا ہوں" اس سے کچھ پہلے وہ کہ چکا ہی: "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ ہوں، خواہ یہ میری منطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ میں کائنات کے نظام کو درست نہیں مانتا تو کیا حرج ہی، مجھے وہ کوپل تو عزیز ہی جو بہار میں پھوٹ نکلتی ہی۔ مجھے اس نیلے آسمان سے تو محبت ہی، میری سرشت میں وہ چیز تو ہی جو کبھی کبھی کسی سے خاص شخصی لگاؤ پیدا کر دیتی ہی اور معلوم نہیں ہوتا کیوں، میں انسان کی بعض کوششوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جن کے مطلب اور مقصد سے زمانہ ہوا مجھے کوئی عقیدت نہیں رہی ... اس میں عقل اور منطق کو دخل نہیں، اس محبت میں انسان کی کل ہستی شامل ہوتی ہی یہاں تک کہ اس کا معدہ اور آنتیں بھی، یہ محبت گویا نئی نئی حاصل کی ہوئی قوت کا جوش ہی"۔ اِوان کی بدقسمتی یہی ہی کہ وہ یہ نہیں طی کر پاتا کہ زندہ رہنے کی خواہش زیادہ ہونی چاہیے یا زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے کی اور چونکہ اس کی طبیعت غور و فکر کی طرف زیادہ مائل ہی، اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ وہ اپنی ذہنی "بغاوت" کے باوجود زندہ رہنا کمینہ پن قرار دیتا ہی اور مذہب و

اخلاق سے اس قدر بددل ہو جاتا ہے کہ عملی زندگی میں ان مخدوش اصولوں کو اپنا معیار بناتا ہے کہ "سب کچھ جائز ہے" اور "ہر شخص جس بات کی چاہے خواہش کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دوسرے کی موت کی بھی"۔ اس معیار کے مطابق خاندانی معاملات کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ "دو درندے ایک ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے" اور اپنے بڑے بھائی اور باپ کی جانی دشمنی رفع کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ سمر جیاکوف نے جو اس کے باپ کے قتل کی فکر میں تھا، اس کی بے پروائی اور بے تعلقی دیکھ کر اسے مشورہ دیا کہ چند روز کے لیے پاس کے ایک گاؤں چرماش نیا چلے جاؤ اس خیال سے کہ اگر اوان اپنے باپ کا قتل نہیں چاہتا ہے تو وہ یہ مشورہ منظور نہیں کرے گا، کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ تین چار روز کے اندر کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ اوان چرماش نیا کے بجائے ماسکو چلا گیا، وہاں جب اسے خبر ملی کہ اس کا باپ مار ڈالا گیا ہے اور اس کے بڑے بھائی پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے تو وہ فوراً واپس آیا۔ پہلے اسے یقین تھا کہ باپ کو اس کے بڑے بھائی نے مارا ہے، لیکن سمر جیاکوف سے تین چار مرتبہ گفتگو کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اصل مجرم وہ خود ہے، کیوں کہ اس کا ماسکو چلا جانا سمر جیاکوف کے لیے گویا قتل کی اجازت تھی۔ اوان نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ "دو درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے" لیکن جب اس کا اپنے اصول کے نتائج سے سامنا ہوا اور سمر جیاکوف نے اسے یقین دلا دیا کہ جرم میں بڑی حد تک آپ بھی

شریک ہیں تو اوان کو بہت سخت صدمہ ہوا اور اس صدمے نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ یہ ہوا انجام اس کی "بغاوت" کا۔

اوان کا چھوٹا بھائی الیوشا اپنے دل میں اسی قدر درد اور انسانی ہمدردی رکھتا ہی جتنی اوان، مگر اُس کی شخصیت بغاوت کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عملی زندگی میں شرکت کرنے سے انکار نہیں کرتی، اس وجہ سے کہ درد اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ہی الیوشا کی طبیعت میں محبت اور ایثار کا ایک قوی جذبہ ہی جو اُسے دوسروں کی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہی اور دوسروں کی خدمت کرنے سے اور ان کے دلوں میں محبت کے بیج بونے سے اُسے ایسی تسلّی اور تسکین حاصل ہوتی ہی، اپنے عقیدے کی سچائی کے اُسے ایسے کھُلے ثبوت ملتے رہتے ہیں کہ شک اور انکار کی گنجایش نہیں رہتی۔ دل کی وہ خالص بھلائی، پرائے دُکھ کی داستان سُن کر بے چین ہو جانے اور تڑپ اُٹھنے کی وہ پیاری صفت جس نے نواب میشکن کو سیانے سے دیوانہ بنا دیا تھا، اُس کی سرشت میں بھی موجود ہی، مگر ایک شدید مذہبیت کے بھیس میں، جو اسے ان اوصاف کے خطرناک پہلو سے محفوظ رکھتی ہی اور اس کی شخصیت کے لیے ایک مضبوط سہارا بن جاتی ہی۔ الیوشا عیسائی ہی، بہت سچّا عیسائی، جس کے نہ دل میں کمزوری ہی نہ عقیدے میں، وہ آئین عیسوی کا پیرو بھی ہی اور شیدائی بھی اور اسے خاص تقویت اس بات سے حاصل ہوتی ہی کہ اس کی عقل مشکل پسند

اور نکتہ چیں نہیں ہے۔ اس کی شخصیت نواب میشکن کی طرح جادو کرنا نہیں جانتی، لیکن نواب میشکن کے مقابلے میں بہت زیادہ محکم اور مضبوط ہے۔ الیوشا روسی قوم، روسی مذہب اور مذہبیت کی اعلیٰ ترین پیداوار ہے اور اسے اپنی سرزمین اور ماحول سے بہت گہرا اور سچا لگاؤ ہے، اس کی سیرت اور وہ اصول جن پر وہ تعمیر کی گئی ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دستہ لَف سکی بغاوت، انکار اور شک کے تمام مراحل طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔ اثبات خودی، غرور اور سرد مہری جو اثبات خودی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، انسانی شخصیت کو کامل نہیں بنا سکتی۔ شخصیت کو فروغ صرف ایثار کے دم سے ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس ایثار کے ساتھ دل میں قوت برداشت نہ ہو تو کوئی شخصیت اس درد کی تاب نہ لا سکے گی جو زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ہر نیک دل میں اٹھتا ہے اور وہ اس اختیار کے ہاتھوں شکست کھائے گی جو ہر انسان کو اپنے دکھ اور سکھ کی فکر کرنے کے لیے ازل سے ملا ہے۔ ایثار کی راہ پر بھی انسانی شخصیت صرف اپنے بل بوتے پر نہیں چل سکتی، اسے مدد اور تقویت کی حاجت رہتی ہے اور یہ اسے صرف مذہب سے اور مذہبی رہنماؤں کے ایثار کی مثالوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دستہ لَف سکی "برادران کرمازوف" کی داستان ختم نہ کر سکا اور اسے الیوشا کی شخصیت کی پوری شان دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں الیوشا نے ایسے انداز سے میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے، ایسے شوق اور عقیدت سے اپنا پیغام سنانا اور محبت اور ایثار کا بیج بونا شروع

کیا ہے کہ وہ ضرور ایک روز کامیاب ہوگا۔ الیوشا کی کامیابی اور اس کی شخصیت کا کامل بن جانا محض دین عیسوی کے برحق ہونے کا ثبوت نہیں بلکہ ہر مذہب، ہر جماعت کے لوگوں کے لیے ایک نمونہ، ایک روشن مثال ہے، کیونکہ ہر جگہ آسمان وہی ہے، زمین وہی، دل وہی اور درد وہی، اصل مشکل ہے خدمت کا حوصلہ پیدا کرنا، اس حوصلے میں محو ہو جانا، خودی کو بے خودی میں ڈھونڈھنا اور پانا۔

"ایک مضحک آدمی کا خواب" دستہ ئف سکی کا ایک مختصر اور عجیب سا افسانہ ہے جس میں اس کا خاص فلسفۂ حیات بہت اچھی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو خودکشی کرنے والا ہے خواب دیکھتا ہے کہ وہ ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے باشندے بالکل معصوم تھے اور ان کے دل ایسے پاک تھے کہ انھیں یہ شخص جس کا دنیا میں ہر وقت بڑی بے دردی سے مضحکہ اڑایا جاتا تھا کسی طرح مذاق اور تضحیک کا سزاوار نہیں معلوم ہوا۔ اپنا تعجب اور خوشی اور ان لوگوں کی انتہائی نیکی اور خوش اخلاقی ظاہر کرنے کی غرض سے اس شخص نے ان لوگوں کو اس دنیا کا سارا حال سنایا جس میں وہ پیدا ہوا تھا اور اپنے دل کی ساری شکایتیں بیان کر دیں۔ مگر اسے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ افسوس کرنے کے بجائے دنیا والوں پر رشک کرنے لگے، گناہوں کا مزا چکھنے کے لیے انھوں نے معصومیت کو خیرباد کہی، رفتہ رفتہ وہ تمام برائیاں جن کی انھیں خبر ملی تھی اختیار کر لیں، اپنی زندگی کو درہم برہم کر دیا اور اپنے آپ کو طرح طرح کی مصیبتوں

میں مبتلا کر دیا۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر مضحکات آدمی اپنی حرکت پر بہت نادم ہؤا اور گو اب یہ لوگ بھی اس پر ہنسنے اور اس کی تحقیر کرنے لگے تھے اس نے تہیہ کیا کہ میں اپنی غلطی کے کفارے میں اپنی زندگی ان لوگوں کی خدمت اور ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں صرف کروں گا۔

اس افسانے میں دستہ ئفت سکی نے جبر و اختیار کے مسئلے کو پھر چھیڑا ہی اور یہ دکھایا ہی کہ انسان کے دل میں تجربے اور علم کا پھل چکھنے کا کتنا شوق ہوتا ہی۔ اس کی ہدایت کے لیے یہ بتا دینا کافی نہیں ہی کہ اس کا نفع کن باتوں میں ہی اور نقصان کن باتوں میں اور اسے صحیح مسرت اور نجات حاصل کرنے کے لیے کون سا مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ انسان بُرے اعمال کے نتائج سے ڈرتا بھی ہو تو ان سے باز نہیں آتا، کیونکہ اسے زندگی کا مزہ اسی میں ملتا ہی کہ جو اس کا جی چاہے وہی کرے، ہر شخص کے سامنے نیکی اور سلامت روی کی ہزاروں مثالیں موجود ہوتی ہیں، ہر شخص یہ بھی دیکھتا ہی کہ خود رائی اور بے اعتدالی کی سزا کبھی نہ کبھی ضرور ملتی ہی، پھر بھی راہ راست پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور دنیا دوزخ کا نمونہ بنی رہتی ہی۔ نوعِ انسانی کے رہنماؤں کو صدمے پہنچے ہیں اور ان کی تعلیم بے اثر رہی ہی تو اسی وجہ سے کہ انسان اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہی، اپنے سے زیادہ سمجھ دار لوگوں کی نصیحت کا کیا ذکر ہی اسے خود اپنی عقل کی ہدایت پر عمل کرنا ناگوار ہوتا ہی جب تک اسے راست روی میں وہی مزہ نہ ملے جو اپنی مرضی پر چلنے میں

ملتا ہی عقل پرست لوگ مذہب کے غیر عقلی پہلو پر بہت اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن مذہب کی بنیاد جذبات پر رکھنے اور نیک جذبے کو صحیح رائے پر ترجیح دینے میں بڑی مصلحت ہی، کیونکہ اس سے رہبت روی میں ایک خاص کشش اور نیک زندگی میں ایک قوت پیدا ہو جاتی ہی

دستہ ئف سکی کے ناولوں پر جو مختصر اور نامکمل بحث یہاں کی گئی ہی اس سے بھی ظاہر ہو جاتا ہی کہ علم، اخلاق، فلسفے اور مذہب کے نقطۂ نظر سے وہ کس قدر بلند پایہ اور بیش بہا تصانیف ہیں۔ وہ محض قصّے کہانیاں نہیں ہیں، محض انسانی زندگی کی حقیقت نما تصویریں نہیں ہیں، ان کا شمار در اصل ان الہامی کتابوں میں ہونا چاہیے جنھوں نے ایک قوم کے جان بہ لب عقیدوں اور حوصلوں میں جان ڈال کر ویرانوں کو آباد کیا ہی اور ایک نئی دنیا تعمیر کی ہی۔ ایک انگریزی نقاد کا خیال ہی کہ" دستہ ئف سکی نے فن ناول نویسی کا خاتمہ کر دیا" اور یہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہی کہ دستہ ئف سکی نے اپنے ناولوں میں جو مقاصد پیش نظر رکھے ان سے بڑھ کر حوصلہ کرنا ناول نویس کے لیے ممکن نہیں۔ اس نے ایک فن کو جو ہمیشہ سے دلچسپی فراہم کرنے کے لیے وقف رہا تھا حق کا پیغام بر بنا دیا اور آرٹ اور مذہب کو اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دستہ ئف کے پلاٹ سب اُلجھے ہوئے ہیں، سیدھا سادہ قصّہ سنانے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔

اکثر جگہ اس نے معمولی باتوں کو جو ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہیں بہت بے جا طوالت دے دی ہے اور اس کی زبان میں ایک ہذیانی کیفیت ہے جو ان موقعوں پر نہایت ناگوار ہوتی ہے جہاں وہ موضوع کے لحاظ سے ضروری اور موزوں نہیں۔ خالص ادبی خوبیوں کا اس کے یہاں نام تک نہیں۔ اس کی کل تصانیف میں شاید ہی دو چار جملے ایسے ملیں جو پیچیدہ نہیں ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں اس نے عام طور سے فصاحت کا خون کیا ہے۔ تورگینیف کی طرح وہ کسی کی سیرت یا صورت اس طرح نہیں بیان کر سکتا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، اس نے گوگول کی طرح اپنے ناولوں اور ان کے اشخاص کو قومی رنگ میں نہیں رنگا ہے۔ لیکن دستہ ئفسکی کا ایک ناول پڑھنے کے بعد ان دونوں کے ادبی کمالات نظر سے گر جاتے ہیں، "وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے جسے ادنیٰ کمالات کا دماغ نہیں"۔ ادبی دنیا میں اگر کوئی اس کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے تو تالستائی، اور تالستائی کو بڑے سے بڑے ناول نویس استاد مانتے ہیں۔ لیکن تالستائی میں وہ سوز، وہ درد، وہ تڑپ نہیں ہے جو دستہ ئفسکی کے دل میں تھی، اس کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں وہ ہیجان نہیں اُٹھتا جو دستہ ئفسکی کے ناول پیدا کر دیتے ہیں، وہ طوفان برپا نہیں ہوتا جس سے پرانی دنیا بگڑتی اور نئی دنیا بنتی ہے۔

چھٹا باب

میخائل ییف گرافووچ سالتی کوف

میخائل ییف گرافووچ سالتی کوف (۱۸۲۶-۱۸۸۹) جو شچدرن کے نام سے بھی مشہور ہے تور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا پہلا استاد پاول نامی ایک غلام کسان تھا جسے فن مصوری میں خاصا ملکہ تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سالتی کوف تسارکو یے سیلو کے کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنا پہلا ناول "ایک جھمیلا" لکھا۔ سیاسی حاکموں کو اس ناول میں بہت سی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوئیں اور اس کا نوجوان مصنف جلاوطن کرکے شہر ویاتکا کو بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ سات سال تک رہا مگر واپسی پر اسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ ملازمت میں اس نے خاصی ترقی کی اور ایک صوبے کا گورنر بھی مقرر ہوا، لیکن اس کی طبیعت ملازمت کے لیے بالکل ناموزدں تھی اور ۱۸۶۸ میں وہ اس سے پیچھا چھڑا کر انشا پردازی میں مصروف

ہوگیا۔ پہلے وہ اخبار "ہم عصر" کا مددگار ایڈیٹر ہوا اور جب وہ بلند کرادیا گیا تو شاعر نکراسوف کے ساتھ اخبار "سرگزشتِ وطن" کی ادارت میں شریک ہوگیا۔ عمر کے آخری سالوں میں اسے ایک سخت بیماری ہوگئی جس نے اس کی زندگی تلخ کردی، مگر اس زمانے میں بھی اس نے اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ویاتکا سے واپس ہوتے ہی اُس نے افسانوں کا ایک مجموعہ شایع کیا جس کا عنوان "مفصلات کے مرقعے" تھا۔ ۱۸۷۶ میں اس کا ناول "حضرات گولوف لیف" چھپا جو اُس کی بہترین تصنیف مانی جاتی ہے۔ "ناشکنت والے" "بڑے دن کی کہانیاں" "ایک شہر کی تاریخ" "مفصلات سے خطوط" "ہمارے زمانے کی شکل" وغیرہ اور افسانے ہیں جو اسی دور میں لکھے گئے۔ ۱۸۸۱ کے بعد کی تصانیف "بڑے دن کی کہانیاں" اور "پوشے خونسک کی تاریخ" ہیں۔ یہ تاریخ اس کی آخری ادبی کارگزاری سالتی کوف کے پہلے ناول "جھمیلے" کو محض مشق سمجھنا چاہیے۔ اس وقت اسے زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس کے ذہنی قویٰ بھی پوری نشو ونما نہیں پا سکے تھے۔ جلا وطنی میں اسے روسی زندگی کے مشاہدے کا بہت موقعہ ملا، اس کی سیرت بھی اس عرصے میں پختہ ہوگئی اور جب اس نے پیٹربرگ واپس جاکر پھر قلم اُٹھایا تو وہ اپنا کمال دکھا سکا۔ روسی ناول نویسوں اور انشاپردازوں میں جس کسی کا بھی سرکاری ملازموں سے سابقہ رہا اس نے اپنے آپ کو اُن کی سیرت اور ذہنیت کا خاکہ اُتارنے پر

مجبور پایا اور سالتی کوف کے پہلے افسانوں کا موضوع انھیں لوگوں کی زندگی تھی - اس کی طبیعت طنز کی طرف مائل تھی لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے افسانے پڑھ کر ہنسیں اور پھر انھیں بھول جائیں - اس کے طنز اور تضحیک میں ایک زہر تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ زہر ان لوگوں اور اس ذہنیت کے لیے مہلک ثابت ہو جس کا اس کے افسانوں میں ذکر ہی اور سب کے دلوں میں نفرت کا وہی جذبہ پیدا ہو جائے جو اس کے اپنے دل میں تھا۔ "مفصلات کے مرقعے" جب شایع ہوئے تو اصلاحی تحریک بہت زور پر تھی، ان افسانوں نے اور بھی اُدھم مچادی اور اصلاح کے حامیوں کا ایک زبردست ہتھیار بن گئے - ۱۸۶۴ میں وہ انتظامی اصلاحیں جن کے لیے کوشش کی جارہی تھی ایک حد تک ریاست کی طرف سے منظور ہو گئیں، ۱۸۶۱ میں کسان آزاد کر دیئے گئے تھے اور ان دونوں اصلاحوں نے روسی زندگی کا رنگ بدل دیا - سالتی کوف کے افسانوں کا وہ سلسلہ جو ۱۸۶۱ سے شروع ہوا پُرانی زندگی کے باقی ماندہ آثار اور ان حالات کا نقشہ کھینچتا ہی جو نظام کے تغیرات پیدا کیے تھے "مفصلات کے مرقعوں" کی طرح ان میں بھی وہ منصف بن کر بیٹھتا ہی، طرح طرح کے لوگوں کو اپنے سامنے بلا کر ناظرین کو ان کے اعمال نامے سناتا ہی اور ان کو طنز اور تضحیک کے کوڑے لگاتا ہی - مختلف افسانوں میں مختلف جرموں کا پردہ چاک کیا جاتا ہی -

ایک شہر کی تاریخ میں روس کی اصلاحی کوششوں اور ان کے انجام کا مضحک پہلو دکھایا گیا ہے۔ پیٹربرگ کے دورانِ قیام میں مفصلات کے رہنے والے کا "روزنامچہ" وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے جو روس کی نئی معاشرت ایک قدامت پسند زمیندار کے دل میں پیدا کرتی ہے۔ یہ بزرگ ایک بار تھیٹر جاتے ہیں اور وہاں ایک خوبصورت ایکٹرس کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنی بےکسی پر افسوس آتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ قرب وجوار کی ہر عورت کی نسبت کہہ سکتے تھے کہ "وہ میری ملکیت ہے، میں اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں، کل یا ابھی فوراً، میں چاہوں تو اس کے بال کٹوا ڈالوں، چاہوں تو اپنے چرواہے آن ٹپ سے اس کا نکاح کرا دوں"۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حکومت کے دن ختم ہو گئے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں "افسوس! اب ہم کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چاہے وہ مرغی ہی کیوں نہ ہو"! ان آثارِ قدیمہ کے ساتھ ہی سالتی کوف نے ان لوگوں کے بھی مثالی نمونے لیے ہیں جو عہد تغیر کے خاص مظاہر تھے اور معاشرتی تبدیلیوں سے بہت جا اور بےجا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اس قسم کے لوگ زیادہ تر تاجر، ٹھیکے دار، کارخانے دار وغیرہ تھے اور سالتی کوف نے ان کی بےایمانیاں، ان کا کمینہ پن، ان کے ذلیل چال چلن اور ان کی بداعمالیاں سب صاف صاف دکھائی ہیں اور اس طرح کہ اُن کی حمایت یا صفائی میں کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ان لوگوں سے بھی زیادہ سالتی کوف کو اُن تھوڑی بہت تعلیم

تھوڑی بہت سمجھ والے آدمیوں سے عداوت ہی جو لطیف اور اعلیٰ حوصلوں کو اپنے حیوانی سکون اور ادنیٰ نفسانی لذتوں پر قربان کرتے ہیں، جو بے انتہا بزدل ہوتے ہیں، مگر ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کی مخالفت پر فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں جن سے ان کے سکون اور لطف اندوزی میں ذرا بھی خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہی اور جو اپنی مخالفت میں کسی کمینی حرکت یا جرم سے پرہیز نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے روس کی فضا بہت موزوں تھی اور روس کا کوئی خطہ اس آخور سے پاک نہیں تھا۔ سالتی کوف نے ان لوگوں کا خاکہ اُتارنے میں بڑا کمال دکھایا ہی اور اس کے طنز اور تضحیک کا زہر اور کسی کے لیے بھی ایسا قاتل نہیں معلوم ہوتا جتنا اس قسم کے لوگوں کے لیے۔

۱۸۶۷ کے بعد سالتی کوف نے جو افسانے لکھے ان کا موضوع اس کے اپنے طبقے کے لوگ اور ان میں بھی خاص طور سے وہ حضرات تھے جو جدتوں کے بہت زیادہ دلدادہ تھے اور جنھوں نے ۱۸۶۱ اور ۱۸۶۴ کی اصلاحوں کی بنا پر ایک بالکل ہی نئی دنیا بنا کر کھڑی کر دینے کے منصوبے باندھے تھے۔ ان تصانیف میں سالتی کوف کا مقصد طنز اور تضحیک نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہی کہ وہ لوگ اور وہ سوسائٹی جس کی تصویر اتاری جا رہی ہی دنیا میں صرف چند روز کی مہمان ہی اور وہ ان بیماریوں میں مبتلا ہو چکی ہی جو موت کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی سلسلے کا ایک ناول "حضرات گولوف لیف" سالتی کوف کی بہترین تصنیف ہی اور اس کا

زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا ضروری ہے۔

"حضرات گولوف لیف" ۱۸۶۱ سے پہلے کے زمینداروں کے ایک خاندان کا قصہ ہے۔ جس وقت داستان شروع ہوتی ہے، اس خاندان کے بزرگ ولادیمیر میخائلووچ گولوف لیف بوڑھے اور مضمحل ہو چکے ہیں، دن رات پلنگ پر پڑے رہتے ہیں اور صرف کبھی کبھی جب جوش آتا ہے تو دل کی کدورت نکالنے کے لیے اپنی بیوی کے کمرے تک لڑکھڑاتے ہوئے جاتے ہیں، اس کے دروازے سے ذرا سر نکال کر زور سے "چڑیل" یا "بھتنی" کہہ کر پکارتے ہیں اور پھر بھاگ کر اپنے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی بیوی ارینا پترو ونا ان دیوانی حرکتوں کی عادی ہے۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی اسے اپنے شوہر کی سیرت کا پتہ چل گیا تھا اور تب ہی سے وہ اپنے شوہر کو جائداد اور گھر گرستی کے معاملات سے بے دخل کر کے خود حاکم اور قادر کل بن بیٹھی تھی۔ ولادیمیر میخائلووچ کو جو اپاہج اور کمزور طبیعت کے آدمی تھے مطلق کوئی شکایت نہ ہوتی اگر ارینا پترو ونا نے صرف حکومت پر قناعت کی ہوتی۔ مگر ارینا پترو ونا نے ان کی شراب اور تمباکو بھی بند کر دی، اور کفایت شعاری کو اس حد تک پہنچا دیا کہ گھر میں کسی کو کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا وہ بھی ایسا کہ کوئی بھلا مانس اسے رغبت سے نہ کھا سکے۔ اس نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا۔ خاندانی جائداد جو پہلے بہت حقیر تھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور وہ چند ہزار کسانوں کی مالک بن گئی،

مگر یہ دولت بہت گراں ملی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ارینا پتروفنا نے محبت اور سلوک کرنا ایسا چھوڑا کہ اس کا نام تک بھول گئی۔ ولادیمیر میخائلووچ تو اسے چڑیل اور بھتنی کہتے ہی تھے، اس کے بچوں کو بھی اس سے کوئی محبت نہیں ہوئی۔ دنیا میں کوئی شخص نہیں تھا جس پر اُس نے کوئی احسان کیا ہو، چھوٹے بڑے لوگوں میں کسی سے اس کے مراسم نہیں تھے اور اس کے ہمسائے سب جانتے تھے کہ وہ اسی کی منتظر بیٹھی رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی مالی دشواریوں یا اور کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو وہ ان کی جائداد اونے پونے خرید لے۔ اگر ارینا پتروفنا کے دل کو انسانی ہمدردی یا محبت چھو بھی گئی ہوتی تو وہ محسوس کرتی کہ اس نے اپنے اصولوں پر چل کر کیا کھویا اور کیا پایا ہے، لیکن اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کا بڑا لڑکا ستیپان جس پر اُسے گالیاں دیتا رہا اور اگرچہ گھر میں سب جانتے تھے کہ وہ بہت نیک اور بامروت ہے، ارینا پتروفنا نے طے کر لیا کہ وہ باپ کی طرح دیوانہ اور احسان فراموش ہے اور خود بھی اس کے نام دھرنے لگی۔ جب وہ تعلیم ختم کرکے نوکری کی تلاش میں ماسکو اور پیٹربرگ گیا اور چار سال تک کوشش کرنے کے باوجود ناکامیاب رہا تو ارینا پتروفنا نے سمجھ لیا کہ یہ محض اس کی نالائقی ہے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی ناکامیابی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور پُرسانِ حال نہیں، کیوں کہ گولوف لیف خاندان کو یا تو کوئی جانتا نہیں تھا یا جو جانتا تھا وہ اس سے

نفرت کرتا تھا۔ ارینا پترو فنا کو بیٹے سے زیادہ اپنے روپے اور جائداد کی فکر تھی اور جائداد محفوظ رکھنے کے لیے اس نے حق اور محبت کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ جب ستپان نوکری کی تلاش میں نکلا تو اس نے اس کے لیے ماہوار جیب خرچ مقرر کر دیا، مگر اتنا کم کہ اس پر گزر کرنا محال تھا۔ اس کی ناکامیابی کی خبر سُن کر ارینا پترو فنا نے اسے ایک مکان جو اس نے ماسکو میں خریدا تھا دے دیا اور حکم دیا کہ اس کے کرایے پر گزر کرے۔ لیکن ستپان گھر پر اس طرح قید رہا تھا کہ آزاد ہو کر وہ اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکا اور آخر کار اسے اپنا قرضہ ادا کرنے کے لیے مکان بیچ دینا پڑا۔ اس کے بعد گھر واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو ارینا پترو فنا نے اسے رہنے کو ایک کمرہ تو دیدیا، مگر اس میں رات کو روشنی کرانا یا سردی کم کرنے کو آگ جلوانا ضروری نہیں سمجھا اور میز پر سے جو کچھ بچ رہتا وہی کھانے کو بھجا دیتی۔ اس تواضع کا انجام یہ ہوا کہ ستپان، جسے پہلے سے دق کی بیماری تھی، چند مہینے کے اندر مر گیا۔ اس کی موت بھی ارینا پترو فنا کو ایک خلافِ عقل حرکت معلوم ہوئی، گو اس نے اکثر اسے کھانستے سنا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس پہننے اوڑھنے کا سامان کافی نہیں۔ ارینا پترو فنا کی لڑکی آننا نے بھی اسے ستپان کی طرح "مایوس" کیا۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے اس کو انتظامی معاملات میں اپنا مددگار بنانا چاہا، لیکن اس سے نہ خاندانی رواج کے مطابق بھوکا رہا گیا نہ گھر کی

بے لطف اور بے رونق زندگی برداشت ہو سکی اور وہ ایک ادنیٰ فوجی افسر کے ساتھ بھاگ گئی۔ ارینا پتروفنا نے اسے "ماں کی دعائے خیر" سے محروم رکھا، مگر اپنی نیکی اور حق پرستی جتانے کے لیے اسے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان اور تھوڑی سی زمین دے دی۔ تین چار سال بعد وہ دو لڑکیاں لیوبا اور آننا، چھوڑ کر مر گئی۔ ارینا پتروفنا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "خدا کے کرم کی کوئی انتہا نہیں ۔۔۔۔ ایک لڑکی چھین لی اور دو دے دیں!" اور وہ شکایت کیوں نہ کرتی بچّوں کی پرورش سے انکار کرنے کی اجازت اُسے نہ اُس کے اصول دیتے تھے نہ نیک نامی کا خیال۔

ستپان اور آننا کے علاوہ ارینا پتروفنا کے دو لڑکے اور تھے، پورفیری اور پاول۔ پاول کی طبیعت پر جمود اس قدر حاوی تھا کہ اس کے لیے بات کرنا بھی ایک دقت طلب کام تھا اور اس کی عمر کھانے پینے اور خاموش بیٹھے رہنے میں گزرتی تھی۔ مگر پورفیری ہر اعتبار سے اپنی ماں کا بیٹا تھا۔ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ ارینا پتروفنا سے کچھ کم نہ تھا اور بچپن سے عجز و انکسار کا مجسمہ بن کر ماں کی خوشامد کرنا، دل کی بات چھپانا اور ہر وقت ماں کا حکم بجا لانے پر مستعد رہنا اس کا قاعدہ تھا۔ ارینا پتروفنا کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ پورفیری کی اطاعت گزاری، خوشامد اور محبت محض دکھاوا ہے، مگر پورفیری نے اسے کبھی کسی معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کے برخلاف پاول نے کبھی اسے کسی بات سے خوش نہیں کیا بلکہ ہر وقت یہ ظاہر

کرتا رہا کہ اسے ماں سے گہری دلی نفرت ہے۔ اس برتاؤ کے باوجود ارینا پتروفنا کو پاول سے زیادہ لگاؤ تھا، لیکن جب کبھی لڑکوں کو کچھ دینے کا موقع آتا تو وہ پورفیری کو اوروں سے زیادہ دینے پر مجبور ہو جاتی۔ چنانچہ آخر میں جب جائداد کا بٹوارا ہوا تب بھی پورفیری کو اپنے بھائی سے بہت بہتر حصہ ملا۔

پورفیری کو اس کے بھائی بہن بچپن سے "سودخوار" اور "جونک" کہتے چلے آتے تھے اور ارینا پتروفنا کو بڑھاپے میں جائداد تقسیم کرنے کے بعد معلوم ہو گیا کہ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے باتیں کرنے کا شوق ہے اور اس سے بھی زیادہ باتیں بنانے کا اور گو وہ ہر وقت شان دار اصطلاحیں استعمال کرتا ہے وہ اپنے فائدے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا اور اس کی ہوس اتنی شدید ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنا حق چھوڑنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے جب جائداد کے بٹوارے کے کئی سال بعد پاول بیمار پڑا تو ارینا پتروفنا اس کے یہاں گئی اور باوجودیکہ وہ اس کے منہ پر اسے اور پورفیری کو گالیاں دیتا تھا، وہ اس کی تیمارداری کرتی رہی اور اس کی جان کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن پاول مر گیا اور جس پھرتی سے پورفیری بھائی کے قریب مرگ ہونے کی خبر سن کر اس کے مکان پر پہنچا جس انداز سے اس نے بھائی کی موت پر ہر چیز کا جائزہ لیا اور اس گاڑی کی نسبت جس پر ارینا پتروفنا وہاں

آئی تھی اور جو اس کی ذاتی ملکیت تھی کئی بار اس سے اور دوسروں سے دریافت کیا کہ وہ درحقیقت کس کی ہے، اس اندیشے میں کہ وہ کہیں پاول کی نہ ہو اور اریناپتروفنا اس پر ناجائز قبضہ نہ کرلے، ان سب باتوں سے اریناپتروفنا کے دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ جب وہ پاول کی تجہیز و تکفین کے بعد اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پورفیری کی صورت پھر کبھی نہ دیکھوں گی۔

پورفیری دراصل "حضرات گولوف لیف" کا ہیرو ہے اور ناول کا مقصد زیادہ تر اسی کی سیرت کا ہر پہلو دکھانا ہے۔ پاول کی موت تک اس کی سیرت کا صرف ایک پہلو ظاہر ہوا تھا اور وہ اس کی زمانہ سازی، خوشامد، میٹھے اور پُرتکلف الفاظ میں اپنا مطلب چھپانے اور اپنی غرض پوری کرنے کے لیے ہر قسم کی بے عزتی برداشت کرنے کی صلاحیت تھی۔ جب پاول کے مرنے پر وہ اپنی بھانجیوں کی تھوڑی سی زمین اور بوسیدہ مکان کے علاوہ اریناپتروفنا کی کل جائداد کا مالک ہو گیا تو اس کی سیرت اپنے اصل رنگ میں نظر آئی۔ اس میں یہ صفت ضرور تھی، جسے وہ کسی موقع پر بیان کرنے سے چوکتا نہیں تھا، کہ وہ دوسروں کا حق مارنا ناجائز سمجھتا تھا اور اس کی ملکیت میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اخلاقاً یا قانوناً کسی دوسرے کا حق ثابت کی جاسکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نہایت ہی سنگ دل اور خود غرض تھا، اور اس نے اپنے لیے جو اصول مقرر کیے تھے وہ قانوناً نہیں تو اخلاقاً

جرم اور بے رحمی کا ایک فلسفہ تھا۔ اس کے بڑے لڑکے ولادیمیر نے پیٹربرگ میں ایک لڑکی سے نکاح کر لیا اور پورفیری نے جھٹ اس کا گزارا بند کر دیا، کیوں کہ ولادیمیر نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی کرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی۔ گزارا بند ہو جانے پر ولادیمیر بالکل محتاج ہو گیا اور مایوسی میں اس نے خودکشی کر لی۔ پورفیری کے چھوٹے لڑکے پیوتر نے سرکاری روپیہ جوے میں اُڑا دیا اور جب اس کی خیانت پکڑی گئی تو بھاگا ہوا باپ کے پاس مدد کے لیے آیا۔ اس کی مدد نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ یا تو خودکشی کر لیتا یا اگر اس کی ہمّت نہ کر سکتا تو قید کر دیا جاتا اور اس کی زندگی برباد ہو جاتی۔ لیکن پورفیری نے اس کی مدد کرنے سے قطعی انکار کر دیا، اسے قید کی سزا ہو گئی اور وہ چند مہینے بعد قیدیوں کے ایک ہسپتال میں مر گیا۔ پورفیری کی بھانجیاں لیوبا اور آننا جب بڑی ہوئیں اور انھوں نے بڑے حوصلے لے کر زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو انھیں مالی امداد کی سخت ضرورت پڑی، کیوں کہ ان کی اپنی جائداد بہت تھوڑی تھی۔ مگر پورفیری نے کبھی انھیں ایک کوڑی نہیں دی۔ انھیں ناٹک کے فن سے شوق تھا، اگر ان کی سرپرستی کی جاتی تو ممکن تھا وہ ماسکو یا پیٹربرگ کے کسی تھیٹر میں لے لی جاتیں، اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرتیں اور ان کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر نہ پڑتا لیکن مفلسی کی وجہ سے انھیں مفصلات کے تھیٹروں میں ایکٹ کرنا پڑا، جہاں وہ بہت بُری صحبت میں پڑ گئیں۔ ناکامیابی،

مایوسی اور صحبت کے اثر نے ان کے اخلاق کو بگاڑ دیا۔ انھوں نے شراب خواری اور عیاشی شروع کر دی اور آخر میں دونوں بہت ذلیل قسم کی رنڈیاں ہو گئیں۔ بڑی بہن لیو بانے جب دیکھا کہ ذلت کے باوجود بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تو اس نے زہر پی لیا، چھوٹی بہن آننا کا بھی یہی ارادہ تھا، مگر آخر وقت میں وہ ہمت ہار گئی اور اس نے چار و ناچار ماموں کے یہاں آکر پناہ لی۔

دو جوان بیٹوں اور ایک بھانجی کی موت اور مسلسل تنہائی کی زندگی پورفیری نے کیسے برداشت کی؟ اگر دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دل رکھتا تھا تو اس نے ایسی کنجوسی اور خود غرضی کو کیسے گوارا کیا جس سے سارا خاندان تباہ ہوا اور کوئی بھی ایسا نہ رہ گیا جو دولتیوں کی کفایت شعاری کا شکریہ ادا کرتا؟ یہ معمّہ پورفیری کی مذہبیت حل کرتی ہے۔ ارینا پتروفنا کو دولت کی ہوس نے کنجوس اور سنگ دل بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے آخر میں اُسے پشیمانی ہوئی اور اس کے دل کو صدمے پہنچے۔ پورفیری نے اپنے اصولوں کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی، اور یہ بنیاد بہت مستحکم ہوا کرتی ہے۔ اس کی مذہبیت دوسروں کو محض مکاری اور ریاکاری معلوم ہوتی تھی، اس کی پارسائی اور عبادت گزاری صرف ایک نفرت انگیز نمایش۔ دوسرے اس کی حاضر جوابی کو چالاکی اور عیاری سمجھتے تھے اور ان مسلمہ اخلاقی اصولوں کو جو پورفیری کی زبان پر ہر وقت رہتے تھے اخراجات اور ذمہ داریوں سے بچنے کی

ایک ترکیب اور بداعمالیوں کو چھپانے کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔
لیکن پورفیری کی کٹر مذہبیت اور وہ اصول جنھیں بیان کرنے میں وہ اس قدر مشاق تھا، اس کے ضمیر کو راضی اور اس کے دل کو پُرسکون رکھتے تھے اور وہ صدمے جو کسی دوسرے کی کمر توڑ دیتے اسے دراصل محسوس ہی نہیں ہوتے۔ عمر کے ساتھ پورفیری کی دنیا تنگ ہوتی گئی، اس میں تجربہ حاصل کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں رہی اور وہ ذہنی قویٰ جنھیں اس کی مسلسل تنہائی نے اظہار اور استعمال سے محروم رکھا تھا فضول بکواس کرنے کے بیہودہ مرض کی صورت میں اپنا زور دکھانے لگے۔ سوا ان چند گھنٹوں کے جو پورفیری گھر اور جائداد کا حساب کتاب دیکھنے میں صرف کرتا تھا اس کا سارا دن اور رات کا ایک خاصا حصّہ کھاتے اور بکواس کرتے گزرتا تھا اور یہ بکواس بھی ایسی لغو اور فضول ہوتی تھی کہ اسے سننے پر مجبور کرنا سخت سے سخت سزا تھی جو وہ کسی عزیز یا معتوب شخص یا دشمن کو دے سکتا تھا۔ لیکن وہی مذہبیت جس نے اس کے دل کو درد اور ہمدردی سے بیگانہ کر دیا تھا اس کی خودپسندی کو بھی اپنی گود میں پالتی رہی اور جس طرح پورفیری کو یقین تھا کہ اس نے دوسروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صحیح تھا ویسے ہی وہ اپنی زندگی اور طرزِ معاشرت سے بالکل مطمئن رہا اور اسے بے چین کرنے کو نہ کوئی حسرت پاس بھٹکی نہ اُمنگ۔
آخر میں جب پورفیری کی بھانجی آنّا ذلیل اور بیمار ہو کر اس کے

یہاں رہنے کو آئی اور ایک مرتبہ رات کے تیسرے پہر پورفیری نے اسے اپنی منتظمہ لیف پراکسیا کے ساتھ بیٹھے شراب پیتے اور گندے گیت گاتے پکڑا تو پورفیری کے معمول میں ایک تبدیلی ہوگئی اور وہ یہ کہ رات کو وہ آننا کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ شراب اور نشے کی خواہش اس بنیاد کے کمزور پڑنے کی پہلی نشانی تھی جس پر پورفیری نے اپنے فلسفۂ حیات کو تعمیر کیا تھا، اس قلعے کی دیوار کی پہلی دراڑ جس میں وہ اب تک محفوظ رہا تھا۔ آننا شراب پی کر بالکل مست ہوجاتی، نشے میں پورفیری کو خوب جی کھول کر گالیاں دیتی اور اپنی اپنی بہن اور اپنے ماموں زاد بھائیوں کی تباہی اور بربادی کا سارا الزام اسی کے سر لگاتی۔ پورفیری پہلے تو جواب دیتا اور اپنی صفائی کرتا رہا، لیکن نشے میں بحث کرنا اور دوسرے کو قایل کرنا دشوار ہوتا ہے، رفتہ رفتہ پورفیری کے دل میں کچھ شک سا پیدا ہوگیا اور آخرکار آننا کی شکایتوں اور گالیوں نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اسے اپنا پچھلا طرزِ عمل غلط معلوم ہونے لگا۔ یہ احساس گویا اس کے لیے موت کا پیغام تھا اور کچھ دنوں بعد وہ واقعی موت کی آرزو کرنے لگا۔ لیکن موت نہیں آئی اور دنیا سے نجات حاصل کرنے کے لیے پورفیری کو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینا پڑی۔

سالتی کوف نے "حضرات گولوف لیف" میں صرف حقیقت نگاری کا کمال اور نفسِ انسانی کا ہر پہلو جانچنے اور پہچاننے میں مہارت نہیں دکھائی بلکہ مذہبی جذبے کا ایک روگ بھی ظاہر کردیا جو "سچی" مذہبیت کا

سب سے بڑا دشمن ہے، جو صرف عقیدت کی جڑ نہیں کاٹ دیتا بلکہ ان لوگوں کے روحانی تنزل کا باعث ہوا ہے جو مذہبی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں۔ اگر پورفیری محض مکار یا ریاکار ہوتا، اگر اس کی دین داری محض نمائشی ہوتی اور وہ کہتا کچھ اور کرتا کچھ تو وہ عیاروں اور دغابازوں میں شمار ہوتا اور اس کی سیرت ہمارے لیے اتنی سبق آموز اور عبرت انگیز نہ ہوتی۔ لیکن پورفیری کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خود پسندی اور خود پرستی صرف تکبر یا مزاج کا ایک عیب نہیں بلکہ اس کی عقیدت اور گہری مذہبیت کا دوسرا رُخ ہے۔ اس کی سنگ دلی میں اس بھیانک ذہنی بیماری کی ایک جھلک بھی نہیں نظر آتی جو دوسروں کے درد اور تکلیف کو لطف اندوزی کا ذریعہ بنا دیتی ہے بلکہ یہ بھی اُس کے اصولوں اور عقیدوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور اس کی سیرت دیکھتے ہوئے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ سنگ دل نہ ہوتا تو اپنے عقیدے پر قایم نہ رہ سکتا۔ یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کی سیرت اور سرگزشت ہمارے لیے خاص طور سے سبق آموز ہو جاتی ہے۔ انسان کو صرف جھوٹی مذہبیت سے نہیں بچنا چاہیے بلکہ اس خلوص سے بھی جو درد اور محبت کے سامنے سر نہ جھکائے۔

سالتی کوف کی تصانیف کے تیسرے دور میں نہ اس کے پہلے افسانوں کا طنز اور تضحیک ہے، نہ "حضرات گولوف لیف" کی طرح

سوسائٹی اور انسانی ذہنیت پر تنقید۔ "کہانیوں" کے مجموعے میں زیادہ تر ۱۸۶۱ سے پہلے کی کسانوں کی زندگی دکھائی گئی ہے اور مصنف کا مقصد نکتہ چینی نہیں بلکہ ہمدردی کا جذبہ بیدار کرنا اور نظر میں وسعت پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے۔ "بڑے دن کی کہانیاں" مذہبیت سے لبریز ہیں اور یہ وہ مذہبیت ہے جو ضمیر کو روشن، دل کو محبت کے نشے سے چور کر دیتی ہے اور ایثار کی تیز آگ میں اس تمام آخور کو جلا کر خاک کر دیتی ہے جو انسان کی طبیعت میں اسی طرح خود بخود جمع ہوتا رہتا ہے جیسے اس کے جسم پر میل۔ سالتی کوف کے دل پر اس وقت وہی کیفیت گزر رہی تھی جس نے گوگول کو انشا پردازی سے توبہ کرائی تھی اور وہ بھی عمر بھر کی طنزیہ تنقید اور تضحیک کا اس صورت سے کفارہ ادا کر رہا تھا۔ یہ ارادہ سب سے زیادہ اس کے آخری ناول "پوشے خونسکا کی تاریخ" میں نمایاں ہے۔ یہ "تاریخ" اس نے دل سے تمام شکایتیں نکال کر اور نظر کو عیب جوئی کی عادت سے پاک کر کے لکھی تھی۔ اس میں پرانے طرز کی زندگی اور پرانا فلسفۂ حیات اسی طرح کے شاعرانہ رنگ روپ میں دکھائی دیتا ہے جیسے اک کوف کی "خاندانی داستان" میں۔ سالتی کوف گویا دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے کہا سنا معاف کرانا چاہتا تھا اور اپنے قلم اور تخیل سے اپنے خلوص کی شہادت دلوا رہا تھا۔ اس کا شمار روس کے سب سے زیادہ تلخ زبان اور سخت گیر نقادوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کی محبت اور ہمدردی کا رشتہ دوبارہ قایم کرنے کی اس کوشش کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

ساتواں باب

لِسکوف

نکولائی سیمیو نووِچ لِسکوف صوبہ اورال کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا سرکاری ملازم تھا، مگر ماں رئیس خاندان سے تھی اور لِسکوف کا بچپن عام زمینداروں کے بچوں کی طرح گزرا۔ وہ سولہ سال کا تھا کہ اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوگیا اور وہ اسکول چھوڑکر ملازمت کرنے پر مجبور ہوا۔ کچھ سال بعد وہ ایک انگریز مسٹر اسکاٹ کے کاروبار میں شریک ہوگیا، روس اور بیرونی ملکوں میں بہت سفر کرتا رہا اور اس طرح اسے روسی فطرت اور معاشرت کے مطالعے کا نہایت اچھا موقع ملا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے مضمون نگاری شروع کردی اور دو سال مشق کرکے اخبار نویسی کے ارادے سے پیٹر برگ گیا۔ اخباروں اور رسالوں نے انشا پرداز کی حیثیت سے اس کی خاصی قدر کی، مگر لِسکوف سیاسی فرقہ بندیوں سے بالکل الگ رہنا

چاہتا تھا اس لیے اخبار نویسی کے میدان میں اس کے قدم کبھی جم نہیں سکتے تھے۔ انتہا پسند فرقے کے اخباروں نے اسے ایک مضمون کی بنا پر بائی کاٹ کر دیا اور اس بائی کاٹ کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ اس کے مضامین کا ان اخباروں میں چھپنا بند ہو گیا بلکہ اس کی ادبی تصانیف بھی عام طور پر نقادوں کی توجہ سے محروم رہیں۔ لسکوف نے اخبار نویسی رفتہ رفتہ چھوڑ دی مگر اس کے ناولوں اور افسانوں کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۸۶۳ میں اس کا پہلا افسانہ شایع ہوا، اس کے دوسرے سال "لیس ومیش" اور ۱۸۷۱ میں "چھری کٹاری"۔ یہ دونوں ناول سیاسی تھے اور ان کی وجہ سے لسکوف انتہا پسند حلقوں میں بالکل مردود ہو گیا۔ "چھری کٹاری" کے بعد لسکوف دامن جھاڑ کر سیاسی مباحثوں سے علیحدہ ہو گیا۔ "گرجا والے" بہت مقبول ہوا، اور اس کے علاوہ لسکوف نے روسی کلیسا اور پادریوں کے رہن سہن پر جو افسانے لکھے وہ بھی بہت پسند کیے گئے۔ کلیسائی مذہب کی طرف داری کرنے سے اس نے دربار کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں کو خوش کر دیا، اور خود ملکہ کے اثر سے اسے سرکاری مذہب کی حمایت کرنے کے معاوضے میں ایک عہدہ مل گیا جس میں تنخواہ وصول کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ مگر ملکہ کی یہ سرپرستی ایک غلط فہمی پر مبنی تھی اور جب لسکوف نے کلیسا والوں کا مذاق اُڑانا شروع کیا اور اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک نہیں رہا تو وہ عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ آخر عمر میں لسکوف پر

تالستائی کی شخصیت کا بہت اثر ہو گیا۔ گرو چیلے کے خیالات اور ذہنیت میں بہت فرق تھا مگر لسکوف اپنے خاص طرز پر تالستائی کی اخلاقی تعلیم کا پرچار کرتا رہا۔

مصنفوں کو مشہور اور بدنام کرانے میں نقادوں کی رائے کو بہت دخل ہوتا ہے اور روس میں عام رائے بالکل نقادوں کے اشارے پر چلتی تھی۔ لیکن نقادوں کی عداوت کے باوجود لسکوف کی تصانیف مقبول اور ہردلعزیز رہیں اور سیاسی حادثوں اور خیالات کے تغیر سے اس ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ کامیابی لسکوف کے ناولوں کی بہترین تعریف ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم کیسی خوش مذاق اور قدردان ہے جو اپنے ذہنی رہنماؤں کی مخالفت پر بھی لسکوف کی قدر کرتی رہی۔ اس معاملے میں عام ناظرین کی رائے نقادوں سے زیادہ صحیح تھی۔ روسی نقاد لسکوف کو قدامت پرست اور روشن خیالی اور ذہنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے، مگر وہ غلطی پر تھے۔ لسکوف میں صرف ایک ضد تھی جو اسے اچھی چیز کا بُرا پہلو بھی دکھانے پر مجبور کرتی تھی اور اگر اس نے انقلابیوں کا اکثر مذاق اُڑایا تو قدامت پسندوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ لیکن روسی نقادوں کو ایسی حقیقت نگاری جس میں انسان اور انسانی زندگی کے اعلیٰ حوصلے اور گہرے روحانی مسائل نظرانداز کیے گئے ہوں یا جس سے کوئی اخلاقی یا سیاسی عقیدے اخذ نہ کیے جا سکیں ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتی تھی، اس لیے کہ ناول اور افسانے

ہی ایک ذریعہ تھے جس سے قوم میں اخلاقی اور سیاسی عقیدے وغیرہ پھیلائے جا سکتے تھے، اور جو مصنف ناول محض قصہ سنانے کے لیے لکھتا اور تعلیم یا اصلاح اس کی غرض نہ ہوتی وہ انھیں اوچھا اور پست ہمت، اپنی قوم کے مستقبل سے بے پروا اور اس کی کامیابی کے رستے میں ایک رکاوٹ معلوم ہوتا تھا۔ ایک حد تک تو ان کا ناول نویسوں سے رہبری اور اصلاح کی توقع کرنا بجا تھا۔ روسی حقیقت نگاری اگر عام انگریزی یا فرانسیسی طرز کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند اور قابل قدر ہے تو اسی وجہ سے کہ اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور وہ محض سطحی زندگی کی عکاسی نہیں ہے۔ لسکوف پر روسی ناول کے معیار میں فرق ڈالنے کا الزام ضرور آتا ہے، لیکن اس میں خوبیاں بھی اتنی ہیں کہ ہم یہ خطا معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

لسکوف کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان ہے۔ اس نے وہ شستگی اور فصاحت جو تورگینف کی تصانیف میں عروج پر پہنچی اور جس کا دستہ لغت سکی کے سوا ہر روسی انشا پرداز نے حوصلہ کیا ہا لکل ترک کر دی اور اس کے ناولوں میں انوکھے اور شاذ محاورے، عجیب عجیب اصطلاحیں، ایہام اور مستعمل مگر غلط الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ خاص انداز بیان اس کی عبارت کو کسی قدر مشکل ضرور کر دیتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کی زبان بہت رنگین اور دلچسپ ہو جاتی ہے اور اس کے قصے پڑھنے میں ایک خاص مزہ آتا ہے، کیونکہ قصے اور

اندازِ بیان میں ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے۔ لسکوف کی دوسری صفت اس کی داستان کی شوخی اور رنگا رنگی ہے۔ اس کی تصانیف کی فضا اس مایوسی اور حزن سے پاک ہے جو روسی انشا پردازوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے، وہ ناول اور افسانے قصہ سنانے کی غرض سے لکھتا ہے اور اس کے قصے ایک اہمیت اور دلچسپی رکھتے ہیں جس کا فلسفے یا اخلاقی اور سماجی مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ یوں اس کی نظر ہمیشہ قصے پر جمی رہتی ہے، اس نے اپنے ناولوں کی آرائش سیاسی اور اخلاقی نظریوں سے نہیں کی ہے بلکہ ان حادثوں اور واقعات سے جن سے اس کا ہر ناول لبالب بھرا ہوتا ہے۔ یہ واقعات اور حادثے اکثر مضحک ہوتے ہیں اور لسکوف اپنے کیرکٹروں کا مذاق اُڑانے سے کبھی نہیں چوکتا، خواہ وہ دل میں ان کی کتنی ہی قدر کرتا ہو اور اپنے ناظرین سے ان کا ادب کرانا چاہتا ہو۔ نقادوں نے یہ انداز دیکھ کر ہمیشہ کے لیے طے کر لیا کہ وہ محض ایک مسخرہ ہے، لیکن دل لگی بازی اور سچے احترام کی آمیزش لسکوف کے فلسفۂ حیات کی خصوصیت تھی اور اس آمیزش کا طریقہ ایسا ہے کہ دونوں کیفیتوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کی دل لگیوں کے باوجود اس کے ہیرو، اس کی اور اس کے ناظرین کی نظروں میں ہیرو ہی رہتے ہیں۔ اگر لسکوف کے فلسفۂ حیات پر ذرا غور کیا جائے تو ہمیں اس پر بھی تعجب نہ ہوگا کہ اس نے ان متضاد چیزوں کو یک جا کرنے کی کوشش کیوں کی۔ وہ مذہب اور اخلاق

میں کسی قسم کی تنگی اور حد بندی کا قایل نہیں تھا، کہ اس کے نزدیک آزاد فضا میں نشو و نما پانا انسان کی سب سے اہم روحانی ضرورت تھی اور نیکی اس کے خیال میں وہی تھی جو نیک عمل اور انسانی ہمدردی میں ظاہر ہو۔ جیسے وہ سچّے اور اچھے عقیدوں کو رسمی مذہب کا نام دے کر ان کی تاثیر گھٹانے کے خلاف تھا ویسے ہی اسے یہ ناگوار تھا کہ ایسی ہستیاں جو ادب اور احترام کی مستحق ہوں مورتیں بنا کر کھڑی کر دی جائیں اور انسان کی نظر کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ انھیں ہر پہلو سے دیکھے۔

شروع کے سیاسی ناولوں میں لسکوف اپنے اصل رنگ میں نظر نہیں آتا اور اس دور کے افسانوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات مکمل اور پختہ نہیں ہوا تھا۔ اس زندہ دلی، وسعت نظر اور رواداری کا بھی، جو اس کی خاص صفتیں تھیں، اس کی پہلی تصانیف میں پتا نہیں چلتا اور اس کے کیرکٹر زیادہ تر انسانی سیرت کے برے نمونے ہیں۔ لسکوف کی طبیعت کے جوہر پہلی مرتبہ اس کے ناول "گرجا والوں" میں چمکے اور اسی ناول نے اس کی شہرت کی بنیاد ڈالی۔ اس ناول میں لسکوف نے ایک فرضی شہر ستارگورود کے گرجا کے تین پادریوں کی داستان سنائی ہے اور ان تینوں میں سے ہر ایک کی سیرت اور صورت کا نقشہ کھینچنے میں کمال دکھایا ہے۔ سویلی توبے روزوف، گرجا کے صدر پادری، نہایت نیک اور پارسا آدمی ہیں اور ان کا

شماران سیرتوں میں ہونا چاہیے جو شائستہ زندگی کا مایۂ ناز ہیں۔ تو بے روزوف میں مذہبیت کا وہ سچا جذبہ ہے جو انسان کو ہر وقت اپنے اعمال اور نفس کی اصلاح میں معروف رکھتا ہے اور جو ضمیر کو اتنا زود حس کردیتا ہے کہ دوسروں کی نکتہ چینی کے لیے نہ موقع ملتا ہے نہ خواہش رہتی ہے۔ زخاریا یے نے فاکتوَف، گرجا کے دوسرے پادری، اس مسکینیت کی ایک مثال ہیں جو غربت اور دینی خدمات میں محو رہنے سے اکثر مذہبی لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے نفس کشی اس لیے کی ہے کہ مجبور تھے، دنیاوی حوصلے ترک کئے اس سبب سے کہ انھیں پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان کا عجز و انکسار ان کے عقیدوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ افلاس اور طبیعت کی کمزوری کا۔ اَخِلاّجیس نیتاسین، گرجا کا ڈیکن، صورت، سیرت اور عادتوں کے اعتبار سے اپنے دونوں افسروں سے بالکل جدا ہے۔ اس کا جسم ایک دیو کا ہے، طبیعت بچوں کی سی اور شوق وہی جو تندرست نوجوانوں کو ہوا کرتے ہیں، گو اس وقت جب داستان شروع ہوتی ہے اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ مذہبیت اس کو چھو بھی نہیں گئی ہے اور اپنی کلیسائی خدمات انجام دینے کے بعد وہ سارا دن کھیل کود، ورزش اور گپ شپ میں صرف کرتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ان سب صفتوں کے باوجود بے دینی اور آزاد خیالی کی مخالفت بھی اسی کے ذمے پڑتی ہے اور جن جن طریقوں سے وہ یہ فرض ادا کرتا ہے ان کا بیان ناول کا سب سے

زیادہ دل چسپ حصہ ہی۔ مثلاً وہ ایک مدرس کے یہاں سے جو علم تشریح کی معلومات کا ذخیرہ بڑھانے پر تُلا ہی، مردوں کی ہڈّیاں چُرا لاتا ہی اور چُپکے سے دفن کر کے پھر تمام شہر میں اپنے کارنامے کی خبر سناتا پھرتا ہی۔ شہر کی میونسپلٹی والوں کے لیے یہ ایک مستقل تماشا سا ہوگیا ہی کہ وہ ایک طرف تو علم کو فروغ دینے کی غرض سے مدرس کو لاوارث مردوں کی لاشیں دیتے ہیں اور دوسری طرف دین کی حفاظت کے لیے ڈیکن اخلا کو انھیں چُرا کر دفن کر دینے کا انعام دیتے ہیں۔ اخلا کو یہ نہیں معلوم ہی کہ مردوں کی ہڈیاں چُرا کر دفن کر دینے سے دین عیسوی کو کیا فائدہ پہنچتا ہی اور وہ اس مسئلے پر کبھی غور بھی نہیں کرتا، اسے فقط اپنا فرض ادا کرنے سے مطلب ہی۔ پھر ایک بار دریا میں نہاتے وقت وہ کسی جان پہچان کے ڈاکٹر کو ایک ہڈی دکھاتا ہی اور ڈاکٹر اسے بتاتا ہی کہ یہ انسان کے ڈھانچے کی ایک ہڈی ہی جسے آسٹراگیلُس کہتے ہیں۔ اخلا کو یقین تھا کہ یہ ہڈی "چھوٹی سی دم" ہی آسٹراگیلس کا لفظ بھی کچھ ایسا تھا جسے اس کے خیال میں کسی شریف اور دین دار عیسائی کو ہرگز اپنی زبان پر نہ لانا چاہیے۔ اس لیے اخلا نے ڈاکٹر کو شرک اور توہینِ مذہب کی سزا دینا ضروری سمجھا اور اس کی گردن دبا کر اسے دریا میں کئی ڈُبکیاں دیں۔ ڈاکٹر بیچارے نے لاکھ ثابت کرنا چاہا کہ آسٹراگیلُس کے لفظ سے دین عیسوی یا کلیسا کے عہدے داروں کی کوئی توہین مقصود نہیں، لیکن اخلا اسے ڈُبکیاں

دیتا رہا اور کسی طرح سے اسے معاف کرنے پر راضی نہ ہؤا۔ اخلا کے بعد "گرجا والوں" کا سب سے دل چسپ کیرکٹر وہی مدرس ہی جس کے یہاں سے اخلاّ ہڈیاں چُرا یا کرتا ہی۔ مدرس "منکر" ہی اور سائنس کا شیدائی اور چونکہ اس کے ارد گرد جلنے لوگ ہیں وہ سب بہت مذہبی ہیں اور سائنس دانوں کا احترام نہیں کرتے، اسے اپنے ماحول سے سخت شکایت ہی۔ اس کی ماں ہر بات میں اس کی مخالفت کرتی ہی، جن مردوں کی لاشیں وہ لاتا ہی ان کی مغفرت کے لیے وہ گرجا میں دعائیں مانگتی ہی اور جب مدرس کوئی بات کرتا ہی جس کو وہ نہیں سمجھتی تو اپنی جہالت پر شرمندہ ہونے کی بجائے مدرس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی ہی[1]۔

ماں کے بعد مدرس کو سب سے زیادہ شکایت اخلا سے ہی، جسے وہ علم اور روشن خیالی کا دشمن بلکہ اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ پولیس کا جاسوس سمجھتا ہی اور گرفتار ہونے اور سزا پانے کا خوف اس پر ایسا طاری ہی کہ اخلاّ کے علاوہ بھی وہ ہر شخص کو جو اس کے علمی ذوق کا قایل نہیں جاسوس فرض کر لیتا ہی۔ شہر میں مدرس کو تسلّی دینے والی صرف ایک خاتون ہیں جو اس وقت سے آزاد خیالی کی فدائی بن گئیں جب ان کے باپ نے زنا کی سزا میں ان کو دُرّے لگائے تھے اور پولیس والوں نے بجائے باپ کو جیل خانے میں بند کرنے کے صاف صاف کہہ دیا کہ تم ایسی ہی سزا کی مستحق ہو۔

---

[1] نحوست دور کرنے کا عمل جو روسی عوام میں رائج تھا۔

اخفلا دین کی حمایت اور مدرس جاسوسوں سے بچنے کے لیے جو ترکیبیں کرتا ہی وہ بہت دل چسپ ہیں، لیکن "گرجا والوں" کی داستان میں پھر بھی واقعات اور حادثوں کی وہ افراط نہیں جو لسکوف کی تصانیف میں عام طور سے پائی جاتی ہی۔ "مسحور سیاح" (۱۸۷۴) کا قصّہ ایک شخص کی سرگزشت ہی جو اپنے بھتیجوں کی انگریز استانی کے ناگوار التفات سے جان بچانے کے لیے روس چھوڑ کر بھاگ جاتا ہی اور پولیس والے اسے "منکر" اور انقلابی سمجھ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک کی پولیس کو بھی اس کی طرف سے بدظن کر دیتے ہیں۔ اسی سال کی دوسری تصنیف "مقفل فرشتہ" جس میں ایک مقدس مورت کی چوریوں کا قصّہ ہی، لسکوف کے خاص طرز کا ایک بہت اچھا نمونہ ہی۔ "دنیا کے سرے پر" ۱۸۷۶ کا ایک افسانہ ہی جس میں لسکوف نے جو اس وقت تک سرکاری مذہب کا پیرو مانا جاتا تھا، مذہب عیسوی کے ایک مبلغ کی سرگزشت سنا کر اپنی آزاد خیالی پہلی بار ظاہر کی۔ اسی زمانے میں لسکوف پر ٹالسٹائی کی تعلیم کا اثر پڑنے لگا، مگر اس پر بھی اس نے اپنا نرالا رنگ نہیں بدلا اور "کھبا لوہار" (۱۸۸۲) "بڑے دن کی کہانیاں" (۱۸۸۶) "ڈکیتی" (۱۸۸۷) اور "برمحل قصّے" (۱۸۸۷) ظرافت اور حیرت انگیز اور دل چسپ سانحوں سے لبریز ہیں۔ ان افسانوں میں "کھبا لوہار" خاص طور سے مقبول ہوا۔ اس میں زار روس کے سفر یورپ کا ایک قصّہ ہی۔ زار جس ملک میں جاتا ہی وہاں کے لوگ

اسے اپنی صنعت و حرفت کے کرشمے دکھاتے ہیں۔ لیکن زار سب سے زیادہ انگریزی صنعت اور کاری گری سے مرعوب ہوتا ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ وہ خرید کر ساتھ بھی لے جاتا ہے۔ یہ ایک فولاد کی مکھی ہے، اس قدر چھوٹی کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتی۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسی چھوٹی مکھی کے پیٹ میں ایک کل ہے اور جب اس میں کوک بھری جاتی ہے تو وہ ناچنے لگتی ہے۔ زار کے ہمراہ اتفاق سے پلاتوف، ایک سن رسیدہ، تجربہ کار اور قوم پرست دریائے ڈون کے کنارے پر رہنے والا کوسک بھی ہے، جس کا ہٹیلاپن روس کی آبرو بچا لیتا ہے اور زار کو اپنی رعایا سے مایوس اور یورپ کی قوموں کا گرویدہ نہیں ہونے دیتا۔ زار جب مکھی دیکھتا ہے اور انگریزوں کی کاری گری کی تعریف میں الفاظ کا دریا بہاتا ہے تو پلاتوف اس سے وعدہ کرتا ہے کہ میں روسی کاری گروں سے اس کے جواب میں کوئی اعجوبہ تیار کراؤں گا۔ روس واپس آنے کے کئی سال بعد آخرکار جب زار کا انتقال ہوتا ہے اور اس کا بیٹا تخت پر بیٹھتا ہے تو پلاتوف کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ فولاد کی مکھی کو شہر تولا کے مشہور لوہاروں کے پاس لے جاتا ہے اور لوہار اپنے کام کی نزاکت اور باریکی جتانے کے لیے مکھی کے ہر پیر میں جوتی پہنا دیتے ہیں اور جوتوں کے تلوں پر اپنے نام کھود دیتے ہیں۔ زار ان کے کام سے بہت مرعوب ہوتا ہے اور ان میں سے ایک کو جو کھبا ہے روسی صنعت کے اس کارنامے کو دکھانے

کے لیے انگلستان بھیجتا ہی۔ انگریز اس کی بہت قدر کرتے ہیں اور ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کچھ دن مہمان رہنے کے بعد روس واپس ہوتا ہی۔ راستے میں جہاز پر وہ ایک ملّاح سے شراب پینے کی شرط لگاتا ہی اور جب جہاز بندرگاہ پر پہنچتا ہی تو لوگ اسے مست پاتے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہی اور کہاں جانا چاہتا ہی۔ دربار میں بھی سب اس کا قصّہ بھول گئے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کھبا لوہار جو شراب خواری کی کثرت اور سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تھا محتاجوں کے ہسپتال میں مرجاتا ہی اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ روسی اور عام یورپی ذہنیت کے مقابلے سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان کے علاوہ داستان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کے مکالمے بہت پُرلطف ہیں اور زبان انوکھی مگر بہت دل چسپ ہی۔

لِسکوف نے اپنے آخری ناولوں اور افسانوں سے تالستائی کی طرح اخلاقی تعلیم دینی چاہی اور یہ دکھایا کہ اصل چیز مذہبی رسوم کی پابندی نہیں بلکہ ایسا عمل ہی جس سے خلوص اور دل کی نیکی ظاہر ہو۔ "پہاڑ" "الیس کلوں کا رہزن" اور "حسین آزا" جو اس دور کے بہترین افسانے ہیں کسی قدر شہوت انگیز ضرور ہیں لیکن یہ عیب ان کی اخلاقی اہمیت میں فرق نہیں ڈالتا، بلکہ حقیقت کو اور زیادہ واضح اور روشن کر دیتا ہی۔ ان افسانوں کے بعد بھی لسکوف نے ایک ناول

"خرگوشوں کی پرورش گاہ" لکھا جو ابھی کچھ سال ہوئے پہلی بار شایع ہوا۔ یہ ناول اس کے شروع کے طرز پر ہے اور اس کا ہیرو پے رے گود ایک کمزور دماغ کا شخص ہے جسے ایک با اثر رشتہ دار کی مہربانی سے پولیس میں ایک بڑی ذمّہ داری کا عہدہ مل گیا ہے۔ پے رے گود اپنی مشکل خدمات خاصی کامیابی کے ساتھ انجام دیتا رہتا ہے، جب تک کہ اسے باغی منکر گرفتار کرنے کا خبط نہیں ہو جاتا۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کی کوشش میں وہ ایک ایسی زک پاتا ہے کہ اس کا دماغ بالکل خراب ہو جاتا ہے اور اس کی عمر کا بقیہ حصّہ پاگل خانے میں گزرتا ہے۔ لسکوف کے اندازِ بیان نے اس داستان کو جو بظاہر محض مزاحیہ ہے قوم اور قومی ذہنیت کی تنقید اور اس کی گمراہی عیاں کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ بصیرت افروز ظرافت لسکوف کا حصّہ تھی۔

آٹھواں باب

تالستائی

روسی ادب کے دینی اور اخلاقی رجحانات کا اکثر ذکر آچکا ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ گوگول کا جذبۂ دینی اظہار سے محروم رہ کر کس طرح بگڑ گیا اور دستہ ئفسکی کے دل میں اسی جذبۂ دینی نے کس طرح کامل انسان کا عکس ناول میں اُتار لینے کی آرزو پیدا کی۔ تالستائی کی شخصیت اور تصانیف میں روسی ادب کا یہ رجحان فن کی حد سے نکل کر سیاست، اخلاق اور مذہب کے میدانوں میں پہنچ گیا، اس نے ایک زمانے کی آسودگی، اطمینان اور خودپسندی کی ایسی قلعی کھولی کہ ساری دنیا میں کھلبلی مچ گئی، ایک معیار کو جسے یورپی تہذیب نے ردی سمجھ کر کباڑ خانے میں ڈال دیا تھا دوبارہ عقیدت کی عزت بخشی اور ناول نویس کی حقیقت بینی مصلح اور رہبر ہونے کا حوصلہ کرنے لگی۔

تالستائی کی ادبی زندگی تین حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، جن میں سے

پہلا، جو خالص ناول نویسی کا دور ہی، ۱۸۷۶ کے لگ بھگ "آنا کارنین" کی تصنیف کے ساتھ ختم ہوتا ہی، دوسرا حصّہ اخلاقی اور دینی جدوجہد کا زمانہ ہی، جب ناول نویسی تالستائی کی کارگزاری کا بس ایک پہلو تھی اور اس کا معیار اس کے دینی اور اخلاقی عقیدوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ دور ۱۹۰۰ میں ختم ہوا اور اس کے بعد پھر تالستائی کی حیثیت ایک اخلاقی معلّم کی سی ہو گئی، جو مختلف مسائل پر براہِ راست اپنے خیالات ظاہر کرتا ہی اور جسے اس کی خواہش یا ضرورت نہیں کہ انھیں ادبی پیرائے میں بیان کرے۔ یہ تینوں دور تالستائی کی شخصیت کی نشو و نما کی تین منزلیں ہیں، ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہی جو صبح کا دوپہر سے اور دوپہر کا شام سے۔ انھیں ہم الگ تو کر سکتے ہیں، جیسے ہم دن کو پہروں میں تقسیم کرتے ہیں، لیکن اس کا خیال رکھ کر کہ آفتاب وہی تھا، اس کا مقام بدلتا رہا۔

تالستائی کے روزنامچے اور اس کی ابتدائی زندگی کے واقعات سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہی کہ اس کی طبیعت بہت حساس تھی، اس کے جذبات میں بڑی شدت تھی، اور جیسا کہ ایسے مزاج کے لوگوں میں اکثر دیکھا جاتا ہی، اس میں جھینپ اور خود پسندی بہت تھی اور اس کی طبیعت پلٹے بھی بہت کھایا کرتی تھی۔ تقدیر نے اسے ایک آبرودار، دولت مند خاندان میں پیدا کر کے بہت سی مشکلیں آسان کر دی تھیں، لیکن ایک تو اسے صورت بڑی ہی خراب ملی تھی، دوسرے

اس کی خواہشیں اس کی استعداد سے ہمیشہ دس قدم آگے رہتی تھیں، اس لیے اس میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی، طبیعت کو یے جیسے ایک روگ کی طرح لگ گئی اور اس کا لڑکپن اور شروع جوانی کا زمانہ اپنے عیب گنتے، غلطیاں کرتے اور پھر اپنے دل سے ان کا اعتراف کر کے اپنے لیے سزائیں تجویز کرتے گزرا تعلیم سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوا، نہ اپنی طبیعت کی افتاد کا پتہ چلا نہ اپنے اندر کسی صلاحیت کا احساس ہوا اور ناول نویسی کی پہلی کوششوں میں اسے کامیابی نہ ہوتی تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہ کامیابی اس کے لیے بڑا سہارا ہو گئی اور اس کے اندر نمو کی ان قوتوں کو جواب تک گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھیں صرف ہیں آنے کا موقع مل گیا۔ لیکن انشا پردازی تالستائی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھی، اس کے دل میں بہت سے حوصلے تھے جنھیں نکلنے کو اس طرح رستہ ملا، مگر یہ رستہ تنگ تھا اور حوصلوں میں وسعت اور جوش، اور وہ انشا پردازی کی حد بندیوں کو توڑ کر ادھر اُدھر بہ نکلے۔ پھر ان بندوں کو توڑ دینا بھی سیلاب کے لیے کافی نہ رہا، تالستائی کی شخصیت دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دینے کی آرزو میں تڑپنے لگی اور جب تک جسم میں جان تھی دل میں یہ تڑپ رہی۔

ایسی حساس اور جوشیلی طبیعت جیسی کہ تالستائی کی تھی تربیت اور تعلیم کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہے اور تالستائی کو صحیح تربیت اور تعلیم دینے والے ملے بھی نہیں۔ ۱۸۳۰ میں، جب وہ دو برس کا تھا، اس کی

ماں کا انتقال ہو گیا اور اسی کے چند سال بعد اس کے باپ کا۔ جن رشتے داروں نے اس کی اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش کی وہ اس سے محبت تو کرتے تھے، مگر اس کی طبیعت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے تالستائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا سکتے تھے۔ تعلیم میں تالستائی کا کبھی جی نہیں لگا، شاید اس لیے کہ تعلیم اور معلموں میں کوئی کشش نہ تھی، تالستائی نے کوئی مضمون آخر تک نہیں پڑھا اور کورس ختم کیے بغیر یونیورسٹی کو چھوڑ کر جائداد کا انتظام کرنے کے بہانے سے گھر چلا آیا۔ اس وقت تعلیم میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اس کی ذہنی نشوونما کے لیے خاصی مضر ثابت ہوئی اور اسے وہ برسوں تک اپنے طور پر مطالعہ کرکے بھی پورا نہ کر سکا۔ جائداد کے انتظام کا شوق دراصل کتابی تعلیم سے بھاگ کر دنیا اور آدمیوں میں رہنے اور عمل کے ذریعے استعداد اور تجربہ بڑھانے کی قدرتی خواہش کا نتیجہ تھا، لیکن وہ استقلال جو اس طرح کی تعلیم کو کارآمد بنانے کے لیے لازمی ہے، تالستائی کی طبیعت میں تھا ہی نہیں۔ کسانوں کی اصلاح کا خیال کسانوں کی ذہنی اور اخلاقی پستی سے دوچار ہوتے ہی خود بخود غائب ہو گیا اور تالستائی اپنی نشوونما کی اس منزل تک ابھی پہنچا نہ تھا کہ اسے اپنی ذہنیت اور معاشرت میں اخلاقی بگاڑ نظر آتا اور کسانوں کی زندگی صحیح اور سچّی معلوم ہوتی۔ وہ زمیندار تھا اور جائداد کے انتظام کی اس پہلی کوشش کے بعد بھی وہ زمیندار ہی رہا۔

تالستائی کی طبیعت کی کلی ۱۸۵۱ میں قفقاز جا کر کھلی اور وہیں کی فضا اور مناظر نے اس کی نظروں پر سے وہ پردہ ہٹایا جس نے اب تک اس کو اندھا بنا رکھا تھا۔ سماجی زندگی نے اس کے جذبات میں ایک الجھاؤ پیدا کر دیا تھا، آدمیوں کی صحبت نے اسے خودبیں اور خودپسند بنا دیا تھا، یہاں وہ ایک بارگی فطرت کی گود میں پہنچ گیا اور ایک بچّے کی طرح جو اپنی ماں سے جدا رہ کر پھر ملا ہو، تالستائی پر مسرت کا ایک وجد سا طاری ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی طبیعت سے اب تک ناواقف اور اپنی اصل سے دور رہا ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی بہت سے حوصلے جو اس کے دل میں غافل پڑے تھے چونک اُٹھے۔ پیاس سے مرجھائی ہوئی کھیتی کو اب گویا پانی ملا تھا، اس کا رنگ بدلا، شگفتگی آئی، ہر پودے سے کلے پھوٹنے لگے۔

انسان اپنی ذات، اپنی شخصیت کا کچھ ایسا گرویدہ، اپنے دل میں کچھ ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اس کے باہر وہ کبھی نکل نہیں پاتا اور نکلتا بھی ہے تو بھٹکنے لگتا ہے۔ اس کی جگ بیتی تب ہی سچی اور موثر ہوتی ہے جب وہ آپ بیتی کا ایک روپ ہو، واقعات اور حادثوں کو وہ تب ہی سمجھا سکتا ہے جب وہ خود اس پر گزرے ہوں، زندگی اور دُنیا کے راز وہ تب ہی معلوم کر سکتا ہے جب اس نے اپنی شخصیت کے راز معلوم کر لیے ہوں۔ اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری حقیقت انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے

کہ ہر انسان کی دنیا اتنی ہی بڑی ہوتی ہی جتنی کہ اس کی شخصیت، یعنی کوئی کال کوٹھری میں بند ہوتا ہی اور کوئی ساری مادی اور انسانی دنیا پر حاوی۔ حقیقت نگار صرف اپنی حقیقت بیان کرتا ہی اور اس فن میں کامل ہم اسی کو کہیں گے جو ایک دنیا کی زندگی کا سارا طلسم اپنے اندر رکھتا ہو اور وہ اپنے دل پر نظر ڈالے تو ایک دنیا کا ماجرا بیان ہو جائے۔ تالستائی نے اپنی انشا پردازی سوانح عمری سے اور سوانح عمری بچپن سے شروع کی جو جسم کے لیے نہیں تو شخصیت کے لیے عدم اور وجود کی درمیانی کیفیت ہوتی ہی۔ اس نے ناول نویسی کی مشق بالکل نہیں کی تھی، لیکن اپنی طبیعت پر وہ ایک زمانے سے غور کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی معیار نہ تھا اور کسی معیار پر پورا اترنے کا اسے یقین بھی نہ تھا، لیکن تخیل اور قلم کو آزاد چھوڑ دینے سے اس کے بیان میں ایسی بے ساختگی، سچائی اور سادگی آ گئی جو خود معیار ہی اور جسے دیکھتے ہی پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں۔

تالستائی کی انشا پردازی کا ہر رنگ در اصل اس کی شخصیت کا رنگ تھا۔ اس کی ابتدائی اور آخری تصانیف میں، خواہ وہ ناول ہوں یا رسالے، یہ خصوصیت مشترک ہی کہ ان کا جوہر آپ بیتی کا وہ عنصر ہی جو ان میں شامل کیا گیا یا شامل ہو گیا۔ اس طرح اس کی تصانیف پر معقول بحث کرنے کے لیے لازمی ہی کہ ہمیں اس کی شخصیت کا اندازہ ہو جائے اور نشو و نما کی جو منزلیں اس نے طی کیں ان کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں قایم ہو جائے۔

یہ تو ہم بیان کر چکے ہیں کہ تالستائی بہت حساس تھا اور اس کے جذبات سوئے ہوئے نہ رہتے یا اگر اُٹھتے تو ایک طوفانی موج کی طرح۔ لیکن اس کے باوجود تالستائی کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی اور ہر مسئلے پر اس کی نظر صاف اور سیدھی پڑتی تھی، اس میں نہ تہذیب کی وہ خود پسندی تھی نہ مذاق اور ذہن کے وہ تعصبات جو غور کرنے سے پہلے ہی رائے کو کسی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ مناظرِ قدرت نے اسے اپنے نفس اور اپنے جذبات کا مطالعہ کرنے کا شوق دلا کر ناول نویس بنا دیا، پھر بعد کو جب تہذیب سے اس کا جی ہٹ گیا تو کسانوں کی سیدھی سادی طبیعتوں اور دیہات کی معاشرت سے اس نے اتنا اثر لیا کہ بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ اسے مہذب زندگی کے مقابلے پر لایا اور اس میں شک نہیں کہ دل و دماغ کی وہ سادگی، طبیعتوں کا وہ ہموار اور سُلجھا ہونا جس کی شان یہ ہی کہ محسوس نہ ہو، اسے وجد میں لا سکتا تھا۔ اس کی آنکھ دنیا کو اور آدمیوں کو بچے کی نظر سے دیکھتی تھی اور اس کا دماغ ان دیکھی ہوئی چیزوں کو بوڑھوں کی طرح جانچتا تھا، جو تصویر وہ کھینچتا ہے وہ تعصب اور نظر کے دھوکوں سے خالی اور اس وجہ سے صحیح اور دل کش ہوتی ہے، جو رائے وہ قایم کرتا ہے وہ ایک حساس دل کی سرگزشت اور تجربے پر منحصر اور اس وجہ سے سبق آموز ہوتی ہے۔ یہ سب بڑی نایاب خوبیاں ہیں اور اگر ناول نویسی میں تسکین دینے کا

اتنا مادہ ہوتا کہ وہ تالستائی جیسی بے چین طبیعت رکھنے والے کی زندگی کا مقصد بن سکے تو تالستائی ناول نویسی میں کامل ہوتا اور ہمیشہ کے لیے ویسے ہی سرفرازنہ مانا جاتا جیسے کہ کوہ ایورسٹ پہاڑ کی چوٹیوں میں، لیکن ناول نویسی میں اتنی وسعت کہاں کہ وہ تالستائی جیسی شخصیت کے لیے جولاں گاہ بن سکے۔ اس کی طبیعت میں موج پہ موج اٹھتی رہتی، کبھی وہ چار موجیں ایک ہی طرف بہتیں تو کبھی سب ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتیں اور وہ طوفان برپا ہوتا کہ خدا کی پناہ۔ تالستائی کو کبھی رفاہ عام کا حوصلہ ہوا، کبھی تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا شوق اور ٹوٹی ان اس ارادے پر ٹوٹی کہ دنیا میں وہ دین جو درحقیقت حضرت عیسیٰ کا دین تھا عام مسلک بنایا جائے۔ یہ سب حوصلے بہت بڑے تھے، اتنے بڑے کہ ہر ایک کے لیے عمریں وقف کی جاتیں تو بھی یقین نہ ہو کہ ان کے پورے ہونے کی صورت نکل آئی ہے، ان میں سے ہر ایک کے لیے وہ صبر اور استقلال چاہیے جو وقت کو خاطر میں نہ لائے اور کوشش کو کامیابی سمجھے۔ تالستائی کا تخیل اور اس کا دل اتنا بڑا اور قدرشناس تھا کہ ہر حوصلہ پر جان کو قربان کرنا وہ ایک ادنیٰ خدمت سمجھتا تھا، لیکن اس کے دل کو بڑے حوصلوں کی تاب نہ تھی، وہ انھیں پیدا ہوتے ہی دنیا کے سپرد کر دیتا یا وہ خود اس کے دل کے باہر کود پڑتے۔ ہر حوصلہ اسے دنیا کو بدل دینے کی فکر میں ڈال دیتا، اس کی شخصیت میں وہ صفات پیدا نہ کرتا جو دنیا کو

بدل سکتی ہیں۔ اس کی نظر سب کچھ دیکھ سکتی تھی، ایسی گہرائیاں ناپ سکتی تھی جہاں وجدان کے سوا علم کے کسی ذریعے کی رسائی نہیں، لیکن آنکھ کی دیکھی چیز اس کی طبیعت کے سانچے میں ڈھل کر دوسروں تک نہیں پہنچتی تھی، اس کا نقش فوراً دنیا پر اثر آتا اور تالستائی کی اپنی شخصیت اس کاغذ کی طرح رہ جاتی جس پر سے کسی نے تصویر مٹائی ہو۔ اس کے جذبات کا سیلاب کبھی ادھر بہتا کبھی ادھر، کسی کی کھیتی سیراب نہ ہوتی اور جب وہ گزر جاتا تو تالستائی کے اپنے دل میں بھی اس کا پتہ دینے کو ایک ذرا سا نالا تک نہ رہ جاتا، بس خشک زمین کی صورت یہ بتاتی تھی کہ ادھر سے سیلاب گزرا ہے۔

تالستائی میں یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید وہ ناول نویس نہ ہوتا، اس سے کچھ بہت بڑھ کر ہوتا اور وہ اپنی کمزوریاں محسوس نہ کرتا تو دنیا اس بصیرت افروز ہنگامے سے محروم رہ جاتی جو اس کی تنقید نے پیدا کیا۔ ہمیں اس کی دینی اور معاشرتی تعلیم کے صحیح اور کامیاب ہونے سے بحث نہیں، صرف اس ادیب سے مطلب ہے جس نے ادب، فن اور اخلاق کے چشموں کو ملا کر اپنے دل اور اس کے ساتھ ساری دنیا کی پیاس کو بجھانا چاہا، جس نے حجاب کی رسموں کو توڑ کر ادب کو دین اور اخلاق کی صورت دکھائی اور قلم کی انتہائی قوت میں بے چارگی پائی تو اسے اٹھا کر پھینک دیا اور دل کو ہاتھ میں

لے کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ناول نویسوں کے لیے خصوصاً جب وہ حقیقت نگاری کا دعوےٰ کرتے ہوں، یہ خلافِ ادب مانا گیا ہے کہ وہ قصے میں اپنے خیالات کو اس طرح ظاہر کریں کہ وہ ایک پیوند معلوم ہوں، یا افسانے کے ذریعے سے اپنے کسی عقیدے کی کھلم کھلا تبلیغ کریں۔ ٹالستائی نے اس قاعدے کی پروا نہیں کی اور شروع میں کم لیکن آخر میں بہت زیادہ اپنے خیالات اور عقیدوں کو ناولوں اور افسانوں میں بیان کرتا رہا۔ کہیں کہیں تو بے شک اس کی یہ تبلیغی کوششیں گراں گزرتی ہیں اور اصل داستان سے الگ اور بے تعلق ہو جاتی ہیں، مگر دوسری طرف دیکھیے تو ناول نویسوں کا دعوےٰ کہ وہ آدمی اور دنیا کو جیسی کہ وہ ہے دکھا سکتے ہیں صریحی دھوکا ہے۔ فن اور فن کے سچّے قدر دانوں کا مطالبہ تو بس یہ ہوتا ہے کہ ناول نویس آدمی کے نام سے پُتلے بنا کر نہ کھڑے کر دے اور زندگی کی وارداتوں کے بہانے سے خیالی باتیں بیان کر کے نہ رہ جائے، یعنی اسے آدمی کی سیرت اور زندگی کے کاروبار سے غیر معمولی طور پر گہری اور سچّی واقفیت ہونا چاہیے، خواہ وہ یہ واقفیت اخبار نویسوں کی طرح آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرے یا اپنے جذبات کے دریا میں غوطے لگا کر۔ قصّہ تو بہر حال سوچا جاتا ہے، سیرتوں اور صورتوں کے نقش بنائے اور مٹائے جاتے ہیں جب تک کہ وہ اصل کے بالکل مطابق

نہ ہو جائیں۔ تالستائی نے چھوٹے قاعدے کی پروانہ کی، مگر وہ سچائی اور خلوص کا ایسا دل دادہ تھا کہ اس کی تصانیف میں حقیقت اور افسانے کے درمیان فرق ہی نہیں رہا۔ اس کے بیان میں ہم شروع ہی سے ایک بے تکلفی، سادگی اور صفائی دیکھتے ہیں جو یا تو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے یا برسوں کی محنت اور مشق کے بعد کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے اور یہی صفت تھی جس نے اس کی پہلی تصانیف میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ وہ قصّے کو دل چسپ بنانا درکنار، قصّہ سنانے ہی کی شرط سے بری ہو گیا۔ یہ صفت روس کے اور کئی ناول نویسوں میں پائی جاتی ہے، تالستائی دوسروں سے بازی لے گیا اس لیے کہ اس کی ادبی صفات میں ایک شخصیت کی پرچھائیں بھی نظر آتی تھی جو اور کسی روسی ناول نویس کو نصیب نہ ہوئی۔

تالستائی کا مذاق اور اس کے رجحانات کی ایک علامت یہ ہے کہ اس نے لکھنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے "بچپن" لکھا۔ شاید قفقاز کے مناظر کا اس کی طبیعت پر جو اثر پڑا اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے ورق الٹ کر اور کئی حصّوں پر قلم پھیر کر اسے دوبارہ اور اس نئی نظر سے جو قفقاز کی دین تھی، مرتب کرنا شروع کیا۔ سرگزشت کی یہ نئی ترتیب تاریخ نہ تھی، اس وجہ سے اس کو افسانہ کہا گیا، لیکن لکھتے وقت تالستائی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ "تاریخ سے زیادہ صحیح ہے کہ اس میں آغاز اور انجام کا خیال رکھا گیا ہے"

اس میں جان ہی، اسے پیار سے دیکھا جا سکتا ہی۔ جو کوئی محض کھوج کی خاطر تالستائی کے بچپن کے حالات معلوم کرنا چاہے اسے اس کتاب کا دوسری "تاریخی" کتابوں سے مقابلہ کرنا ہوگا، جو تالستائی کے بچپن میں اپنا بچپن دیکھنا چاہے اور شخصیت کی کلی کے کھلنے کا مزہ لینا چاہے اس کے لیے یہ افسانہ نہیں بلکہ مستند سے مستند تاریخ سے بھی زیادہ صحیح اور بصیرت افروز ہوگی، کیوں کہ اس میں وہ حقیقتیں اور کیفیتیں بیان کی گئی ہیں جن تک مورخ کی رسائی نہیں ہوتی۔ "بچپن" کی ایک کیفیت ملاحظہ ہو:

"پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں۔ چائے کی میز کے سامنے اونچی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دودھ اور شکر کا پیالہ پیئے ہوتے دیر ہو چکی۔ نیند جیسے پپوٹوں کو چپکائے دیتی ہی۔ مگر اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بیٹھے ہیں اور سن رہے ہیں۔ سنیں نہ تو کریں کیا۔ اماں کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی آواز بڑی میٹھی اور خوش اخلاقی سے بھری ہی۔ آواز سنوں اور بات نہ سمجھوں تب بھی معلوم ہوتا ہی کہ وہ میرے دل سے بہت کچھ کہہ گئیں۔ نیند سے نظر دھندلی پڑ گئی ہو مگر میں انھیں کی طرف دیکھے جاتا ہوں۔ ایک بارگی وہ چھوٹی ہو جاتی ہیں، بالکل منّی سی۔ ان کا چہرہ بٹن سے بڑا نہیں ہی، مگر مجھے بالکل صاف دکھائی دیتا ہی۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ پر ایک نظر ڈالتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ مجھے وہ اتنی چھوٹی بہت بھلی لگتی ہیں۔ میں اپنی آنکھیں اور دبا لیتا ہوں۔ اب وہ

بس اتنی بڑی ہیں جتنے کہ وہ چھوٹے بچے جو پتلیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن پھر میں ہل جاتا ہوں اور یہ سارا تماشا ختم ہو جاتا ہی۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں، بدن کو اِدھر اُدھر مڑوڑتا ہوں، ہر طرح سے کوشش کرتا ہوں کہ تماشا پھر سے دیکھوں، مگر کچھ نہیں ہوتا"

"بچپن" ختم ہوتا ہی تو "لڑکپن" اور "جوانی" شروع ہوتی ہی، بچپن کا بھولاپن اب بدل کر لڑکے کی بے چینی اور جوان کی جستجو بن جاتی ہی، کلی اب پھول بن گئی ہی، پھول اپنے آپ کو دیکھتا ہی اور چمن، صبا اور بہار، خزاں اور انتشار، سب کا حال اس پر کھلنے لگتا ہی۔ اس دور کی کیفیتیں بیان کرتے وقت تالستائی کی نظر زیادہ تیز اور گہری ہو جاتی ہی اور وہ تمام احساسات جنھوں نے اس زمانے میں اسے پریشان اور جان سے بیزار کر دیا تھا سب کی یاد تازہ ہو جاتی ہی۔ پھر وہ زمانہ آتا ہی جب وہ جائداد کا انتظام کرنے کے لیے یونیورسٹی چھوڑ کر گھر چلا آیا تھا اور "زمیندار کی صبح" اس وقت کی زندگی کا سچا اور موثر خاکہ ہی جس میں اس نے نہ اپنے ساتھ کوئی رعایت کی ہی نہ ان غلام کسانوں کے ساتھ جن سے اس کا سابقہ تھا۔ اس کے مشاہدے میں اب وہ بے باکی آگئی ہی جس نے آگے چل کر اس کی حقیقت نگاری کو سوسائٹی کے لیے ایک تازیانہ بنا دیا مگر ساتھ ہی محبت اور انسانی ہمدردی کی چارہ سازی پر ایسا بھروسا بھی نظر آتا ہی جو سچائی اور حقیقت نگاری کی کڑی دھوپ میں سائے کی

طرح پناہ دیتا ہے۔

تالستائی ۱۸۵۱ میں قفقاز گیا اور اسی دوران میں جب وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہا تھا اس نے وہاں کے منظروں کی تصویریں بھی کھینچیں۔ اس فن میں بھی اسے کمال تھا۔ دوسرے روسی مصنفوں سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی زبان کچھ خاص طور پر اچھی نہیں، لیکن اس میں مشاہدے کی جو قوت تھی وہ اس کے بیان میں ایک انوکھی تاثیر پیدا کر دیتی جو شاعری اور مصوری دونوں کی تاثیر سے جُدا تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ تالستائی قدرت کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس سے کہ اپنے آپ کو اور صبح اور شام، سکون اور طوفان، غرض قدرت کا ہر رنگ اور ہر کیفیت اس کی اپنی کیفیت، اس کی آپ بیتی بن جاتی تھی۔ قفقاز کی ایک صبح کا منظر، جو اس کے افسانے "حملہ آور" میں بیان کیا گیا ہے، اور "برف کا طوفان" دونوں فن کی شاہ کارمانی جاتی ہیں۔ لیکن قفقاز کی فضا سے اثر لے کر تالستائی نے جو کچھ لکھا اس میں اس کا افسانہ "کوسک" سب سے ممتاز ہے۔

"کوسک" کا قصہ بہت مختصر ہے۔ ایک روسی نوجوان اولینن جنوبی روس میں جا کر کوسکوں کی ایک بستی میں رہتا ہے اور کچھ دنوں رہ کر چلا آتا ہے۔ بہت سے لوگ اسی طرح صحت یا سیر کی خاطر یا ملازمت کے سلسلے میں کوسک علاقے میں جا کر رہتے ہوں گے اور دل پر کوئی خاص اثر لیے بغیر چلے آتے ہوں گے۔ لیکن اولینن کا حال ہی کچھ

اور ہو۔ اس میں وہ قدرتی تنگ نظری اور خود غرضی نہیں ہو، جو انسانی زندگی کو چند خواہشوں کا مجموعہ بنا دیتی ہو اور خواہشوں کے پورے ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بخشتی ہو۔ وہ یہ سمجھ کر کہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، اپنے لیے کوئی مسلک نہیں بنا سکتا اور اسے کسی خاص مسلک کے صحیح ہونے کا یقین بھی نہیں ہو۔ قدرت یا قسمت یا اس کی اپنی طبیعت کے کسی چھپے روگ نے ایسا کچھ کر دیا ہو کہ اس کی ایک آنکھ تن کی دنیا کو دیکھتی ہو تو ایک من کی دنیا کو تکتی رہتی ہو، اسے دنیا میں کسی طرف اطمینان کی صورت نظر نہیں آتی اور سب سے زیادہ شکایت اسے اپنے آپ سے ہو۔ اس کے مذاق اور اخلاق میں بڑی نفاست پسندی آگئی ہو، جو کہ بذاتِ خود بہت اچھی اور کمیاب صفت ہو، مگر اسی نے اس کی قوتِ عمل کو اس طرح مار دیا ہو کہ اسے ان حقیر اغراض اور ادنیٰ ذہنیت رکھنے والے لوگوں پر رشک آتا ہو جو مزے میں اپنا کام نکالتے رہتے ہیں اور جنھیں اپنے عیبوں کا احساس ہو نہ اس کا اندیشہ کہ دنیا ان پر اعتراض کرے گی۔ اولیننہ ہر وقت اپنی طبیعت پر غور کرنے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہو اور اس مشغلے کو بہت اہمیت دیتا ہو، اس لیے اسے بڑا سخت صدمہ ہوتا جب کبھی وہ اچانک محسوس کرتا ہو کہ دنیا کو اس سے مطلب ہو نہ ان مشکلوں سے جو اسے مصروف رکھتی ہیں۔ ظاہر ہو

کہ جس کی طبیعت کا یہ رنگ ہو اسے حسرت کے سوا کیا نصیب ہو سکتا ہے۔ اولینن کی حسرتوں پر ستم یہ ہے کہ وہ جوان ہے، حسن کا قدردان ہے اور دل میں ہزار امنگیں رکھتا ہے۔ وہ شہری زندگی اور آدمیوں کی صحبت سے بیزار تھا اور ایسی جگہ پہنچ کر جہاں قدرت انسانی زندگی کو اپنی گود میں پالتی ہے اسے پھر اپنے آپ سے اور دنیا سے بڑی امیدیں ہو گئی تھیں۔ لیکن قفقاز سے بھی وہ دنیا کی بے دردی کا داغ دل میں لے کر واپس ہوا۔

"کوسک" میں تالستائی نے اولینن کی آڑ میں اپنی سیرت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ شاید اس خاص زمانے کے لیے جب وہ قفقاز میں تھا صحیح ہے۔ نومبر ۱۸۵۳ء میں روس اور ترکی کی جنگ شروع ہوئی، جس میں انگلستان اور فرانس ترکوں کے ساتھ تھے اور ان کی فوجوں نے کریمیا کے جزیرہ نما پر حملہ کیا۔ یہاں پر ایک لمبی جنگ کا سامان ہونے لگا اور تالستائی پر بھی وطنیت کے جوش نے اتنا اثر کیا کہ اس نے لڑائی میں بھیجے جانے کی درخواست کی اور قفقاز کی فوج سے منتقل ہو کر نومبر ۱۸۵۴ء میں سواستوپول پہنچا، جو جنگ کا مرکز تھا۔ اس کے ساتھیوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہنس مکھ رفیق اور بہادر سپاہی ثابت ہوا، دنیا کو اس کے اس جنگ میں شریک ہونے سے تین افسانے ملے جو فن کے اعتبار سے بہت اچھے اور مضمون اور خیالات کے لحاظ

سے شاید اس وقت تک کے یورپی ادب میں انوکھے تھے۔ پہلے میں، جو سب سے کم زور ہے، صرف سواستوپول کی فضا اور وجد کی سی ایک کیفیت جو خود تالستائی پر طاری تھی، بیان کی گئی ہے۔ لیکن تالستائی کا تخیل وطنیت جیسے جذبے کے فریب میں آنے والا نہ تھا۔ دوسرے افسانے میں ہم اس کا بالکل اور ہی رنگ دیکھتے ہیں۔ اب اسے نہ کسی طرف بہادری نظر آتی ہے نہ وطن اور بادشاہ پر جان دینے کا شوق، بس خود پسندی ہے اور مجبوری اور خوف، مرنے میں کوئی شان نہیں ہے اور زندگی میں رونق پیدا کرنے والے ارمان نہیں ہیں۔ اس کو لکھنے کے بعد تالستائی خلوص سے کہہ سکتا تھا کہ "میرے افسانے کی ہیروئن، جسے میں پورے دل سے چاہتا ہوں، جسے میں اس کے پورے حسن کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں، سچائی ہے، وہ سچائی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی"۔ جنگ کی فضا میں چند مہینے رہنے سے تالستائی کے مذاق سے جذبات پرستی کی طرف وہ تھوڑا سا میلان جو اس کی ابتدائی تصانیف میں ملتا ہے، جاتا رہا اور اس کی نظر کے سامنے سے وہ ہلکا سا کہرا جو اب تک پڑا تھا، اُٹھ گیا۔ سواستوپول کے متعلق جو تیسرا افسانہ ہے اس کا موضوع انسان کی طبیعت ہے اور جنگ کی حیثیت بالکل ضمنی ہو گئی ہے۔ یہاں تالستائی نے جذبات کی اُلٹ پھیر کا جو منظر دکھایا ہے وہ درد کی ایک موثر تصویر اور نفسیاتی مطالعے اور تشریح کا ایک

کارنامہ ہی۔

تالستائی کریمیا سے واپس ہوا تو اس کا شمار ملک کے ممتاز ادیبوں میں ہونے لگا تھا اور پیٹروگراد میں وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن ادیبوں کی صحبت میں اسے ایک ہمدم نہ ملا اور ادیبوں کو بھی عام طور پر اس سے یہ شکایت ہو گئی کہ وہ اپنی ریاست اور اعلےٰ خاندانی جتاتا ہی، نک چڑھا ہی اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ یہ شکایت بھی اپنی جگہ پر غلط نہ تھی۔ آرٹسٹ عموماً تنقید اور اختلاف رائے سے چڑھتے ہیں، اپنے آرٹ کو چاہے وہ خود پسندی سے جتنا بھی پاک کرلیں، ان کے اخلاق پر شہرت اور کامیابی کا کچھ بڑا اثر ضرور پڑتا ہی۔ تالستائی میں ذات اور خاندان کا خیال ایک ناگوار صورت اختیار کر لیا کرتا تھا اور اگرچہ بعد کو وہ بہت افسوس کرتا مگر غصے میں منہ سے گھمنڈ اور تکبر کی کوئی نہ کوئی بات نکل ہی جاتی تھی۔ آپس کی رنجشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تالستائی نے روسی ادیبوں سے ملنا اور ادبی صحبتوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔

لیکن تالستائی کی شکایتیں ذاتی اور اتفاقی تھیں تو اصولی بھی تھیں۔ اس کی طبیعت اس زمانے میں بہت بے چین تھی، وہ گویا جذبات کی ایک موج کے ساتھ بہت اونچا اُٹھ کر پھر نیچے گرا تھا، اور ایک تو یہ اُٹھ کر گرنا اور دوسرے شاید منزل سے دور ہونے کا خوف، کہ وہ بلندی سے دیکھنے پر بھی کسی طرف نظر

نہ آئی تھی، اسے پیچ و تاب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اپنے زمانے کے ادیبوں سے اس کو اُمید تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کے شوق میں تڑپ رہے ہوں گے، اور ان کی سرگزشت سے اس کو کچھ سبق، کچھ سہارا ملے گا۔ مگر اس نے انھیں ایسے ہر حوصلے سے خالی پایا اور وہ تمام عیب اسے ڈھیروں نظر آئے جو وہ معمولی آدمیوں میں اور خود اپنے اندر بھی دیکھتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی ادبی استعداد بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی، اس نے جو کچھ لکھا وہ خاص طور پر پسند نہ کیا گیا جس سے اس کا یہ اندیشہ اور بھی بڑھ گیا کہ وہ غلط رستے پر جا رہا ہے اور روحانی سکون اور اخلاقی نشو ونما ایسے مقصد نہیں ہیں جو خالی انشا پرداز بننے سے حاصل ہو سکیں۔ اس کی عقل ایسی نہ تھی کہ جزوی اصلاحوں کو بے جا اہمیت دے، دل ایسا تھا کہ انقلاب چاہتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں کو غافل اور گمراہ پایا تو غفلت اور گمراہی کی جڑ تک پہنچنے کی ٹھانی اور پہنچ بھی گیا۔ اس نے خود جس طرح تعلیم پائی تھی اور ہر سبق کو کڑوی دوا کا گھونٹ سمجھ کر اور منہ بنا بنا کر پیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ رائج طریقوں کے مطابق اس نے پڑھانے کی بھی کوشش کی تھی اور ناکامیاب رہا تھا۔ اب اس نے یورپ کا سفر کیا، وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھے، مگر وہ بھی اسے صحیح رستہ نہ بتا سکے اور اس کی اس رائے کی تصدیق ہو گئی جو اس نے روسی سوسائٹی اور

اس کے مختلف طبقوں کی زندگی اور حوصلوں کا مشاہدہ کرکے قائم کی تھی کہ ہمارے تعلیمی ادارے " ایسے آدمی پیدا نہیں کرتے جن کی نوع انسانی کو ضرورت ہو بلکہ ایسے آدمی جن کی ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی میں قدر ہوتی ہو، سرکاری ملازم، تعلیمی اداروں کے ملازم، ادب کے ملازم، یا ایسے آدمی جنھیں بیکار ان کے ماحول سے کھینچ کر نکالا گیا ہو، جن کی جوانی برباد کی گئی ہو اور جنھیں زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی، یعنی چڑچڑے، ردگی، ترقی کے پرستار" جب تعلیم اس قدر غلط تھی تو کوئی تعجب نہیں کہ عوام، جو اخلاقی اور جسمانی تندرستی کے حس کو کھو نہیں چکے تھے، اس سے بھاگتے تھے۔

لیکن اس عام تعلیمی گمراہی کا علاج کیا تھا؟ تالستائی کا خیال تھا کہ تعلیم کو آزادی پر منحصر ہونا چاہیے اور اسے کتاب کی پرستش کی بجائے خدا اور انسانیت کی سیوا کرنا اور اپنے طریقوں میں قومی ضرورت کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے "تالستائی نے اپنے کسانوں کے لیے ایک اسکول کھولا اور اپنے تعلیمی نظریوں پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن معلم کے لیے جو صبر اور استقلال چاہیے وہ اس میں نہ تھا اور اگرچہ تالستائی نے بات بڑی دور کی سوچی تھی، اس کا اسکول تھوڑے ہی دنوں میں بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس نے شادی بھی کرلی (۱۸۶۲ء) اور شادی سے پہلے اس نے " گھر کے سکھ" کے عنوان سے جو ناول لکھا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی طبیعت

پھر ناول نویسی کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ یہ ناول بڑے شوق سے لکھا گیا، ازدواجی زندگی پر شاید اس سے زیادہ پاکیزہ کوئی تصنیف نہیں اور عشق اور محبت کا پردہ اٹھا کر نباہ اور نباہنے کی خواہش کے پیدا کیے ہوتے سکون کا جو منظر دکھایا گیا ہے اس سے بہتر ازدواجی زندگی کی شرح تفسیر بھی مشکل سے ملے گی۔

اسی سکون کی بدولت تالستائی کو بلند پروازی کا حوصلہ ہوا اور کچھ دنوں پر تولنے کے بعد اس نے "جنگ اور صلح" لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول قصے کی حد سے گزر کر قومی زندگی کی ایک تصویر ہو گئی ہے اور تصویر بھی ایسی جو قومی معاشرت اور حالات کے چوکھٹے میں نہیں سماتی بلکہ تاریخ اور بڑی تاریخی تحریکوں کے وسیع پس منظر میں ہی ٹھیک دیکھی جا سکتی ہے۔ تالستائی نے توجہ صرف روسی زندگی پر کی ہے، لیکن انسانی طبیعت کی وہ خصوصیتیں بھی واضح کر دی ہیں جو تاریخ کے بہاؤ کو ذرا سا ادھر یا اُدھر موڑ کر عام انسانی زندگی کو کچھ نہ کچھ بدل دیتی ہیں اور اس طرح وہ فرق جو قومی معاشرت اور عادتیں انسانوں میں پیدا کرتی ہیں مٹا کر تالستائی نے روسی اور عام یورپی بلکہ انسانی زندگی کے جوڑ ملا دیے ہیں۔

کمال تو یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے لیے تالستائی نے اپنا قلم موٹا نہیں کیا، سیرتوں کے ہجوم میں ہر ایک کو اس دیدہ ریزی اور صفائی سے بنایا ہے گویا وہی ناول کی مرکزی سیرت ہے

اور خاندانوں اور افراد کی روزمرّہ زندگی کے باریک نقشوں سے قومی زندگی کی ایک جیتی جاگتی کتھا مرتب کی ہے۔

"جنگ اور صلح" کا زمانہ انیسویں صدی کے پہلے بیس پچیس سال ہیں۔ شروع میں روسی سوسائٹی اور اخلاق کی پستی اور کھوکھلے پن کا منظر دکھایا گیا ہے، پھر ہم سیاست اور جنگ کے میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور آؤسٹرلٹز کی لڑائی کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امن کا ایک مختصر سا دور آتا ہے جب وہ جذبات اور حوصلے جو جنگ نے بیدار کیے ہیں روسی زندگی میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ خیال ہوتا ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے اور وہ اُٹھان جو ہم نے آؤسٹرلٹز کی لڑائی کے زمانے میں دیکھا تھا موج کا اُٹھان نہ تھا کہ اپنے بعد دوسری موجوں کے لیے سامان کرتا بلکہ دریا کا کنارہ تھا کہ کٹ کر گرا تھا اور دریا کے خاموش بہاؤ میں چند لمحوں کے ہیجان کے سوا کچھ پیدا نہ کرسکا۔ لیکن روس اور نپولین کے درمیان پھر لڑائی چھڑ جاتی ہے اور اب روس ہی میدانِ جنگ ہے۔ نپولین سرحد کے قریب روسیوں کو پسپا کرکے روس کے اندر گھستا چلا آتا ہے، ماسکو کے پاس بورودنو کے مقام پر پھر لڑائی ہوتی ہے اور نپولین ماسکو پر قبضہ کرلیتا ہے۔ روسی ماسکو خالی کردیتے ہیں اور صلح کی درخواست نہیں کرتے۔ اسی سے نپولین کی تدبیر اُلٹ جاتی ہے

اور اس کی فوج واپسی کے وقت سردی اور برف کے طوفانوں اور بھوک کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے۔ روس میں نپولین کی لشکرکشی اور پسپائی قومی حوصلہ مندی کے بیج بو جاتی ہے، قومی خطرے نے ہمدردی اور اتحادِ عمل اور ایثار کا جو جوش پیدا کیا تھا وہ چند حساس دلوں میں خدمت اور قومی ترقی کے لیے جد و جہد کرنے کا ایسا شوق ڈال جاتا ہے کہ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب خود غرضی، پست ہمتی اور سزا کا خوف روسی زندگی کے بہاؤ کو روک کر دریا کو گندے پانی کا تالاب نہ بنا دے گا، بلکہ دریا اپنے لیے نئے رستے نکالے گا اور ادھر اُدھر سے چشمے آ کر اس میں گریں گے اور اس کے زور کو بڑھاتے رہیں گے۔

(۱) مورخ زندگی کے مد و جزر سے غافل نہیں ہوتے، لیکن شخصی زندگی کی تفصیلات ان کی نظر میں نہیں ہوتیں، وہ بچوں کو جوان، جوانوں کو بوڑھا ہوتے نہیں دیکھتے، ان کے کان حادثوں کے شور سے گونج جاتے ہیں، وہ دلوں کی دھڑکن نہیں سن سکتے۔ ناول نویس بھی ان واقعات اور تحریکوں کو اصولاً نظرانداز نہیں کر سکتے جن کا اثر شخصی زندگی پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن ان کے ذہن کو ایسی وسعت کم نصیب ہوتی ہے کہ ایک قوم کی قوم اور زمانے کا زمانہ اس کے اندر سما جائے، ان کے تخیل میں اتنی ہمت کم ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار انفرادی سیرتوں

کے بدلتے رنگوں کو دیکھیں اور ان کی جھلمل جھلمل سے ایک بدلتا ہوُا اجتماعی رنگ بھی پیدا کریں۔ تالستائی "جنگ اور صلح" میں مورخ بھی ہی اور ناول نویس بھی، تاریخ کے فلسفے پر بحث کرتا ہی اور ایک زمانے کی تحریکوں اور واقعات سے اپنے نظریوں کو ثابت بھی کرتا ہی، دوسری طرف وہ روسی زندگی کو ناول نویس کی نظروں سے دیکھتا ہی، ایک نسل کے جوبن کو پہنچ چکی ہی چند مثالی نمونے پیش کرکے وہ نئی پود کو ہنستے کھیلتے دکھاتا ہی، اس نئی پود میں پھر آہستہ آہستہ قدرتی پردوں کو ہٹا کر شعور اور شخصیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، وہ اپنے ماحول اور ابدی اور موروثی مسائل سے دوچار ہوتی ہی، ایک نئی نسل کی پرورش کا ذمّہ اپنے اوپر لیتی ہی اور آخر میں ہمیں دکھایا گیا ہی کہ بچّے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں اور اس طرح ایک نسل کے حوصلے دوسری تک پہنچتے ہیں۔

روسیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی سیرتیں بھی بیان کی جاتی ہیں اگر سوا نپولین اور دو ایک اور ممتاز لوگوں کے، کہ جن کا ذکر تاریخ کے سلسلے میں آیا ہی اور جن کی سیرتیں پیش کرتے ہوئے تالستائی اپنے آپ کو مورّخ تصور کرتا تھا نہ کہ ناول نویس، ہمیں کسی سیرت پر شبہہ نہیں ہوتا کہ یہ گھڑی ہوئی ہی اور اس میں اصلیت کا رنگ روپ نہیں۔

"جنگ وصلح" کے آخری حصّے میں خاص طور پر تاریخی بحث

پوری شیطان کی آفت بن جاتی ہے اور بڑی الجھن پیدا کرتی ہے، اس لیے کہ تالستائی نے اپنے نظریوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی بات بار بار دہرائی ہے۔ مگر یہ تاریخی بحث اصل قصے سے جدا چیز ہے اور جسے تاریخ سے دل چسپی نہیں وہ اسے بڑی آسانی سے نظر انداز کر سکتا ہے۔ تورگینف کے اس اعتراض کا جواب البتہ ذرا مشکل سے دیا جا سکتا ہے کہ "جنگ و صلح" میں در اصل ارتقا اور نشو و نما کا کوئی پہلو نہیں، ارادے کی کم زوری اور جذبات کی اتھل پتھل کی ایک مستقل کیفیت دکھائی گئی ہے۔ روسی نقاد بھی عام طور پر ناول نویسوں سے اسی کی شکایت کرتے رہے ہیں کہ وہ انفرادی زندگی کی رنگا رنگی دکھا کر رہ جاتے ہیں، اجتماعی زندگی کو ایک قدم آگے بڑھتے نہیں دکھاتے۔ خود تورگینف پر بھی یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے جو اس نے تالستائی پر کیا لیکن تالستائی اور اس کے ساتھ تمام حقیقت نگار مجبور تھے کہ بے چینی اور تڑپ کی کیفیت دکھا کر خاموش ہو جائیں، اس لیے کہ آگے کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ تالستائی نے یہی بہت کیا کہ روگی معاشرت اور اخلاق اور خالی دلوں کے سناٹے نے فضا میں جو افسردگی پھیلائی تھی اسے بچوں کے کھیل کود اور بھولے جذبات کی انگڑائیوں سے کسی قدر زائل کیا اور نئی پود کی محبت دلوں میں اس طرح بٹھا دی کہ اس کا پروان چڑھنا ہی ترقی اور کامیابی کی صورت بن گئی۔

"جنگ اور صلح" جیسے کارنامے کے بعد لازمی تھا کہ تالستائی پر

بے چینی کا ایک دور گزرے، جیسے شدید محنت کے بعد سُستی اور تھکن لازمی ہے۔ تالستائی کو پھر یہ خیال ستانے لگا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے اور اسے جو کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہا ہے۔ اس نے عوام کے لیے ایک کہانی لکھنے پر چار برس صرف کیے، یونانی زبان کو سیکھنا شروع کیا اور یونانی ادب کے گن گانے لگا۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح آزاد نہیں تھا کہ جو دھن سوار ہو اسی میں لگ جائے۔ اب اس کے بیوی بچے تھے۔ اس کی بیوی چاہتی تھی کہ وہ ناول لکھتا رہے اور زیادہ نام پیدا کرے۔ "جنگ اور صلح" کی تصنیف میں اس نے بڑی مدد کی تھی اور اسے خواہش تھی کہ اشتراکِ عمل کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ پھر تالستائی کی بے چینی بھی غضب کی ہوتی تھی اور جن تبدیلیوں کا وہ ارادہ کرتا وہ بھی ایسی کہ زندگی کو جڑ سے اُکھاڑ دیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس زمانے میں اس کے ارادوں کا بیوی کی خواہشوں سے تصادم ہوا اور اسے اندیشہ ہونے لگا کہ بیوی اور ازدواجی زندگی اس کے اخلاقی ارتقا میں رکاوٹیں ڈالے گی۔ بعد کو اس اندیشے نے تالستائی کی خاندانی زندگی کو بالکل تہ و بالا کر دیا، لیکن اس وقت کی روحانی بے چینی یہ ظاہر کر کے کہ آنے والے انقلاب کا مادّہ اندر ہی اندر پک رہا ہے پھر کچھ دب گئی اور تالستائی نے "آننا کارینن" اسی سکون کے دوران میں (۱۸۷۳ - ۱۸۷۶ء) لکھا۔

اس ناول میں زندگی کی وہ وسعت نہیں دکھائی گئی ہے جو کہ

"جنگ اور صلح" کی امتیازی خصوصیت ہے، اس کا موضوع چند افراد کی زندگیاں ہیں، لیکن تالستائی کی نظر وہی ہے کہ جس نے "جنگ اور صلح" کو ناول نویسی کا کرشمہ بنا دیا اور میدان کے محدود ہو جانے سے روشنی جہاں پڑتی ہے تیز پڑتی ہے۔ اس ناول میں سیاست اور تاریخ سے بحث نہیں ہے، اخلاق سے ہے، مگر اس انداز سے کہ نہ تو انجام سے وہ بے تعلقی برتی گئی ہے جو رسم نے حقیقت نگار کے لیے لازمی بنا رکھی ہے اور نہ وہ ناصحانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تالستائی کی بعد کی تصانیف میں ملتا ہے۔ کسی کی زندگی بگڑتے دکھائی گئی ہے، کسی کی بنتے، کسی کو طبیعت اور عادت نے ایسا سخت کر دیا ہے کہ وہ نہ بگڑ سکتا ہے نہ بن سکتا ہے، کسی کی زندگی لب جینے میں ہے اور اسے اس کا احساس ہی نہیں کہ بگڑتا گیا ہے اور بنتا گیا ہے۔ لیکن صورتیں، سیرتیں، جذبات کے پلٹے، واقعات، تقریبیں۔ سبھی کے بیان کرنے میں تالستائی نے کمال دکھایا ہے اور اس کا اخلاقی حس کبھی اسے چشم پوشی یا حقیقت کو صاف صاف دکھانے سے پرہیز کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ آخری حصہ باقی ناول کے مقابلے میں بے شک ذرا کم زور ہے، کیوں کہ اس وقت جب یہ لکھا گیا تالستائی پر ایک روحانی کیفیت طاری تھی جس نے اس کی طبیعت کو ناول نویسی سے ہٹا دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ پاپ کٹے۔ اس آخری حصے کا تعلق دراصل ناول کے قصے سے نہیں ہے بلکہ تالستائی کی اپنی زندگی

کے ایک نئے دور سے جو کہ اب شروع ہو گیا تھا۔

"آننا کارینن" کی مرکزی سیرتیں دو ہیں، ایک تو خود آننا اور دوسرے لیوِن۔ لیوِن تالستائی کی اپنی سیرت کا عکس ہے، تالستائی نے اسے اپنی طرح بدصورت، جھینپو، بے چین، سوسائٹی اور اس کے معیار سے غیر مطمئن اور ایک بہتر اصولِ زندگی دریافت کرنے کی فکر میں مبتلا دکھایا ہے۔ لیون کی سرگزشت کے بعض موقعے اور واقعات تالستائی کی اپنی زندگی سے لیے گئے ہیں، تالستائی کی طرح وہ بھی ہے تو رئیسوں کے خاندان سے مگر سرکاری ملازمت اور سوسائٹی میں شہرت حاصل کرنے کے حوصلے کو غلط ٹھیرا کر وہ زمینداری اور دیہات سدھار میں لگ جاتا ہے، تالستائی کی طرح وہ بھی تین بہنوں پر ایک ساتھ عاشق ہو جاتا ہے، بڑی بہن ڈولی آننا کارینن کے بھائی سے بیاہ دی جاتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ منجھلی بہن ہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہوگی اور جب یہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اسے چھوٹی بہن کِٹی سے شادی کرنے کی دُھن ہو جاتی ہے۔ لیوِن جب کِٹی سے پہلی مرتبہ اپنی دلی خواہش بیان کرتا ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس وقت ایک خوبصورت، خوش مذاق رئیس، کاؤنٹ ورونسکی سے رشتے کا امکان بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ ورونسکی خود اگرچہ سیر تفریح اور ناچ وغیرہ کی محفلوں میں کِٹی سے اپنا خاص تعلق سب پر ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ محبت کے ساتھ ازدواجی

زندگی کی پابندیوں کو عاید کرنا ضروری نہیں سمجھنا اور کیٹی کو مایوسی ہی نہ ہوتی بلکہ شاید ذلت بھی اُٹھانا پڑتی اگر آنا کارینن کے اچانک نمودار ہونے سے خود ورونسکی کی طبیعت پھر نہ جاتی۔

آنا کارینن ایک معزز سرکاری ملازم کی بیوی ہے، خوش اخلاق، ہمدردی رکھنے والی عورت ہے اور خودداری اور بے تکلفی، حیا اور ملنساری کے رنگ اس کی طبیعت میں اس طرح ملے ہیں کہ وہ شائستگی اور بھولے بھالے حسن کا ایک مثالی نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے اپنی قسمت سے یا اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں، پُرسکون گھریلو زندگی اسے دل سے پسند ہے اور اس کے گھر کی رونق ایک بچہ بھی ہے جس سے اسے اتنی محبت ہے جتنی کہ ماں ہی کو ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان کی طبیعت میں بگڑنے کے امکانات اسی طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ تندرست جسم میں بیماریوں کے جراثیم۔ ورونسکی سے ملاقات ہوتی ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں تو آنا کی اخلاقی خوبیاں آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی ہیں۔ ورونسکی کی محبت کے منہ پر سے پردہ ہٹتا ہے تو شہوت کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ شہوت کچھ ایسا منتر مارتی ہے کہ آنا کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا، اس کا ضمیر، اس کا اخلاقی حس بالکل فنا ہو جاتا ہے، اس کے معصوم چہرے پر شہوت کی مہر لگ جاتی ہے اور وہ جدھر جاتی ہے، جہاں بیٹھتی ہے، اسی شہوت کی بو پھیل جاتی ہے۔ اب تو ورونسکی کو جال میں

بنائے رکھنے کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور
اس کوشش میں اس کی صورت اور سیرت ان بے حیا عورتوں
کی سی ہو جاتی ہے جو مجبوری سے پیٹ پالنے کے لیے نہیں بلکہ طبیعت
اور عادت سے مردوں کو پکڑنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ رشک
میں جلتی، ورونسکی کے چھوڑ بھاگنے کے خوف میں گھلتی رہتی ہے
اور اپنی مستقل بے چینی اور درد کا علاج وہ مورفیہ (جوہر افیون)
سے کرتی ہے۔ وحشت اور بے چینی آخر کو ایسی شدید ہو جاتی ہے کہ
آنّا کو اس کی تاب نہیں رہتی اور جب ورونسکی اسے چھوڑ کر ایک
فوجی مہم پر چلا جاتا ہے تو وہ ایک مال گاڑی کے نیچے گر کر اپنی جان
دے دیتی ہے۔

کسی کی طبیعت اس طرح روگی ہو جائے اور زندگی تباہ ہو
تو دوسرے اس کے اثر سے بچے نہیں رہ سکتے۔ لیوِن، کیٹی اور
کیٹی کی بڑی بہن ڈوٗلی، جو آنّا کی بھاوج ہے، سب آنّا کے بدلتے
رنگ کو دیکھ کر دنگ کر رہ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے سب سے زیادہ
دکھ آنّا کے شوہر کارینن اور اس کے لڑکے کو ہوتا ہے جو ماں کی
جدائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔
کارینن روکھا پھیکا رسم اور قاعدے کی پرستش کرنے والا آدمی
ہے، اس کی طبیعت میں ذرا بھی لوچ نہیں اور وہ انسانی ہمدردی
اور شرافت جو گمراہوں کو بھی محبت کا مستحق سمجھتی ہے، اس کے

قیاس میں نہیں آتی۔ کارینن پہلے اپنی بیوی کو ایک خاص رسمی اور خشک انداز سے نصیحت کرتا ہے، جب درونسکی سے اس کا تعلق مشہور ہوتا ہے تو وہ آننا کو گھر میں آنے اور بچے کو دیکھنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور اس ضد میں آننا کو طلاق دینے سے انکار کرتا رہتا ہے کہ اگر اسے طلاق مل گئی تو وہ درونسکی سے نکاح کرلے گی اور اس کی بداخلاقی جیسی عیاں ہونی چاہیے، نہ رہے گی۔ اس معاملے میں اور ہر دوسرے معاملے میں کارینن کا رویہ منطق اور مروجہ اخلاق کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، لیکن جب سینہ میں آدمی کا دل نہ ہو تو آدمی کی صورت اور ناصح کی منطق کام نہیں آتی۔ دکھ میں بھی کارینن کوئی ہمدردی حاصل نہیں کر پاتا اور آخر میں جب اس پر ایک طرح کی روحانیت طاری ہوتی ہے تو وہ خاصا مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔

آننا کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں قصور کس کا تھا؟ اس معاشرت کا جو اپنے آپ کو ناچ رنگ کی محفلوں سے سنوارتی اور آزاد خیالی کے چرچے سے ذہن اور دماغ کو جلا دیتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے، لیکن آننا ایسی کمسن اور بھولی نہ تھی کہ بہک جاتی اور اس کے مقابلے میں کِٹّی کا معاشرتی علیبوں میں پھنس کر یا کسی کے دھوکے میں آکر ذلیل اور تباہ ہونا کہیں زیادہ آسان تھا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا ہزار اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے، مگر عورت کے لیے خود تالستائی کے خیال میں بھی اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا

کہ گھر ہو، شوہر ہو اور اولاد ہو، وہ تمام چیزیں جو آنا کو حاصل تھیں اور جنھیں وہ حد درجہ عزیز رکھتی تھی۔ پھر ورونسکی نہ دغاباز تھا نہ بدمعاش اس نے آنا کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی، اسے کسی دھوکے میں نہیں ڈالا اور اسے آنا سے جو محبت تھی اس سے زیادہ داستانوں میں بیان ہو تو ہو، دنیا میں کم پائی جاتی ہے۔ تالستائی نے لیون کے لیے تو ہدایت اور نجات کا سامان اس طرح کیا کہ ایک کسان کے ذریعے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ آدمی کو اپنے واسطے نہیں، خدا کے واسطے زندہ رہنا چاہیے، آنا کا معمہ حل نہیں کیا۔ ہم چاہیں تو اس کی حقیقت نگاری کو عشق مجازی کی پردہ دری سمجھ سکتے ہیں اور عبرت کی ایک تصویر، چاہیں تو اسے درد کی ایک سچی کہانی سمجھ سکتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور وہ غفلت دور ہو جاتی ہے جو انسانیت کی سب سے مہلک بیماری ہے۔

تالستائی نے جب "آنا کارینن" ختم کیا تو وہ شخصی اخلاق کے معموں کو چھوڑ کر ان بنیادی اصولوں کی تلاش میں نکل گیا تھا کہ جن پر اجتماعی زندگی تعمیر کی جا سکے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اصول ان شخصی معموں کو بھی حل کر سکتے ہیں کہ جن پر الگ الگ غور کیجیے تو دردِ سر اور بے چینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تالستائی حقیقت کی تلاش میں نکلا تو صبر اور استقلال اور ضبط کا وہ سامان جو ایسے لمبے سفر کے لیے درکار ہے اس کے پاس نہ تھا، مگر اس کا شوق ایسا سچا تھا کہ

بے سروسامانی کے باوجود وہ بہت دور پہنچ گیا اور اس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ ہزار دشواریاں اور الجھنیں پھر اسے گھسیٹ کر بلندی سے پستی کی طرف نہ لا سکیں۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ علم جو فرد اور جماعت دونوں کی اخلاقی نشو و نما کا ذریعہ نہ بن سکے جہالت سے بھی بدتر ہے اور وہ آزاد خیالی جو بصیرت دینے کی بجائے تنقید کے نشے میں مست کرکے منظر کو اور بہکا دے ایک روگ ہے کہ جسے دور کیے بغیر صحیح اخلاق کا تصور قایم کرنا ناممکن ہوگا۔
"عقیدہ زندگی کی قوت ہے۔ انسان بغیر عقیدے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ زمانے میں انسان کے روحانی شعور نے جس طرح دینی تصورات مرتب کیے اور عقیدے نے زندگی کی پہیلیاں جس طرح بوجھی ہیں اسی میں نوع انسانی کا سب سے گہرا علم پایا جاتا ہے۔" اس خیال کی تکمیل ایک اور کیفیت نے کر دی۔ "بہار کا دن تھا اور میں اکیلا جنگل میں بیٹھا خاموشی پر کان لگائے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے پچھلے تین سال سے بے چین ہوں، خدا کی جستجو ہے، خوشی اور بیزاری کی دو حالتوں کے درمیان جھولتا رہتا ہوں......
ایک بارگی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں زندہ تب ہی ہوتا ہوں جب مجھے خدا پر یقین ہوتا ہے... میرے گرد ہر چیز جاگ اٹھتی ہے، ہر چیز میں معنی اور مقصد نظر آنے لگتے ہیں......... خدا کو جاننا اور زندہ ہونا ایک ہے۔"

جذبۂ دینی کے اس تسلط نے ایک طرف تو تالستائی کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے عقیدے صاف صاف بیان کرے جس کے سبب سے اس کی روسی کلیسا سے لڑائی ہو گئی اور دوسری طرف اسے یورپ کے ادیبوں اور فنونِ لطیفہ کے قدر شناسوں سے بھڑا دیا۔ تالستائی انجیل کا مطالعہ، ماحول کا مشاہدہ اور اپنے دل سے جرح کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ حضرت عیسٰی نے اخوت، عدم تشدد، ایثار اور سیدھی سچی پاکیزہ محنت مشقت کی زندگی کی تعلیم دی تھی، کلیسائی نظام، اس کا ٹھاٹھ، اس کی عبادت اور رسمیں بعد کے تصرفات ہیں جنھوں نے اصل تعلیم کی صورت بگاڑ دی۔ ادھر ان لوگوں کے جواب میں جن کا خیال تھا کہ مذہب اور تہذیب کا ساتھ نہیں ہو سکتا، اور انسان اگر تہذیب کو چھوڑ دے تو ترقی کے تمام رستے بند ہو جاتے ہیں تالستائی نے کہا کہ مذہب اور عقیدہ اگرچہ اس محدود علمی عقل کے لیے مہلک ہے جو جزو کو کل اور حیوانی زندگی کو اصل زندگی ٹھیراتی ہے، لیکن وہ اس سچی عقل کی روشنی پھیلاتا ہے جو کائنات کے اندر مضمر ہے اور جس سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ عقل عمل چاہتی ہے، اس کا عمل عشق ہے، جو انسان کو بے خودی سکھاتا ہے اور اپنی ذات کو جس کی کوئی وقعت نہیں اس لیے کہ انسان کو اس پر اختیار نہیں، قربان کر کے ایک غیر محدود، دائمی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔

اس وقت سے تالستائی، سرکاری کلیسا اور "روشن خیال" طبقے کے درمیان جو جنگ چھڑی وہ تالستائی کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ہم یہاں پر مذہبی بحث میں حصّہ نہیں لے سکتے، اگرچہ یہ موضوع بہت دل چسپ ہے اور ایک زمانے میں تالستائی کے جوش اور اس کے قلم کے زور نے سارے یورپ کو اس میں اُلجھا دیا تھا۔ ادب اور فن کے معیار پر جو بحث تالستائی نے چھیڑی وہ بھی کچھ کم دل چسپ اور بصیرت افروز نہیں، لیکن اسے مفصل بیان کرنے کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جائے تو بھی شاید کافی نہ ہوگی۔ تالستائی اب تک تو ادب اور انسانیت کی خدمت کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور ادب کے خلاف جو کچھ کہا تھا اس کا مقصد ادیبوں کو حقیقت شناسی کی طرف مائل کرنا تھا۔ ۱۸۸۲ میں اس نے مردم شماری میں حصّہ لیا اور ماسکو کے غریب واڑوں میں اس نے افلاس، درد اور بے حسی کے جو منظر دیکھے انھوں نے اس کے دل کو تڑپا دیا اور یہ ناممکن ہوگیا کہ اس کے بعد وہ ادیب رہ سکے اور اب تک اس کی زندگی کی جو صورت تھی وہ قایم رہے۔ "ہمیں کیا کرنا چاہیے" کے عنوان سے اس نے جو کتاب لکھی وہ ایسی ہمہ گیر ہے اور ایسے گہرے خلوص اور شدید غم اور غصّے کا پتہ دیتی ہے کہ جس کی مثال یورپی ادب میں نہیں ملتی اور جو اس کتاب کا رشتہ الہامی کتابوں سے جوڑتا ہے۔

تالستائی نے پہلے غریب واڑوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور

پھر اس کے اسباب پر بحث کر کے نتیجے نکالے ہیں جو صحیح تسلیم کر لیے جائیں اور ہدایت کا ذریعہ بنائے جائیں تو مذہبی، سیاسی اور معاشی نظام، علم، ادب، فن سب ہی کو مٹانا اور مٹا کر نئے سرے سے قایم کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ لیکن تالستائی کی بحث علمی اور عقلی نہیں ہے، اس نے ریاست کے ظلم، دولت مندوں کی خود غرضی اور علم اور تہذیب کے دھوکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے اور اس کی تلقین کی ہے کہ ظالموں اور گمراہ کرنے والوں سے قطع تعلق کیا جائے، غریبوں کی محنت سے فائدہ اُٹھانا، ریاست کی خدمت کرنا بند کر دیا جائے، جسمانی محنت کو ایک اخلاقی فرض مانا جائے اور عدم تشدد کے ذریعے سے ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جائے جو سماجی زندگی میں ظلم اور خود غرضی پیدا کرتی ہیں اور قایم رکھتی ہیں۔ عدم تشدد کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں بلکہ ایثار سے کرنا چاہیے اور دنیا کا سارا دُکھ درد اپنے اوپر لے کر اپنی زندگی کو مجسّمہ صبر، محبّت اور بے خودی بنا دینا چاہیے۔ یہ تعلیم ایسی ہے کہ اس پر عمل کرنے والا ہو تو یہ نہایت دل افروز اور ہمّت افزا بن سکتی ہے، لیکن اگر یہ باتوں اور بحثوں تک محدود رہے اور اس پر عمل کرنے والا بڑے پائے کی شخصیت نہ رکھتا ہو تو اس کا اثر بالکل الٹا ہوتا ہے اور لوگ متاثر ہونے کی بجائے محبت، صبر اور ایثار جیسے قابلِ قدر جذبات کی ہنسی اڑانے

لگتے ہیں۔ تالستائی کی شخصیت ناہموار تھی، اس کا جوش زائد بھاپ کی طرح زبان اور قلم کے رستے سے نکل جایا کرتا تھا اور عمل کا وقت آتا تو وہ ایسی لیس وپیش میں پڑ جاتا کہ جو اس کو شل اور اس کے معتقدوں کو حیران کر دیتی تھی۔ گاندھی جی نے اگرچہ اپنے دل کا دیا تالستائی کی مشعل سے جلایا، مگر اپنی خاص استعداد کے سبب سے وہ عمل میں اپنے استاد سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدے اور عمل ہی میں نہیں بلکہ عقیدے اور معمول میں ایسی مطابقت پیدا کر لی کہ جو تالستائی کو نصیب نہ ہوئی۔

پھر تالستائی اپنی طبیعت کی افتاد اور اپنے خاص ذوق اور استعداد سے مجبور تھا کہ ایسی بحثیں چھیڑے جو دینی مصلح کے لیے بالکل ضمنی ہیں اور جن سے اسے جہاں تک ہو سکے بچنا چاہیے۔ "ہمیں کیا کرنا چاہیے" اور "آرٹ کیا ہی؟" (۱۸۹۸) ان دونوں کتابوں میں تالستائی نے آرٹ کی ماہیت اور آرٹسٹ کے فرائض کو اپنے محبت، ایثار اور اخوت کے عقیدے کی روشنی میں دکھایا ہی اور یہ روشنی بڑی ہی بصیرت افروز ہی۔ "آرٹ کیا ہی" "ہمیں کیا کرنا چاہیے" کے تیرہ برس بعد لکھی گئی، اس میں تنقید زیادہ ہی اور اس میں تالستائی نے یورپی آرٹ کے مثالی نمونوں پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اکثر غلط اور بے جا ہیں۔ تالستائی کو در اصل یورپی ادب اور آرٹ سے اتنی واقفیت نہ تھی کہ وہ ان پر

معقول تنقید کر سکے اور اس بحث سے اس کا اصل مطلب واضح ہونے کی بجائے تفصیلات میں اور چھپ جاتا ہے۔ لیکن اس تنقیدی حصّے کو نظر انداز کر کے تالستائی کی تعلیم کو دیکھیے تو اس میں نور ہی نور ہے۔ آرٹسٹ اور ادیب ان حقیقتوں اور اعلیٰ مقاصد کے سامنے سر جھکائیں جن کا جلوہ تالستائی کی تعلیم میں نظر آتا ہے تو آپ سمجھیے کہ وہ شیطان ہیں اور ایسے غرور کے مجسمے جو کہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ انسانیت کا جوہر اس کی خود نمائی پر نثار کیا جائے۔

"اپنے آپ کو قربان کرنا اور دُکھ سہنا یہ سچے مفکر اور ماہرِ فن کا حصّہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا مقصد انسانیت کی بھلائی ہے۔ آدمی غم میں مبتلا ہوتے ہیں، مصیبتیں جھیلتے ہیں، مرتے ہیں، فراغت اور لطف اندوزی کی مہلت کسے ملتی ہے۔ مفکر اور ماہرِ فن آسمان کی بلندیوں پر بھٹکتا نہیں پھرتا... وہ ہمیشہ حوصلوں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے، اس کا دل بے چین رہتا ہے۔ اس کا فرضِ منصبی یہ طے کرنا اور بتانا ہے کہ انسان کی فلاح کاہے میں ہے، اسے مصیبت سے نجات کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے مگر وہ ابھی تک کچھ طے نہیں کر پایا ہے، کچھ بتا نہیں سکا ہے اور کل تک شاید بہت دیر ہو جائے اور وہ مر جائے... مفکر اور ماہرِ فن وہ ہے جو خوش ہوتا اگر اسے سوچنا نہ پڑتا اور دل میں جو بات بیٹھ گئی ہو اسے بیان نہ کرنا پڑتا مگر وہ اپنے آپ کو اس سے روک نہیں سکتا، اس لیے کہ دو پوشیدہ قوتیں اسے اس پر

مجبور کرتی ہیں: ایک تو اس کا اپنا شوق اور دوسرے اس کی انسانی ہمدردی۔ فن کے سچّے شیدائی جو سیر اور لطف اندوزی کی طرف مایل اور اپنے آپ سے مطمئن ہوں، ڈھونڈھے بھی نہ ملیں گے۔" ("ہمیں کیا کرنا چاہیے؟")

مفکر اور ماہرِ فن کا یہ خاکہ تالستائی نے اس وقت بنایا جب ماسکو کے غریب واڑوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور یہ خاکہ آخر وقت تک اس کے ذہن میں محفوظ رہا۔ یہ نصب العین اسے بے حد عزیز بھی تھا اور اسے بڑا صدمہ ہوتا اگر لوگ اس پر تنقید یا اعتراض کرتے۔ "آرٹ کیا ہے؟" ان اعتراضات کا ایک جوشیلا جواب ہے، اس میں تالستائی نے اپنے زمانے کے آرٹ کے شیدائیوں پر حملہ کیا، ان کے بتوں کو توڑا، ان کے احساسات کو پامال کیا، ان کے عقیدوں کا مذاق اڑایا، ان پر یہ الزام دھرا کہ وہ اپنی ایک الگ ذات بنائے ہیں اور اپنی پست دل حسیوں اور گرے ہوئے مذاق کو معیار قرار دیے بیٹھے ہیں۔ عام خیال کے خلاف اس نے یہ دعویٰ کیا کہ آرٹ کسی طرح محدود نہیں اور اس کا دارومدار خاص استعداد پر نہیں۔ "آرٹ ہرجائی ہے"۔ "آرٹ ہماری ساری زندگی میں سمایا ہوا ہے۔ ہم جسے آرٹ کہتے ہیں یعنی تھیٹر، کونسرٹ، کتابیں اور تصویروں وغیرہ کی نمائشیں، یہ آرٹ کا بہت ہی حقیر حصّہ ہے۔ ہماری زندگی طرح طرح کے فنی الہاموں سے

بھری ہوتی ہی، چاہے آپ بچّوں کے کھیل کو دیکھیے، چاہے مذہبی رسموں کو۔ آرٹ اور بولی انسانی ترقی کے ذریعے ہیں، ایک دلوں کو ملاتا ہی، دوسرا خیالات کو۔ جب ان میں سے کسی میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی روگی ہوگئی ہی۔ ہمارے زمانے کا آرٹ غلط اور جھوٹا ہی۔

آرٹ کا میدان اتنا وسیع ہی تو اس کا صحیح مظہر وہی جذبات ہو سکتے ہیں جو انسان کی سرشت میں ازل سے موجود ہوں اور اس کا صحیح مقصد صرف یہ ہو سکتا ہی کہ سچے اخلاق کو فروغ دے کر وہ معاشرتی اور ذہنی فضا پیدا کرے کہ جس میں انسانیت کے جوہر کُھلیں، افراد میں جماعت کی بھلائی کا احساس بڑھے، مختلف جماعتوں اور ملّتوں میں ربط اور اتحاد قایم ہو۔ ہر جماعت کا ایک مخصوص تصور حیات ہوتا ہی جس کی بنیاد اس کا دین ہوتا ہی، آرٹ کو چاہیے کہ دین کا خادم ہو اور اس مخصوص تصور حیات کا آئینہ۔ مثلاً عیسائی مذہب کی امتیازی صفت ایثار اور اخوت ہی، اس لیے عیسائیوں کے واسطے وہی آرٹ قابل قدر ہی جو اخوت اور ایثار کے جذبے کو چمکائے اور ان کی تکمیل کی آرزو کو یہاں تک بڑھائے کہ وہ پوری ہو جائے۔ "آنا کارنین" کے بعد تالستائی نے جو افسانے اور ناول اور ڈرامے لکھے ان میں آرٹ کا یہ نیا مقصد جو اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا تھا اپنا رنگ دکھاتا رہا۔

"عوام کی کہانیاں"، "عوام کی داستانیں"، "ایوان ایلیچ کی موت" "باطل کی قوت"، "کرائٹزر سوناٹا"، "آقا اور غلام" اور "نئی زندگی" موضوع کے اعتبار سے اتنے مختلف اور فنی نقطۂ نظر سے اتنے کامیاب کارنامے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اور کوئی نہیں تو تالستائی خود تو اپنے معیار پر پورا اُتر سکتا تھا۔

عوام کی کہانیوں میں سے زیادہ تر تالستائی نے کسانوں اور داستان گوؤں کی زبانی سنیں، چند اس خاص طرز میں اس کی اپنی تصنیف کہی جا سکتی ہیں۔ ان سب میں ایسی سادگی اور ہمواری ہے، خالص ادبی خوبیوں سے ایسا تغافل برتا گیا ہے کہ وہ ادب سے ایک برتر چیز بن گئی ہیں اور ان میں نصیحت بھی کی گئی ہے تو ایسے پیرائے میں اور ایسی ظاہری بے پروائی سے کہ وہی بات جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ادب لطیف میں کھپتی نہیں یہاں زیور کا نگینہ، حسن کی خاص ادا بن گئی ہے۔ "آدمی کو کتنی زمین چاہیے" اور "تین بوڑھے" تو ایسے قصے ہیں کہ جنھیں ایک بار پڑھ لیجیے تو ساری عمر یاد رہیں اور اس وجہ سے یاد رہیں کہ ان میں جو نصیحت کی گئی ہے وہ خود بخود دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ "آقا اور غلام" اسی رنگ میں ڈوبا ہوا افسانہ ہے، اگرچہ اس میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس خیال سے تالستائی نے اپنے ابتدائی زمانے کے ایک افسانے "برف کے طوفان" کا ایک حصہ پس منظر کے طور پر رکھا ہے۔

"ایوان ایلیچ کی موت" ایک ایسے آدمی کے انجام کا نقشہ ہے جو اپنی زندگی، معمول، خیالات کے لحاظ سے ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو یورپ میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایوان ایلیچ ایک ایمان داری سے کام کرنے، عام قاعدے کے مطابق زندگی بسر کرنے والا سرکاری ملازم ہے۔ اس کے دل میں اپنی ترقی کے سوا کوئی حوصلہ نہیں، اس کے اخلاق اور عادات کی ابتدا اور انتہا یہ ہے کہ اپنے جیسوں میں اچھا سمجھا جائے، وہی مانے جو سب مانتے ہوں، وہی کہے جو سب کہتے ہوں، پابندی سے کام کرے، عام دل چسپیوں میں شریک ہو، کبھی ناچ لے، کبھی تاش کھیل لے۔ جب تک وہ اپنے معمول پر چل سکا اسے اپنے اندر کوئی خامی، اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی، لیکن جب وہ بیٹھنے کے کمرے میں پردہ لگاتے وقت گر پڑا، بیماری نے اس کے معمول کو چھڑا دیا اور درد کے دورے اسے دوا اور تسکین کے لیے تڑپانے لگے تو اسے ایک بارگی معلوم ہوا کہ اس کا کوئی سہارا نہیں۔ جان پہچان والے اسے بھول گئے، بیوی یہ تاڑ گئی کہ اب وہ بچنے والا نہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے انتظام کرنے لگی، بڑی لڑکی شادی کی فکر میں پڑ گئی۔ ان سب کی سرد مہری اور خود غرضی نے ایوان ایلیچ کو ان سے بیزار کر دیا، لیکن ایک مدت تک اسے نہ تکلیف نے چھوڑا نہ موت نے اپنے دامن میں پناہ دی، اس کے دل کا کسی عقیدے پر تکیہ نہ تھا، اس کا جذبۂ دینی ایسا معطل ہو گیا

تھا کہ اس نے دائمی حیات کی وہ جھلک کبھی نہ دیکھی تھی جو ایک زندگی کے خاتمے کو دوسری کی ابتدا بنا دیتی ہے اور اس لیے وہ تڑپتا اور کراہتا رہا۔ موت بے شک آئی اور تسلی ساتھ لائی، مگر اسی وقت جب بے عقیدہ، بے مقصد زندگی کے عبرت ناک انجام کی ہیبت طرح طرح سے دل میں بٹھائی جا چکی تھی۔

اخلاقی اور روحانی بے مایگی یا کج روی کی پردہ دری کے لیے موت کا آنا ہی ضروری نہیں، عام زندگی میں بہتیرے ایسے موقع اور واقعات پیش آتے ہیں کہ جن سے سبق لیا جا سکتا ہے۔ ادان ایلیچ ساری عمر گزار چکا تھا جب ایک حادثے نے دنیا سے اس کا رشتہ توڑا اور عادت اور رسم کی غلامی اور خدا کی بندگی کے درمیان جو فرق ہے اس پر آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ "کرائیٹزر سوناٹا" میں تالستائی نے خود اس رسم رواج اور اس تربیت پر حملہ کیا ہے جو بلوغ کے زمانے سے ہی انسان کو غلط رستے پر لگا دیتی ہے اور اس معاشرت کی قلعی کھولی ہے جو ایک ناپاک جذبے کو لطف و محبت کی خوشبو میں بسا کر اور ازدواجی زندگی کی سنہری ہتھکڑیاں پہنا کر اپنا اور قدرت کا کام نکالنا چاہتی ہے۔ کرائیٹزر سوناٹا یورپ کے سب سے بڑے ماہر موسیقی بیتھوون کی ایک تصنیف ہے جسے تالستائی نے ایک زمانے میں سنا تھا اور شاید اسے یہ شہوانی جذبات کے لیے اشتعال انگیز معلوم ہوئی، اگرچہ دوسروں پر اس کا یہ اثر نہیں ہوتا اور ہمیں یہیں یہ کہہ دینا چاہیے کہ بیتھوون جیسے پاکیزہ نفس آرٹسٹ کا نام اس

طرح سے اس بحث میں اُلجھا دینا جو تالستائی نے اپنے افسانے میں چھیڑی صریحی زیادتی ہے۔ غالباً تالستائی کا مقصد یہ جتانا تھا کہ یورپی تہذیب کے نیک اور پاک لوگ بھی ان رسموں کی تائید کرنے اور ان کو اپنے نام کا سہارا دینے میں شریک ہیں جنھیں اس نے سچّے اخلاق کے لیے مہلک پایا۔ پھر بھی بیتھوون کا اس سلسلے میں ذکر نہ آنا چاہیے تھا۔

"کرائٹسر سوناٹا" کا قصّہ ایک مجرم پوزدنی شف کی زبانی بیان کیا جاتا ہے جو دس برس قید کی سزا بھگت چکا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی بیوی اور اس کے دوست پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پوزدنی شف قصّہ اس وقت سے شروع کرتا ہے جب وہ نوجوان تھا، خوش حال تھا اور بہت سی مائیں چاہتی تھیں کہ اسے اپنا داماد بنائیں۔ ایک خاندان کی عورتیں ذرا زیادہ ہشیار تھیں، انھوں نے گفتگو اور ہنسی مذاق کے ذریعے طرح طرح سے پوزدنی شف کو ایک خاص لڑکی کی طرف متوجہ کیا، اس کے موقع نکالے کہ دونوں کا ساتھ ہو، لڑکی کا لباس ایسا تھا اور طریقہ ایسا کہ جنسی رغبت پیدا ہو اور آخر میں یہ سازشیں کامیاب ہوئیں، یعنی پوزدنی شف نے لڑکی سے نکاح کر لیا۔ لڑکی والے مطمئن ہو گئے کہ بیٹی ٹھکانے لگ گئی، لڑکی آپ بھی خوش تھی، لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ازدواجی رشتہ قایم کرنے کے لیے اس کے شوہر میں شہوانیت کی جو آگ بھڑکائی گئی ہے وہ کسی طرح بجھائے نہ بجھے گی۔ اس نے شادی سے پہلے لگاوٹ کی تھی تو یہ سمجھ کر کہ قاعدہ یہی ہے، اس کی

لگاوٹ انسانی تھی، حیوانی نہ تھی، لیکن پوزدنی شف کی طبیعت ایسی نہ تھی کہ اس آنکھ مچولے میں اسے مزہ آئے، اس زمانے میں اس کے احساسات کچھ بھی ہوں، اپنی داستان بیان کرتے وقت تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے شروع سے دیکھا کہ میرے جنسی جذبات کو اُکسایا اور ایک خاص لڑکی کی طرف مائل کیا جا رہا ہے، لڑکی کا لباس اور انداز ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی اس میں شریک ہے۔ شادی ہو جانے پر لڑکی سمجھی کہ مطلب پورا ہو گیا ہے، اب تعلقات کا رنگ بدلنا چاہیے، پوزدنی شف کے لیے شادی بیاہ نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے رسمی پردہ تھا اور وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے علاوہ ازدواجی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔ پوزدنی شف کی بیوی بہت جلد تعلقات کے اس ڈھنگ سے بیزار ہو گئی، اسے اس کی تمنا ہوئی کہ کوئی اسے انسان بھی مانے۔ موسیقی کا اسے پہلے بھی شوق تھا۔ اب وہ اس طرف زیادہ توجہ کرنے لگی اور اسی سلسلے میں اس کی ایک وائلن بجانے والے سے دوستی ہو گئی جو اس کی انسانیت کی بھی قدر کر سکتا تھا۔ در اصل اس کی دوستی جنسی خواہشوں سے بالکل پاک تھی، لیکن پوزدنی شف کو اب یقین ہو گیا تھا کہ مرد عورت کا میل جول صرف انھیں خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ہو سکتا ہے، اور ایک شام کو جب وہ گھر آیا اور اپنی بیوی اور اس کے دوست کو کرائٹزر سوناٹا بجاتے دیکھا تو اس نے ان پر حملہ کر کے دونوں کے کاری زخم لگائے اور اس طرح قصے کو ختم کیا۔

یورپی لباس، گفتگو اور میل جول کے قاعدوں پر تالستائی پہلے بھی اعتراض کرچکا تھا، اس افسانے میں اس نے یورپی معاشرت کے جسم پر لاج رکھ لینے کو ایک چیتھڑا بھی نہ چھوڑا اور اسے پڑھنے کے بعد آدمی کو کئی دن تک ہر شخص اور ہر چیز برہنہ نظر آتی ہے۔ تالستائی کے اعتراضوں کو غلط ٹھیرا دیجیے اور پوزدنی شف کی ذہنیت کو ایک شخصی روگ سمجھیے تو "کرائٹسر سوناٹا" ایک بہت اچھا افسانہ ہے اور وہ دل کو صاف اور محبت کو پاک رکھنے کی خواہش بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس پر خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ تالستائی کی تنقید حدِّ اعتدال سے گزر گئی ہے اور اس نے اپنے اوپر ایسی تعلیم دینے کا ذمّہ لے لیا ہے جو انسانی سرشت کو بالکل بدل دے گی اور نسل کی بقا کے لیے کوئی ایسی ترکیب بتائے گی کہ جو نفس سے کوئی دور کا رشتہ نہ رکھتی ہو، یا پھر انسانوں کو اس پر راضی کرے گی کہ وہ پیدائش کا سلسلہ بند کردیں۔ چناں چہ جب تالستائی پر اعتراضات کی بوچھاڑ بہت پڑی تو اس نے افسانے کا ایک تتمہ بھی شایع کیا جس میں اس نے یہ تسلیم کیا کہ "کرائٹسر سوناٹا" کی اخلاقی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسل انسانی کو شہوت سے پاک ہونے کے لیے افزائشِ نسل کا سلسلہ بند کردینا چاہیے اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ نتیجہ حضرت عیسٰی کی تعلیم کے مطابق ہے اور نسل انسانی کے لیے بقا کوئی ایسی نعمت نہیں کہ جس کی خاطر اخلاقی گمراہی گوارا کی جائے۔ لیکن یہ تو منطق تھی جو اس کے گھر تک پہنچا نہ ہوا۔ اس سے

اخلاق کی کوئی گنتی نہیں سلجھتی اور قانونِ قدرت اور انسانی فطرت کے یہ تعلیم اس قدر خلاف ہے کہ وہ کبھی صحیح مانی نہیں جا سکتی۔

شہوانی جذبات کی ستم شعاری تالستائی کے ایک ڈراما "باطل کی قوت" اور ایک ناول "بازخاست" کا بھی موضوع ہے۔ "باطل کی قوت" کا قصہ وہ ہے جو تقریباً ہر روز اخباروں میں بیان ہوتا ہے: فلاں کا فلاں کی بیوی سے ناجائز تعلق ہو گیا عورت بڑی بدمعاش تھی، اس نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا اور اپنے بچے کو مار ڈالا۔ تالستائی نے صرف یہ جدت کی ہے کہ مجرم باپ کے کہنے سے پنچوں کے سامنے اپنے جرم قبول دیتا ہے اور سزا گناہ کے دھبّوں کو دھوکر دل میں صفائی پیدا کرتی ہے شاید اس خیال سے کہ ڈراما دیہاتیوں کو دکھایا جائے گا تالستائی نے دیکھنے والوں کے تخیل پر قصے کا جوڑ ملانے اور گفتگو یا کیفیت سے ایسے واقعے کا پتہ چلانے کا بار نہیں ڈالا ہے جو اسٹیج پر دکھایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے بچہ بھی اسٹیج پر مارا جاتا ہے، جو کہ بہت ہی کریہ منظر ہے۔

"بازخاست" کے آخری حصّے میں انجیل کی آیتیں ہر خیال اور ہر کیفیت کی سند کے طور پر شامل کر دی گئی ہیں، جن کی بدولت وہ ایک عیسائی ناول معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس میں اور تالستائی کے پچھلے ناولوں میں اصول ادب کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور وہ ہر طرح سے ناول نویسی کی ایک شاہکار ہے۔ بے شک اس کا

مقصد اخلاقی نصیحت اور اصلاح ہی اور یہ صاف ہو جاتا ہی کہ مصنف کا ارادہ ہی کہ یہ ثابت کرے کہ شہوت "ایک ڈراؤنا جانور ہی جو انسان کے اندر رہتا ہی اور کبھی اسے چھوڑتا نہیں، جو اس وقت اور بھی زیادہ ہیبت ناک ہو جاتا ہی جب وہ اپنی صورت نہیں دکھاتا، جب وہ ایک شاعرانہ بھیس میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہی۔" تالستائی اسے کسی میدانوں میں اپنا ناپاک کام کرتے اور طبیعتوں کو روگی اور زندگی کو گندہ کرتے دکھاتا ہی، مہذب محفلوں کے طور طریق اور بول چال میں، اس ملازمہ کی سرگزشت میں جو گھر سے بے عصمت ہو کر نکلتی ہی اور بازار میں جا بیٹھتی ہی، ان لوگوں کے دلوں میں جو اس بے چاری کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں اور تھو کتے ہیں، جو اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولیس اور عدالت کے حوالے کرتے ہیں، مجرموں کی دنیا میں، انقلابیوں کے گروہوں میں۔ اس طرح اگرچہ تالستائی کو کہنا بس یہ ہی کہ نفس کے پھندوں سے بچے رہو اور گناہوں سے توبہ کرو، کہ سچی مسرّت اور خدا کی رضامندی اسی میں ہی، اس نے اپنی بات ذہن نشین کرنے کے لیے ساری دنیا کا کاروبار نظروں کے سامنے پیش کر دیا ہی اور کبھی اشارے، کبھی بحث، کبھی تلقین اور لطیفے سے اپنا مطلب واضح کیا ہی۔ انقلابیوں کی کارروائیاں اور چال ڈھال، مجرم اور جیل خانے، یہ تالستائی کے لیے نئے مضمون تھے، لیکن سوائے انقلاب کے کہ جس سے اس کو لٹھی

عداوت تھی، اس نے یہ نئے مضمون خوب ہی برتے ہیں۔

"ہمیں کیا کرنا چاہیے" لکھنے اور مذہبی بحثیں چھیڑنے کے بعد تالستائی کو خالص ادبی تصانیف کے لیے بہت کم مہلت ملتی تھی اور اگر ادبی شوق اس کی رگ رگ میں نہ ہوتا تو شاید "آننا کارنین" کے بعد کوئی ناول یا افسانہ تک لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ آخر میں تو یہ ہوا بھی کہ اس کی اصلاحی کوششوں اور عدم تشدد کی تعلیم نے انگلستان کی پارلیمنٹ اور پیرس کی رنگینی کی طرح تالستائی کی روحانیت کو ایک چیز بنا دیا جس پر تعجب کرنے کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور سوالات اور مباحثوں کی بھرمار نے ایک طرف اور سیاسی مسایل نے دوسری طرف تالستائی کو ایسا مبتلا اور مصروف رکھا کہ وہ بس انھیں کا ہو رہا۔ معلوم نہیں اس سے انسانیت گھاٹے میں رہی یا فائدے میں۔ یورپ کے چند حساس اور برگزیدہ لوگوں پر تو اس کی فنی، اخلاقی اور دینی تعلیم کا بہت گہرا اثر ہوا، مگر عدم تشدد کی تعلیم ایسی تھی کہ جس کو عملاً صحیح ثابت کرنا تالستائی کے بس کی بات نہ تھی اور "سچی عیسائی زندگی" کا جو معیار اس نے قایم کیا تھا اس کا نباہ خود اس کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ پھر تالستائی ایسا قدامت پسند تھا اور لبرل اور انقلابی تحریک کی اس نے ایسی سختی سے مخالفت کی کہ انھیں جوشیلے اور بکار پرداز لوگوں کی طبیعتیں اس سے پھر گئیں جن پر اسے دراصل بھروسا کرنا چاہیے تھا۔ تالستائی ادب ہی کو اپنا میدانِ عمل سمجھتا تو شاید یہ

عداوت پیدا نہ ہوتی اور اس کی ادبی عظمت اس کی قدامت پسندی اور نصیحت کے شوق پر احترام کا پردہ ڈال دیتی۔

تالستائی کی زندگی کا سب سے افسوس ناک پہلو وہ خاندانی کشمکش ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ عقیدے کے مطابق رہن سہن بدلنے کی خواہش پہلے تو تالستائی کی اپنی روحانی کیفیت کا عکس تھا، لیکن ہوتے ہوتے یہ ایک ایسا فرض بن گیا کہ جسے تالستائی انجام نہ دیتا تو دنیا میں اس کی ہنسی اُڑائی جاتی۔ مگر اس کی بیوی اور اولاد پر اس کے خیالات کا آخر تک کوئی خاص اثر نہ ہُوا، وہ اپنی پرانی وضع پر قایم رہے اور تالستائی کی بیوی خاص کوشش کرتی رہی کہ وہ بھی پُرانی وضع کو نہ چھوڑے۔ اس وجہ سے اکثر ایسے موقعے پیدا ہوتے رہے جن سے تالستائی کو صدمہ بھی پہنچتا اور ندامت بھی ہوتی۔ مرنے سے چند روز پہلے تالستائی نے اپنی بیوی کے نام خط لکھ کر رکھ دیا اور چپکے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔ سفر کے دوران ہی میں اسے بخار آیا اور ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے مسافر خانے میں اس کا انتقال ہُوا۔ عقیدے پر عمل کرنے کی آزادی کا یہ مظاہرہ جو اس نے گھر والوں کے خلاف کیا ایک لمبی اور عبرت انگیز کشمکش پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی۔

نواں باب

وسے ولود میخائلو وچ گارشن

(۱۸۵۵ - ۱۸۸۸)

گارشن اپنے خاندان، تربیت، تعلیم اور طبیعت کے لحاظ سے اپنے زمانے کے خوش حال روسیوں کا ایک مثالی نمونہ تھا، مگر مزاج کی چند خصوصیتوں نے اس کی زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ان خفیف مسرتوں اور اس ذرا سے سکون سے بھی محروم رہا جو مایوسی اور ندامت کے اس دور میں تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں کو کبھی کبھی نصیب ہو جاتا تھا۔ ابھی اس کی تعلیم ختم ہوئی نہیں تھی کہ ترکی اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی (۱۸۷۶) اور گارشن ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اگست ۱۸۷۷ میں وہ ایک معرکے میں زخمی ہوا اور چار دن تک ایک مردہ ترک کے پہلو میں پڑا کراہتا رہا۔ ہسپتال میں پہنچ کر جب وہ اس قابل ہوا تو اس نے اپنی سرگزشت ایک افسانے

کی شکل میں لکھی جس کا عنوان "چار دن" تھا، اور اس ایک قصے نے اسے ادبی دنیا میں مشہور کر دیا۔ صحت پانے کے بعد اس نے انشا پردازی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا اور اسے خاصی کامیابی ہوتی رہی۔ مگر اس کی طبیعت میں قوت برداشت بالکل نہیں تھی اور اس پہ آفت یہ تھی کہ وہ بہت نازک مزاج اور حساس بھی تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی طبعی مایوسی اور خون جنون کی حد تک پہنچ گیا اور جب اس کے ایک عزیز دوست کو پھانسی دے دی گئی اور اسی کے ساتھ چند اور واقعات ہوئے جن سے اس کے دل کو سخت چوٹ لگی تو اسے جنون کا ایک شدید دورہ ہوا۔ اسی میں وہ مکان کے زینے سے نیچے کود پڑا اور تین چار روز بعد مر گیا۔

۱۸۷۶ کی لڑائی میں گارشن اس سبب سے نہیں شریک ہوا تھا کہ اسے وطن سے محبت یا ترکوں سے نفرت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ان مصیبتوں سے بچے رہنے کا کوئی حق نہیں جن میں ہزاروں بے گناہ خواہ مخواہ مبتلا کر دیے گئے ہیں اور یہ نقطۂ نظر اس کی سیرت کے سب سے اہم پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نے جس فضا میں نشو و نما پائی وہ ندامت، مایوسی اور پشیمانی سے معمور تھی اور اس فضا نے درد اور ہمدردی کے جذبے کو اس کے لیے سوہان روح بنا دیا۔ روسی انشا پردازی میں حزن اور مایوسی کی ہر کیفیت پائی جاتی ہے، مگر مرغ بسمل کی طرح لوٹنا اور تڑپنا گارشن ہی کا حصہ ہے۔ "چار دن" میں اس نے

بڑی سادگی سے ایک سپاہی کی تکلیفیں بیان کی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک بے زبان سپاہی بیان کرتا ہے جس میں شکایت کرنے کی جرأت نہیں ہے! اور جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ لڑکر ایک دوسرے کا خون کیوں بہاتے ہیں اور اسے وطن اور عزیزوں سے چھڑاکر اس کشت و خون میں شریک کرنے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک اور افسانے میں جس کا عنوان "بزدل" ہے گارشن نے یہی داستان ذرا انداز بدل کر سنائی ہے۔ اس قصے میں ایک نوجوان جو جنگ کو اخلاقی جرم مانتا ہے لڑائی میں شریک ہوکر اپنی جان دے دیتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی گارشن کی طرح اپنے آپ کو ایک وبا سے جس میں لاکھوں معصوم جانیں ضایع ہو رہی تھیں محفوظ رکھنا بزدلی اور نامردی سمجھتا ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اپنی جان بچا لینے میں کوئی مصلحت نہیں ہو سکتی، اس کے سامنے ایک تندرست اور خوبصورت دوست کی مثال ہے جو کسی لڑکی پر عاشق ہوکر زندگی سے ایسا بیزار ہو گیا کہ ایک معمولی مرض کو بڑھاتے بڑھاتے مہلک بنا لیا۔ اس کی معشوقہ کا انجام اس سے کچھ بہتر نہیں ہوا کیوں کہ جب اس نے اپنی بے التفاتی کا دردناک انجام دیکھا تو اس کے دل کی کیفیت ایک بجھے ہوئے چراغ کی سی ہو گئی جس میں کوئی آرزو اور کوئی امید روشنی پیدا نہ کر سکی۔

گارشن کے سب سے مشہور افسانے "سرخ پھول" اور "اتالیہ پرنسپس[1]"

---

[1] تاڑ کی ایک قسم جو جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے۔

ہیں۔ "سرخ پھول" ایک دیوانے کا قصّہ ہے جسے پاگل خانے کے باغ میں تین سرخ پھول نظر آئے اور انھیں دیکھتے ہی اسے یقین ہو گیا کہ یہ پھول دنیا کی کل برائی کے مجسمے ہیں، اگر وہ توڑ ڈالے جائیں اور ان کے بیج زمین پر نہ گرنے پائیں تو دنیا سے برائی بالکل مٹ جائے گی۔ وہ ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ یہ پھول بہت زہریلے ہوں گے اور کوئی تعجب نہیں اگر انھیں توڑ کر کپڑوں میں چھپانے سے انسان کے جسم میں زہر پھیل جائے اور وہ ہلاک ہو جائے۔ مگر وہ ایثار پر آمادہ ہے۔ وہ بڑی چالاکی سے رات کو محافظوں کی آنکھ بچا کر ایک ایک کر کے تینوں پھول توڑ لیتا ہے اور انھیں اپنے سینے میں چھپا لیتا ہے۔ آخری پھول توڑنے کے لیے اسے سردی میں اٹھ کر چوروں کی طرح دیواروں پر چڑھنا اور کھڑکیوں سے نیچے کودنا پڑا اور اس مہم سے واپس ہونے کے بعد اس کے قویٰ نے بالکل جواب دے دیا۔ سویرے جب اس کے محافظ اسے دیکھنے آئے تو وہ مرا پڑا تھا، مگر اس کے چہرے پر شگفتگی اور رونق تھی جو پہلے کبھی نہیں دکھائی دی تھی اور معلوم ہوتا تھا کوئی گہری مسرت اس کے منہ کو بوسہ دے گئی ہے۔ اس قصّے کو ہم واقعہ نگاری سمجھیں یا استعارہ، اس کی خوبی اور عبرت انگیزی ظاہر ہے اور اس کے درد اور طنز کا کانٹا دل میں ایسا چبھ جاتا ہے کہ پھر نکالے نہیں نکلتا۔ گارشن خود کچھ دن پاگل خانے میں رہا تھا اور اس افسانے میں اس نے

وہی فضا پیدا کر دی ہے۔ اپنے دیوانے ہیرو کی طرح گارشن بھی تمام عمر دنیا کو بُرائیوں سے پاک کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا تھا اور یہ قصّہ بالکل آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ قصّے کے ادبی اوصاف بھی بیان کے محتاج نہیں، لیکن ایسے جنوں آموز حزن کی تاب لانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

"اتالیہ پرنسپس" میں بھی درد اور مایوسی کا وہی عالم ہے جو "سُرخ پھول" میں۔ نباتیات کے ایک روسی ماہر نے جنوبی امریکا سے تاڑ کے ایک درخت کو لا کر اپنے باغ میں لگایا اور اسے سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک شیشے کے گرم خانے میں رکھا۔ یہ تاڑ کی ایک بہت نایاب قسم تھی اور لوگ اسے دور دور سے دیکھنے کو آئے۔ ان میں سے ایک جنوبی امریکا کے اس خاص علاقے کا رہنے والا تھا جہاں سے تاڑ کا درخت لایا گیا تھا۔ درخت کو دیکھتے ہی وطن کی یاد نے اس کو ایسا بے قرار کر دیا کہ پردیس میں ایک لمحہ اور گزارنا اسے گوارا نہ ہوا اور وہ فوراً وطن روانہ ہو گیا۔ ایسے ہی کسی جذبے نے تاڑ پر بھی اپنا جادو کر دیا۔ اس نے اپنا سر اُٹھایا اور بڑھتے بڑھتے گرم خانے کی چھت تک پہنچ گیا۔ ماہر نباتات کو خوف ہوا کہ گرم خانے کی چھت پھٹ پڑے گی اور اسی وجہ سے اس نے درخت کو کٹوا کر باہر پھنکوا دیا۔ یہ انجام ہوا

بیچارے درخت کی آرزوؤں اور کوششوں کا اور یہ حقیقت تھی ان لوگوں کی قدر دانی کی جنھوں نے اسے اپنی اصل سرزمین سے جدا کرکے پردیس میں ایک اعجوبہ بنا کر رکھا تھا۔

گارشن کا شمار روس کے سربرآوردہ انشا پردازوں میں نہیں ہوتا اور دراصل وہ اس کا مستحق بھی نہیں ہے۔ اس کے تخیل میں قوت کی کمی اور درد کی بہت زیادتی تھی، زندگی کی جو تصویریں وہ دکھاتا ہے ان پر ایک مردنی چھائی ہوتی ہے جسے برداشت کرنا آسان نہیں اور اسے برداشت کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ خاکساری، ایثار، دوسروں کے درد کو اپنا درد بنا لینا بلند اخلاقی اوصاف ہیں لیکن گارشن کے فلسفے میں وہ زندگی کی بنیاد نہیں ہیں بلکہ زندگی کو برباد کرتے ہیں۔ گارشن نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، اس کے کیرکٹر گھڑے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن دنیا میں بیماری ہے تو تندرستی بھی ہے، اگر کسی جماعت میں اتفاق سے اکثریت بیماروں کی ہو جائے تب بھی تندرستی ہی کو سب کا نصب العین اور سب کے لیے دائمی حقیقت کا مظہر ہونا چاہیے۔

ولادیمیر گلاکتیونووچ کورولینکو

(۱۸۵۳ - ۱۹۲۱)

کورولینکو گوگول کا ہم وطن یعنی روس کے جنوب مغربی صوبے اوکرائن کا رہنے والا تھا۔ اوکرائن کی زبان روسی سے جدا ہے اور

یہاں کے لوگ صورت اور سیرت میں روسیوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں ہمیشہ سے قومیت کا ایک جذبہ موجود ہے جو ان کے اور روسیوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرتا رہا ہے۔ لیکن گوگول کی طرح کورولینکو کی تعلیم بھی روس میں ہوئی اور اس کی زبان بہت شستہ اور فصیح ہے۔ اپنے سیاسی خیالات کی بنا پر کورولینکو پیٹر برگ کے مدرسۂ صنعت وحرفت اور پھر ماسکو کے مدرسۂ زراعت سے نکالا گیا اور ۱۸۷۹ میں ملک بدر کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ چھ سال کے بعد اسے روس واپس آنے کی اجازت ملی، اور اسی وقت اس کی پہلی قابل قدر تصنیف، ایک لمبا افسانہ جس کا عنوان "ماکار کا خواب" تھا، شایع ہوا۔ دس برس تک کورولینکو افسانہ نویسی میں مشغول رہا اور اس نے خاصی مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی، مگر پھر وہ انشا پردازی ترک کر کے پولیس اور نظام عدالت کی اصلاح کی فکر میں پڑ گیا، اور آخر عمر تک بس ایک ناول اور لکھ سکا جو اس کی آپ بیتی ہے۔ کورولینکو بولشیوک پارٹی کا ہم خیال نہیں تھا، مگر اس نے بولشیویکوں کی عملی مخالفت بھی نہیں کی۔

کورولینکو سیاسی معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور اس کا میلان انتہا پسندی کی طرف تھا، لیکن اس کے افسانوں میں اس کے سیاسی خیالات کا عکس بہت کم نظر آتا ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات تورگینیف کے عقائد سے بہت ملتا جلتا ہے اور تورگینیف کی طرح

وہ بھی چاہتا ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے قدرتی ماحول کو ایک شعر کے دو مصرعے بنا دے۔ اس کا یہ رنگ بہت پسند کیا گیا، اس وجہ سے کہ جس زمانے میں کورولینکو نے ادب کے میدان میں قدم رکھا، اس وقت تورگینف کا دوبارہ چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن کورولینکو محض ایک مقلد کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے بیان میں شاعرانہ انداز کے ساتھ ایک ظرافت پائی جاتی ہے جو تورگینف کی تصانیف میں نہیں ملتی اور وہ اس حزن سے بھی نا آشنا معلوم ہوتا ہے جو تورگینف کے تخیل پر چھایا ہوا تھا۔ در اصل کورولینکو اپنے اوکرائنی ہمنس رہ گوگول سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، اگرچہ اسے گوگول کا جوش اور جولانیت اور تخیل کی فراوانی نصیب نہیں ہوئی۔ مگر دوسری طرف کورولینکو کی ظرافت مردم بیزاری کے دھبّے سے بالکل پاک ہے اور اس کو انسان کی خلقی نیکی کا اتنا گہرا اور سچّا اعتقاد ہے کہ اس کے افسانے پڑھنے والے کو مایوس یا مغموم نہیں کرتے اور اس اعتبار سے وہ روسی انشا پردازوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

"مکار کے خواب" میں کورولینکو نے شمال مشرقی سائبیریا کے مناظر کی کیفیات بیان کی ہیں۔ افسانے کا ہیرو اس علاقے کی ایک نیم وحشی قوم "یاقوت" کا ایک آدمی ہے۔ کورولینکو نے اس کی طبعی خود غرضی کو واضح کیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ دکھایا ہے کہ اس خود غرضی کی تنگ و تاریک فضا میں انسانیت اور اخلاقی بے غرضی کا

چراغ بھی ٹمٹمار ہا ہے۔ "بُری صحبت" میں مناظرِ قدرت کا عکس اُتارنے میں کمال دکھایا گیا ہے، مگر اس کے پلاٹ اور کیرکٹروں میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ "رات"، "یومِ جزا" اور "بے زبان" کورولینکو کی ظرافت کے بہترین نمونے ہیں۔ "رات" میں بچّوں کی ایک شبانہ مجلس کی کارروائی بیان کی گئی ہے، جس میں وہ بیٹھ کر اس اہم مسئلے پر رائے زنی کرتے ہیں کہ بچے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ "یومِ جزا" ایک عیسائی کی سرگزشت ہے جسے شیطان نے ایک سود خوار یہودی کے شبہے میں جہنم پہنچا دیا، کیوں کہ عیسائی میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو سود خوار یہودی کو واصلِ جہنم کرنے کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں۔ "بے زبان" تین اوکرائنی مزدوروں کا قصّہ ہے جو کسبِ معاش کے لیے امریکا گئے۔ انھیں اپنی زبان کے سوا اور کوئی بولی آتی نہیں تھی، اور اس سبب سے نہایت ہی مضحکہ خیز وارداتیں پیش آئیں۔ کورولینکو کی بہترین تصنیف اس کا آخری ناول ہے، جس کا عنوان "میرے زمانے کے ایک صاحب کی سوانح عمری" ہے۔ اس میں اس کے سارے کمالات، مناظرِ قدرت کی مصوری، ظرافت، انسانیت اور نوعِ انسانی سے عقیدت مندی، سب یک جا ہو گئے ہیں اور اس کی انشا پردازی کا حسن نکھر آیا ہے۔

دسواں باب

آنتون پافلووچ چیخوف - (۱۸۶۰-۱۹۰۴)

چیخوف کے اجداد جنوبی روس کے شہر تگن روگ کے تاتار تھے، جو پہلے مسلمان تھے اور بعد کو عیسائی ہو گئے۔ اس کا دادا ایک زرعی غلام تھا، مگر اس نے روپیہ پیدا کر کے اپنی آزادی خرید لی اور چیخوف کے باپ نے دادا کے قایم کیے ہوئے کاروبار کو بہت ترقی دی۔ چیخوف کا بچپن خوش حالی میں گزرا، لیکن وہ اسکول ہی میں تھا جب باپ نے کاروبار میں بہت نقصان اُٹھایا اور چیخوف کو اسکول میں چھوڑ کر سارا خاندان ماسکو چلا گیا۔ ۱۸۷۹ میں چیخوف بھی فارغ ہو کر ماسکو پہنچا اور وہاں کے دارالعلوم کے شعبۂ طب میں داخل ہو گیا۔ خاندان کی مالی دشواریاں رفع کرنے کی نیت سے اس نے طالب علمی کے زمانے میں انشاپردازی کی مشق شروع کر دی اور شہر کے معمولی قسم کے اخباروں اور رسالوں میں اس کے مزاحیہ افسانے

شایع ہونے لگے۔ اس نے جب سند حاصل کی تو اس شغل سے اس کو خاصی آمدنی ہونے لگی تھی، اس لیے طبابت کرنے کی جگہ اس نے افسانہ نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ ۱۸۸۶ میں اس کا تعارف ایک مشہور نقاد گریگوروویچ اور ماسکو کے سب سے بڑے روزنامہ اخبار کے مدیر سووورن سے ہوگیا۔ گریگوروویچ کی سرپرستی کی بدولت روس کی ادبی دنیا میں چیخوف کی ایک خاص حیثیت ہوگئی اور جب سوورن اس کے افسانے اپنے اخبار میں شایع کرنے لگا تو چیخوف کو نفیس مذاق اور وسیع نظریہ رکھنے والے قدرداں مل گئے، جن کی نکتہ رسی ہر صاحبِ ہنر کو اپنے جوہر دکھانے کا حوصلہ دلاتی ہے۔ چیخوف نے مسخرے پن کا وہ انداز جو اس نے ادنیٰ اخباروں کی خاطر اختیار کیا تھا چھوڑ دیا، اور رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں وہ خاص رنگ پیدا ہوگیا جو اس کی امتیازی صفت ہے۔ ۱۸۸۷ میں اس کا پہلا ڈراما دکھایا گیا، مگر ڈراما نویس کی حیثیت سے وہ اسی وقت مقبولِ عام ہوا جب ماسکو آرٹ تھیٹر نے اس کے ڈرامے دکھانا شروع کیا[1]۔

۱۸۹۰ میں چیخوف سخالن کے جیل جانے اور سزا یافتہ مجرموں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لیے مشرقی سائبیریا گیا اور "سخالن" کے عنوان سے اپنی رپورٹ شایع کی، جس کا ریاست اور عام تعلیم یافتہ

[1] چیخوف کے ڈراموں کا مفصل ذکر "روسی ڈراما" کی تحت میں ہو چکا ہے۔

روسیوں پر بہت اثر ہوا۔ ۱۸۹۱ میں ماسکو کے قریب کئی ضلعوں میں قحط پڑا اور پھر انھیں ضلعوں پر ہیضے کا بہت شدید حملہ بھی ہوا۔ ان دونوں موقعوں پر چخوف نے مصیبت زدوں کی بڑی جاں فشانی سے خدمت کی۔ جب اس کی مالی حالت سنبھل گئی تو اس نے ماسکو سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک مکان مول لیا اور ایک نو آبادی کی بنا ڈالی جسے وہ دیہاتی بستیوں کا مثالی نمونہ بنانا چاہتا تھا اور جس کی ترقی کے خواب وہ عمر بھر دیکھتا رہا۔ وہ آس پاس کے کسانوں کا علاج کرتا تھا اور دوائیں مفت تقسیم کرتا تھا، اس کے علاوہ اس نے ایک اسکول بھی قایم کیا اور گانو کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے گرجا میں ترمیمیں کرائیں۔ اس کا آبائی شہر تگن روگ اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ وہاں بھی وہ ایک کتب خانہ، ایک ادبی عجائب خانہ اور تاجروں کو ہر طرح کی معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے کے لیے ایک دفتر یادگار چھوڑ گیا۔

چخوف کو جوانی سے کھانسی کی شکایت شروع ہو گئی تھی اور بلغم کے ساتھ اکثر خون بھی گرا کرتا تھا۔ یہ شکایت دق کا پیش خیمہ تھی، لیکن چخوف نے اس کی مطلق پروا نہیں کی اور اپنے عزیزوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے مرض کو حتی الامکان چھپاتا رہا۔ ۱۸۹۷ کے بعد اس کی حالت بہت خراب ہو گئی اور اس کی زندگی کے بقیہ سات سال زیادہ تر علاج کرنے میں صرف ہوئے۔ اس زمانے میں

بھی اس کے ادبی مشاغل جاری رہے اور اس کے ڈراموں نے اسے خاص طور پر ہر دل عزیز کر دیا۔ ۱۹۰۴ میں اس کا ڈراما "چیری کا باغ" دکھایا گیا تو ناظرین پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی اور تماشے کے بعد جب دستور کے مطابق مصنف اسٹیج پر بلایا گیا اور اس کی صورت دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ وہ صرف چند دن کا مہمان ہے تو پورے مجمع کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی کے تھوڑے دن بعد چیخوف کا جنوبی جرمنی کی ایک صحت گاہ باڈن وائلر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے ماتم میں ایک روسی قوم نہیں بلکہ ساری مغربی دنیا شریک تھی اور اس کا جنازہ اس دھوم سے اٹھا کہ دستہ نفسکی کے سوا کسی اور کا نہ اٹھا ہوگا۔

۱۸۹۰ کے بعد چیخوف نے کئی مرتبہ یورپ کا سفر کیا، عام طور سے اس کا ملنا جلنا متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں سے رہتا تھا اور اس کے افسانوں میں زیادہ تر انھیں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے ہیں۔ یورپی تہذیب اور اس تہذیب کے مارے ہوئے تعلیم یافتہ روسیوں سے تعلق رکھنے کے باوجود کسانوں، مزدوروں اور ادنی قسم کے تاجروں کی بہبودی کی ایسی فکر رکھنا جیسی کہ چیخوف کو تھی ذہنی اور روحانی صحت کی روشن دلیل ہے۔ چیخوف کی تصانیف پر غور کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ نہایت نیک دل، ہم درد، مخلص اور بڑی محبت کا آدمی تھا اور اس کے دل میں انسانی

زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کے بڑے حوصلے تھے۔ وہ بہت ملن سار اور مہمان نواز تھا اور لوگوں کی ہر طرح مدد کرنے میں اُسے بہت مزہ آتا تھا خاندان کی پرورش کا بار تمام عمر اسی کے ذمے رہا، اور یہ ذمہ داری اس نے خوشی سے منظور کی اور بہت مستعدی اور محبت سے پوری کرتا رہا۔ اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ دوسروں پر حاوی ہو جائے، لیکن اس کی مردم دوستی سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی، روس کے بہت سے نوجوان انشاپرداز اس کی سرپرستی سے فیض یاب ہوئے، اور جن لوگوں کی شہرت پہلے سے قایم تھی انھیں اس کے ادب اور احترام نے خوش رکھا، تالستائی سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے، تالستائی نے کئی خطوط میں اس کی تعریف کی ہے، اور اس کے ایک افسانے پر تبصرہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چخوف کو انسانی سیرت کا عکس اُتارنے میں کیسا ملکہ تھا اور تالستائی کی نظر کیسی نکتہ بیں تھی۔

چخوف افسانہ نویسی کے ایک نئے اور نرالے طرز کا موجد مانا جاتا ہے جو زندگی کی کیفیات اور انسان کے احساسات بیان کرنے کے لیے اس قدر موزوں ہے کہ اس نے فنِ افسانہ نویسی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سب سے نمایاں خصوصیت اس نئے طرز کی یہ ہے کہ اس میں قصّہ سنانے کا خیال بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ دوسرے روسی انشاپردازوں کی طرح چخوف بھی داستان کو معنی خیز بنانے

کے لیے غیر معمولی حادثوں کا سہارا نہیں ڈھونڈھتا تھا، اس کے قلم میں معمولی واقعات اور احساسات کو اس صفائی اور وضاحت سے پیش کرنے کی قدرت تھی کہ اس کے افسانے سیدھی سادی حقیقت ہی کی بدولت لطیف اور دل کش ہو جاتے ہیں۔ عام طور سے چیخوف افسانے کے لیے اپنے ہیرو یا ہیروین کی سرگزشت کا کوئی ایسا موقع یا واقعہ منتخب کرتا ہے جو ایک مثالی نمونہ قرار دیا جا سکے، اور اس کو وہ ایک شمع بنا دیتا ہے جس کی روشنی میں اس کے ہیرو کی ساری زندگی اور تمام مزاجی اور روحانی کیفیتیں آپ ہی آپ نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے طرزِ بیان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ہم اس فضا سے گھر جاتے ہیں جس کا عکس اُتارنا چیخوف کا مقصد ہوتا ہے، یہاں تک کہ چیخوف کے فنی کمالات کو ہم اپنی نظر کی گہرائی اور ادراک کی خوبی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس نے خواہ کتنی ہی نازک بات پیدا کی ہو، ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر پہلے ہی اس پر پڑ گئی تھی اور ہم چاہتے تو اسے خود بھی اسی طرح بیان کر دیتے۔ ایسے ہی وہ ہزاروں اپنے اپنے رنگ کی نرالی طبیعتیں رکھنے والے لوگ جن سے چیخوف ہمارا تعارف کراتا ہے سب اپنے جانے بوجھے دوست آشنا معلوم ہوتے ہیں، جن کے حلیے اور سراپے سے ہم بخوبی واقف ہیں، جن کی سیرت اور خصلت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں، جو کچھ ان پر گزری وہ ہمارا سُنا ہوا قصہ ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے لیے کوئی راز نہیں۔ چیخوف نہ تو خط و خال کی باریکیوں پ

جان دیتا ہے، جو عہدِ مغلیہ کے مصوّروں کا دستور تھا اور نہ اصلیت سے قطع نظر کر لیتا ہے جیسا کہ یورپ کے جدید مصور کرتے ہیں۔ بعض نقاد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی دنیا میں دھوپ چھاؤں نہیں، دن رات نہیں، بس ایک جھٹپٹا سا رہتا ہے جس میں کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی، اسی وجہ سے اس کی تصویروں میں کوئی رنگ نہیں، جو صورتیں اس نے بنائی ہیں وہ دھندھلی اور سب ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک حد تک تو یہ اعتراض درست ہے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ روس اور تمام یورپ میں طریقۂ تعلیم، معاشرتی انقلابات اور سیاسی اور اخلاقی دباؤ نے یک رنگی کو ایک وبا بنا دیا ہے، نرالے اوصاف کے لوگ ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتے اور زندگی کا ایسا مصور جو ذہنی اور اخلاقی فضا کی ہر کیفیت سے متاثر ہوتا ہو حقیقت کا اتنا پابند ضرور ہو جاتا ہے کہ اس یک رنگی کو ہر جگہ دکھائے۔ یورپ کی زندگی کو دیکھتے ہوئے چخوف نے اپنے افسانوں میں پھر بھی بہت کچھ رنگ پیدا کیا ہے، کیوں کہ وہ بہت سی نازک کیفیتوں کو جو دوسرے ملکوں کے ناول نویسوں سے پوشیدہ رہیں بڑی نکتہ رسی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

چخوف کی تصویروں کے دُھندھلے ہونے کی شکایت وہی لوگ کرتے ہیں جو انگریزوں کی طرح ناول اور افسانے کو دراصل حسن و عشق کی دل چسپ داستان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہر صورت اور خصوصاً حسین صورت کسی نہ کسی اعتبار سے نرالی ہوتی ہے

اور عشق کا جذبہ ایسا جامہ زیب ہے کہ ہر لباس اس پر نیا اور اچھا لگتا ہے، لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ عشق بالکل خیالی نہیں تو اس قدر ناپائدار جذبہ ضرور ہوتا ہے کہ اسے زندگی کی حقیقتوں میں شمار کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے، اس کی بدولت داستان چٹپٹی ہو جاتی ہے، مگر اور بہت سے احساسات جو اتنے ہی لطیف اور رنگین ہیں بیان سے محروم رہ جاتے ہیں، اور اس لحاظ سے یک رنگی کا اعتراض چخوف سے زیادہ ان انشا پردازوں پر عائد ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کو طرح طرح سے حسن و عشق کے شعبدے دکھا کر لبھاتے ہیں۔ چخوف ہر شخص کو عاشق یا معشوق نہیں سمجھتا، اس نے انسان کے احساسات کو ایک جذبے تک محدود نہیں رکھا، ایک ہی تصویر کو پس منظر اور گرد و پیش بدل بدل کر نہیں دکھایا۔ ظاہر ہے انسانی زندگی کا ہر پہلو اتنا رسیلا نہیں ہوتا جتنی حسن و عشق کی کشمکش، لیکن حقیقت نگار کی نظر پوری حقیقت پر ہونا چاہیے اور چخوف نے حقیقت کو مدِ نظر رکھنے کے علاوہ اس میں ایسی جان ڈال دی ہے کہ جو کچھ وہ بیان کرتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یا دیکھ چکے ہیں۔

اسی حقیقت کا ایک رُخ مردوں عورتوں کے تعلقات ہیں۔ ایسے ناول تو بس بہت ہیں جنھوں نے سطحی دلچسپی کی حد سے گزر کر انسانی فطرت کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا ہے اور کسی نہ کسی قیمت کا موتی لے کر آئے ہیں۔ لیکن ایک دو موتیوں سے زیادہ کسی کے ہاتھ نہیں لگے

اور ان کے مشاہدے میں یہ لوگ ایسے محو ہو گئے کہ انھیں اس خزانے کا خیال ہی نہیں رہا جس میں سے وہ ان چند موتیوں کو نکال کر لائے تھے۔ فرانسیسی انشاپرداز عورت کی چالاکی اور لذّت پرستی کے مرقع کھینچنے میں ماہر ہیں اور اس میدان میں کوئی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ انگریز مصنف اب تک محبّت کی داستانیں سُنانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے، لیکن اب وہ اس سے کچھ اکتا گئے ہیں اور جدید ترین ناول نویس عورتوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ نسوانی سیرت کا پورا حق دراصل صرف روسی ادا کر سکے ہیں۔ ان کی معاشرت کا کئی صدیوں سے کچھ ایسا رنگ رہا ہے کہ وہ اخلاقی پابندیاں جو دوسرے ملکوں میں معیار کا کام دیتی ہیں ان کے یہاں تسلیم ہی نہیں کی گئیں، جنسی جذبات ان کے نزدیک اسی قسم کی قدرتی خواہشیں ہیں جیسی بھوک اور پیاس اور کسی نے غلطی سے یا جان بوجھ کر کوئی بے قاعدگی یا زیادتی کی تو وہ اس کے عمل کو فلسفیانہ غور و فکر کا موضوع نہیں بناتے اور نہ اُسے اخلاقیات کے کانٹے پر تول کر رتی ماشے کا فرق نکالتے ہیں۔ وہ عشقِ مجازی کو اس طرح نہیں دکھاتے کہ پڑھنے والا دھوکے سے اس کو حقیقی سمجھ لے اور نہ لذّت پرستی کو ایسا سنوارتے ہیں کہ لوگ خواہ مخواہ اس پر فریفتہ ہو جائیں اور ضبطِ نفس کو بدمذاقی یا بے حسی سمجھنے لگیں۔ چخوف اس اعتبار سے بھی سچّا روسی تھا، اس نے نسوانی سیرت کی کسی خصوصیت کو مرکزی حیثیت

نہیں دی ہے، اس نے عورت کو کسی صفت یا کسی عیب کا مجسمہ نہیں ٹھیرایا ہے، اس کے افسانوں کے نسوانی کیرکٹر سب انسان ہیں اور انسانوں میں جو طرح طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں وہ ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اپنے فرانسیسی ہم چشم موپاساں (۱۸۵۰ - ۱۸۹۳) کی طرح چخوف عورتوں سے ڈرنا، نفرت کرنا یا انھیں حقیر اور پست حوصلہ سمجھنا نہیں سکھاتا، اس کا فلسفۂ حیات بہت زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ دوسری طرف وہ عورتوں کو دیویاں بنا کر پوجتا بھی نہیں ہے مگر مرد عورتیں ایک دوسرے کی صورت اور سیرت سے جو اثر لیتے ہیں اس کو وہ نظر انداز نہیں کرتا، جیسے اس کو اور تمام کیفیتیں بیان کرنے میں کمال ہے ویسے ہی وہ اس لگاؤ کو جو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، آغاز محبت کے اس نشے کو جس میں دل و دماغ چور رہتے ہیں، اس بے صبری اور بے چینی اور جدائی کی اُن تکلیفوں کو جو محبت کی دلیل مانی جاتی ہیں بڑے رسیلے اور لطیف انداز سے بیان کرتا ہے۔ اس کے افسانے حسن اور عشق کی شعبدہ بازیوں سے خالی ہیں، مگر اس کے باوجود ان میں ہزاروں دلچسپیاں ہیں اور وہ حقیقت کو ایسے دل آویز پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا نقش دل سے مٹائے نہیں مٹتا۔

سادی اور موثر حقیقت نگاری کے بعد چخوف کی سب سے قابلِ قدر صفت اس کی ظرافت ہے۔ اس نے افسانہ نویسی کی بسم اللہ ظریفانہ قصوں سے کی تھی اور سنجیدہ، متین اور مستند انشا پرداز بننے کے بعد

بھی اس کی ظرافت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، البتہ اس میں ذرا شائستگی آگئی۔ اس کی ظرافت کھری اور سچی ہے، وہ عبارت اور الفاظ کی مدد کی محتاج نہیں، اس کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہوتا جسے صرف روسی زبان جاننے والے سمجھ سکیں، وہ مسخرہ پن سے پاک ہے، اس میں کسی کی تحقیر نہیں کی جاتی اور اس سے کسی کا دل نہیں دکھتا۔ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ہنستے ہنستے دل پر ایک چوٹ سی لگتی اور آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں، مگر عام طور پر جو ہنسی آتی ہے وہ سیدھی سادی بے تکلف ہنسی ہوتی ہے۔ چخوف کسی کی ناکامی یا حماقت کا مذاق نہیں اُڑاتا، کسی خلقی عیب کو اپنی ظرافت کا تختۂ مشق نہیں بناتا، اس کی مردم دوستی ہر حالت میں قایم رہتی ہے اور وہ ہنسا ہنسا کر ہم کو بھی مردم دوست بناتا ہے۔ ان اوصاف کی بدولت اسے دنیا کے تمام ظریفوں میں ایک جداگانہ حیثیت اور خاص مرتبہ حاصل ہے اور بہت کم انشا پرداز اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۱۸۸۸ میں چخوف کو روسی اکادمی کی طرف سے "پشکن پرائز" کا نصف حصہ ملا، اور انعام دیتے وقت اکادمی کے ایک رکن نے اس کی تصانیف پر تنقید بھی کی۔ چخوف کی انشا پردازی کا یہ ابتدائی زمانہ تھا، اس کا شمار نوجوان اور نومشق مصنفوں میں ہوتا تھا، اس لیے فاضل نقاد نے اس کی قدرتی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ بزرگانہ نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھا اور اس پر افسوس

ظاہر کیا کہ "مصنف (یعنی چخوف، جس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ زیر بحث تھا) اپنی استعداد کو ایسی فضول باتوں میں ضایع کرتا ہے جو کم و بیش وقتی اور اتفاقی ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے رستہ چلتے کچھ دیکھ لیا اور اسی کا نقشہ کھینچ رہا ہے یا کسی کی باتوں میں اسے کچھ پسند آیا اور اس نے اسے نقل کر دیا ہے۔......... اس کی زبان میں رس اور فصاحت ہے، اگرچہ کبھی کبھی اس کی تشبیہیں صحیح نہیں ہوتیں اور محاورے غلط ہوتے ہیں۔" چخوف کی زبان روز مرہ بول چال کی زبان ہے، جس میں فصاحت اور بلاغت کو کوئی دخل نہیں اور جو تصنع سے بالکل پاک ہے۔ موضوع کے انتخاب پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ دراصل چخوف کی حقیقت نگاری کی تعریف ہے، اور اکادمی کے فاضل نقاد نے غلط طریقے پر یہ صحیح بات کہی ہے کہ چخوف کے قصے "آورد" نہیں ہیں، "آمد" ہیں۔ اکادمی کے علاوہ چخوف کے خاص انداز پر دوسرے روسی نقادوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایک مشہور اور با اثر نقاد میخائلوفسکی نے اس کے دماغ کو قابل قدر اور اہم تصورات سے اور اس کے دل کو ایمان کے نور سے خالی پایا، "اور جس میں یہ نہیں اس میں ظاہر ہے کچھ بھی نہیں"۔ ایک اور نقاد تھے جنھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ چخوف ایک روز کسی چہار دیواری کے سایے میں شراب کی بو میں بسا ہوا مردہ پڑا ملے گا۔ ان دونوں حضرات کا مطلب یہ تھا کہ چخوف نے ان گہرے

سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر بحث نہیں کی ہے جن پر غور کرنا ناول نویسوں کا فرض مانا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کا ذکر ناول یا افسانوں کے پیرائے میں نہ کیا جاتا تو سرکاری محتسب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ بے شک چخوف کی انشا پردازی کی ایک خامی تھی، لیکن جو شخص اس کی طبیعت اور قومی خدمات سے ذرا بھی واقف ہوتا وہ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا کہ چخوف کو انسانی زندگی کے سدھارنے اور نوع انسانی کا غم غلط کرنے کا حوصلہ نہیں۔ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے تو بس اس قدر کہ اس نے نصیحت نہیں کی اور نوجوانوں کو جوش نہیں دلایا۔ روسی زندگی کا کوئی مسئلہ چخوف کی نظر سے پوشیدہ یا اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا، خواہ ہم کسانوں کی جہالت اور جمود کو دیکھیں یا تعلیم یافتہ طبقے کا ذہنی ہیجان، بے صبری، تلون مزاجی اور عقیدے پر عمل کرنے کی نااہلی، خواہ ہم انقلاب کے شیدائیوں کے حوصلے دیکھیں یا قدامت پسندوں کی کج فہمی اور خودستائی۔ چخوف کا مقصد قوم کی اصلاح کی کسی خاص تدبیر یا تجویز کو مقبول عام بنانا نہیں تھا اور اسی وجہ سے کہ اس کی نظر محدود نہیں تھی، اس کے ذہن پر کوئی خاص حوصلہ یا جذبہ حاوی نہیں ہو سکا۔ اس کا دل درد سے بھر آتے یا رنج سے نڈھال ہو یا غصے سے کانپ اٹھے، اس کا قلم کبھی نہیں لرزتا، وہ انسانی ہمدردی اور محبت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا اور زندہ دلی اور ظرافت سے فضا

کی گرانی اور داستان کی غمگینی کا بار ہلکا کرتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر گناہ معاف کر دیتے ہیں، ہر عیب سے چشم پوشی کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں اور "جو سب کچھ سمجھتا ہے وہ سب کچھ معاف کر دیتا ہے"۔

چخوف کے منتخب افسانے ڈھائی سو سے کچھ اوپر ہیں۔ ان میں کسی قسم کی ترتیب پیدا کرنا بہت دشوار ہے، اس لیے کہ زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا، انسانی جذبات اور ان کے اثر کی حد بندی کرنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم افسانوں کی نمایاں خصوصیات کے مطابق انھیں تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محض کام چلانے کے لیے ہے۔ کوئی نقاد دو چار نمونے دے کر چخوف کے افسانوں کی تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، چخوف نے افسانہ نویسی کی ابتدا ظریفانہ قصوں سے کی۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا مقصد محض ہنسانا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن میں درد، عبرت یا نصیحت کا پہلو بھی ہے۔ "مقرر" "بھٹکے ہوئے" "سنگ تراشی کا انجوبہ" "تہمت" "فالتو" "دھولنس" وغیرہ خالص ظرافت کے بے مثل نمونے ہیں جن میں حزن، مایوسی یا درد کا ذرا بھی اثر نہیں۔ "مقرر" میں قبرستان کا منظر ہے، ایک صاحب جنھیں بیوی کی بد مزاجی اور شراب پینے کی عادت نے موت کے گھاٹ اُتارا ہے دفن کیے

جا رہے ہیں، اور آخر میں ایک صاحب جو بہت خوش تقریر سمجھے جاتے تھے مرحوم کی نیکیاں بیان کرنے کو کھڑے ہوتے ہیں۔ فاضل مقرر رہنے والے تو اسی جگہ کے تھے، مگر انھیں اطلاع دیتے وقت مرحوم کا نام نہیں بتایا گیا تھا، بلکہ صرف عہدہ اور وہ سمجھے کہ ایک اور صاحب جو پہلے اسی عہدے پر تھے، راہیِ عدم ہوئے ہیں۔ بہر حال اُنھیں تقریر کرنے میں کوئی تکلّف نہیں تھا، ان کی تقریر بہت موثر تھی اور اگرچہ مرحوم کا جو حلیہ اُنھوں نے بتایا وہ غلط تھا اور ان کی زندگی کے جو حالات انھوں نے بتائے وہ بھی غلط تھے، ان کا اندازِ بیان ایسا پُر درد تھا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
اتفاق سے وہ صاحب جنھیں فاضل مقرر سمجھتے تھے کہ زمین کے سپرد کیے گئے ہیں سامعین میں موجود تھے اور تقریر کے سلسلے میں جب ان کا نام آیا تو ان کی حیرت اور غصّے کی انتہا نہ تھی۔ جب فاضل مقرر سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو ظاہر ہے کہ تقریر کی روانی میں خلل پڑ گیا۔ مقرر نے رُک کر اپنے ان دوست سے جو انھیں بلانے گئے تھے، کہا:۔

"ارے بھائی وہ تو زندہ ہے؟"

"کون؟"

"مقرر نے نام بتایا۔

"ہاں وہ تو زندہ ہیں۔ انتقال تو — کا ہوا ہے۔"

اس کے بعد دو چار منٹ اور بحث ہوئی۔ پھر دوست نے کہا:
"ارے بھائی تم رُک کیوں گئے۔ تقریر کرتے رہو۔ وقفہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

مقرر نے قبر کی طرف اشارہ کیا اور ایک نئی تقریر شروع کردی۔
"بھٹکے ہوئے" دو دوست ہیں جن میں سے ایک مہمان ہیں، دوسرے جو ایک کھاتے پیتے وکیل ہیں، وہ میزبان ہیں، اور اپنے دوست کو اپنی بیوی سے ملانے اور اپنا نیا گھر دکھانے کے لیے لائے ہیں۔ گھر ان کا دیہات کی ایک چھوٹی سی بستی میں ریلوے اسٹیشن سے خاصی دور ہے، گاڑی رات کو پہنچی ہے اور رات بھی ایسی کہ سڑک نظر نہیں آتی۔ مہمان کی بھوک پیاس کی شدت سے حالت زار ہے اور میزبان انھیں اپنی بیوی کی محبت اور سلیقے کے قصے سنا کر اور ان کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے گا اس کی تفصیل بتا کر تسلی دیتے ہیں۔ آخر میں بستی دور سے دکھائی دیتی ہے، اور ایک مکان کے پاس ٹھیر کر وکیل صاحب خوش خبری سناتے ہیں کہ لیجیے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ مکان میں ہر طرف اندھیرا ہے، وکیل صاحب اپنی بیوی کا نام لے کر پکارتے ہیں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ پہلے وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی سو گئی ہے۔ پھر خیال ہوتا ہے کہ شاید مذاق کر رہی ہو اور جب وہ پکارتے پکارتے تھک جاتے ہیں تو دوست کے کندھوں پر پیر رکھ کر کھڑکی کے رستے سے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جسے وہ

سمجھتے ہیں کہ ان کی نشست کا کمرا ہے۔ کمرے میں مُرغیاں اور بطخیں بند ہیں جو ان کے پہنچتے ہی شور مچانا شروع کرتی ہیں اور کھڑکی سے اُڑ کر باہر بھاگنے لگتی ہیں۔ وکیل صاحب بہت پریشان ہوتے ہیں، اسی پریشانی نے میں ان کا ہینڈ بیگ جس میں دیا سلائیاں ہیں گم ہو جاتا ہے اور اسے تلاش کرنے میں انھیں اور بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اس دوران میں مرغیوں کا شور ساری بستی کو جگا دیتا ہے، لوگ لالٹینیں اور ڈنڈے لے کر پہنچتے ہیں اور وکیل صاحب اور ان کے دوست کو چور سمجھ کر گھیر لیتے ہیں۔ وکیل صاحب اور ان لوگوں کے درمیان خوب گالی گلوج ہوتی ہے اور اسی سلسلے میں وکیل صاحب کو پتا چلتا ہے کہ ایک چوراہے پر وہ غلط طرف مُڑ گئے اور دوسری بستی میں پہنچ گئے ہیں اور جس مکان کو اندھیرے میں وہ اپنا خیال کر رہے تھے کسی اور کا ہے۔

خالص ظریفانہ قصّوں سے زیادہ دل چسپ وہ افسانے ہیں جن میں چخوف نے ہنسانے کے ساتھ انسانی سیرت کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے، جیسے "لاٹری کا ٹکٹ" "دھونس" "گرگٹ" "انتقام"۔ "لاٹری کا ٹکٹ" میاں بیوی کی لڑائی کا قصہ ہے۔ بیوی نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا، شوہر اس کا نمبر اخبار میں دیکھتا ہے اور چونکہ خاصی بڑی رقم انعام میں ملنے والی تھی، وہ فوراً روپیہ خرچ کرنے کی بہترین صورتوں پر غور کرنے لگتا ہے۔ پھر

اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بیوی کنجوسی کرے گی، یا روپیہ ایسی طرح خرچ کرے گی جس میں کوئی مزہ نہ آئے گا اور اس اندیشہ کی بدولت اس کے دل میں بیوی کی طرف سے ہزاروں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی صورت، عادتیں، شوق، ہر چیز بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔ بیوی بھی اپنی خوش قسمتی کی خبر سُن کر طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگتی ہے، مگر اسے بھی یکبارگی یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر خواہ مخواہ دخل دے کر اس کی ساری تدبیریں اُلٹ دے گا، اور وہ اپنی جگہ پر شوہر سے بیزار ہو جاتی ہے۔ لیکن کھلّم کھلّا جنگ ہونے سے پہلے ہی شوہر اتفاق سے ٹکٹ کے نمبر کو غور سے دیکھتا ہے اور تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے اور انھیں کچھ ملے ہی گا نہیں۔ اس نے بیوی سے یہ کہہ دیا، دونوں کا مزاج آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ اطمینان سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ دونوں طبیعت کے نیک تھے، اب تک ان میں لڑائی نہیں ہوئی تھی، اور اگرچہ غریب تھے مگر خوش رہتے تھے۔ دولت ملتی تو بگڑ جاتے۔

"دھونس" کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے[1]۔ ایک مسافر کرایے کی گھوڑا گاڑی پر بیٹھے ہوئے جنگل سے گزر رہے تھے۔ شام کا وقت اور رستہ سنسان تھا، اکیلے بیٹھے بیٹھے انھیں آپ ہی آپ چوروں اور ڈاکوؤں کے قصے یاد آنے لگے، اور پھر انھیں ڈر لگا

[1] روسی میں افسانے کا عنوان "نمک کی زیادتی" ہے۔

کہ رستے میں انھیں ڈاکو لوٹ کر مار نہ ڈالیں۔ گاڑی بان سیدھا سادا دیہاتی تھا، مگر دیہاتیوں کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ نیک اور بد کی تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور حفظ ما تقدم کے خیال سے انھوں نے اپنے گاڑی بان سے باتیں کرنا شروع کیں، اس سے کہا کہ میرے پاس تین پستول ہیں، میں ایک وقت میں دس ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور اگرچہ دیکھنے میں دُبلا پتلا اور بیمار ہوں، مجھ میں بیل کے برابر طاقت ہے، میں کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں اور کئی کو سزا دلوا چکا ہوں۔ یہ باتیں سُن کر دیہاتی کے کان کھڑے ہوئے اور وہ بار بار مُڑ کر دیکھنے لگا کہ مسافر کہیں پیچھے سے پستول تو نہیں مارنے والا ہے۔ مسافر کا یہ حال تھا کہ گاڑی ذرا بھی ہلتی یا چوں چوں کرتی تو وہ کانپ اُٹھتے تھے اور گاڑی بان کو مرعوب کرنے کے لیے کبھی اپنی طاقت اور کبھی اپنی حکومت کا قصّہ سُنا دیتے۔ ایک مرتبہ گھوڑا ذرا تیز ہو گیا تو وہ سہم گئے اور گاڑی بان سے کہنے لگے کہ دیکھو۔ تمھیں شاید یقین نہ آتا ہو، میں ابھی پستول نکال کر تمھیں دکھاتا ہوں۔ اب گاڑی بان کو ان کے ڈاکو ہونے میں شبہہ نہیں رہا، وہ چیخ مار کر گاڑی سے کود پڑا اور یہ کہتا ہوا جنگل میں بھاگ گیا کہ بھیّا میری گاڑی لے لو، گھوڑا لے لو، مگر جان نہ لو۔ اُدھر مسافر کی سٹی گم ہوئی۔ گاڑی ہانکنا جانتے نہیں تھے۔ جانتے بھی ہوتے تو رستہ نہیں معلوم تھا۔ پہلے وہ بیٹھے رہے

پھر گاڑی بان کو پکارنا شروع کیا۔ وہ پاس ہی جھاڑیوں میں چھپا تھا اور جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور اسے یقین ہو گیا کہ مسافر ڈاکو نہیں ہے تو وہ ڈرتا ڈرتا جھاڑی میں سے نکلا، مسافر نے بہت کچھ تسلّی تشفی دے کر اسے آگے چلنے پر راضی کیا اور اپنی زور آوری اور پستولوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔

"گرگٹ" خوشامدیوں پر ایک لاجواب پھبتی ہے۔ ایک تھانہ دار نئی وردی پہنے اور ایک پولیس کے آدمی کو ساتھ لیے دوپہر کے وقت بیچ بازار سے گزر رہا ہے۔ اتنے میں ایک طرف کچھ شور ہوتا ہے اور دم بھر میں سڑک جو پہلے خالی تھی آدمیوں سے بھر جاتی ہے، تھانہ دار مجمع کی طرف بڑھتا ہے اور ڈانٹ کر پوچھتا ہے کہ تم سب یہاں کیوں جمع ہو گئے ہو۔ مجمع کے بیچ میں سے ایک آدمی اسے اپنی پھٹی قمیص اور خون آلودہ انگلی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھیے اس کتّے نے آپ ہی آپ میری انگلی کو نوچ لیا۔ کتّا بھی اسی کے پاس سہما ہوا بیٹھا ہے اور تھانہ دار فوراً اپنے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ اس کتّے کو لے جا کر مروا ڈالو، یہ لاوارث ہے اور خطرناک ہے۔ لیکن مجمع میں سے کوئی چپکے سے کہتا ہے کہ یہ تو فلاں جنرل کا کتّا ہے، تھانہ دار کے تیور فوراً بدل جاتے ہیں اور وہ اس شخص کو جسے کتّے نے کاٹا تھا ڈانٹنے لگتا ہے کہ تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی، جب ہی تمھیں اس نے کاٹا۔ جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ کتّا کس کا ہے تھانہ دار

کے تیور ایسے ہی بدلتے رہتے ہیں، کبھی وہ مجرم کتے کو مار ڈالنے کا حکم دیتا ہے، کبھی اس بیچارے کو جسے کتّے نے کاٹا تھا للکارتا ہے۔

بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب انسان اپنی غلطی یا کمزوری سے نہیں بلکہ دوسروں کی زیادتی سے مخمصے میں پھنس جاتا ہے اور بہت مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔ "انتقام" میں سگایف نامی ایک شخص جسے قومی اخلاق درست رکھنے کا حوصلہ ہے اپنی بیوی کو بے وفائی کی سزا دینے کے لیے پستول خریدنے جاتا ہے۔ جس وقت دکان دار پستول دکھانا شروع کرتا ہے سگایف کو تصور میں تین لاشیں پھڑکتی نظر آتی ہیں لیکن کچھ ارادے کی کمزوری اور کچھ دکان دار کی باتوں کے سبب سے وہ یہ طے نہیں کر سکتا کہ بیوی اور اس کے آشنا دونوں کو مار کر خودکشی کرے، یا صرف آشنا کو مارے یا صرف اپنی بیوی کو۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جذبۂ انتقام کی جو آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی ہے وہ کسی کو قتل کرنے سے بجھ نہیں سکتی اور وہ پستول کی جگہ بٹیریں پکڑنے کا جال خرید کر دکان سے چلا جاتا ہے۔

افسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں چیخوف کا مقصد خاص طور پر روسی سیرت اور روسی زندگی کی فضا دکھانا ہے۔ ایک لحاظ سے تو اس کا ہر افسانہ اسی تحت میں آسکتا ہے، لیکن یہاں ہمیں بحث ان چند افسانوں سے ہے جن میں معاصر حالات اور ذہنیت

اور روسی زندگی کے وہ مسائل چخوف کا موضوع ہیں جنھیں روسی تہذیب کی نرالی خصوصیات سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ اس صورت میں کہیں اور نظر نہیں آتے۔ "بے مزہ کہانی"، "اچھے لوگ"، "گھر پر"، "بر سرِ راہ" اور "میری سرگزشت" ایسے افسانوں کے مثالی نمونے ہیں۔ ان سب میں درحقیقت چخوف نے وہی نوحہ خوانی کی ہے جو اس سے پہلے کے تقریباً ہر روسی انشا پرداز کی تصانیف میں ملتی ہے، لیکن اپنے خاص طرز پر اور حقیقت کا ایک نیا پہلو روشن کرنے کی غرض سے۔ ان افسانوں کے اشخاص انھیں تعلیم یافتہ زمیں داروں کے بیٹے اور پوتے ہیں جن کے خاکے تورگینف اور گونچروف نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اُتارے تھے، انھیں کی طرح یہ نئی پود بھی تمام عمر یہی سوچتی رہتی ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، انھیں کی طرح یہ بھی استقلال کی نعمت سے محروم ہے، جسمانی جمود اور ذہنی ہیجان نے اسے بھی بے دست و پا کر رکھا ہے، اس کے لیے بھی چین سے دن کاٹنا مشکل ہے اور اس کے دل میں مایوسی اور حسرت کے سوا کوئی جذبہ پنپ نہیں سکتا۔ چخوف نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ روسیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کی آرزوؤں میں قوت نہیں اور یہی ان لوگوں کی سب سے نمایاں خامی ہے جن کا ذکر اس کے افسانوں میں آتا ہے۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہمدردی اور ایک دوسرے کی ہمت افزائی، جو کمزوروں کا سہارا اور ان کی تسلی کا سبب ہے

مؤثر ذریعہ ہو سکتی ہی کسی طرف نظر نہیں آتی۔ چخوف نے نہایت پُر درد اور عبرت انگیز طریقے پر اس بیگانگی کو ظاہر کیا ہی جو انتہائی قرب میں انتہائی فصل پیدا کر دیتی ہی۔ "بے مزہ کہانی" ایک بوڑھے پروفیسر کا شکوہ ہی جنھوں نے تمام عمر علم کی خدمت کی ہی، جن کے سینکڑوں شاگرد ہیں، جو سارے ملک میں مشہور ہیں اور جن کی ہر جگہ عزّت کی جاتی ہی۔ ان کی بیوی انھیں صبح شام ترکاری کا بھاؤ بتایا کرتی ہیں اور خرچ کی تنگی کی شکایت کیا کرتی ہیں۔ ان کا بیٹا فوج میں نوکر ہی، مگر بجائے باپ کو مدد دینے کے وہ اپنی حیثیت قایم رکھنے کے لیے اُلٹا اس سے گزارا وصول کرتا ہی۔ ان کی لڑکی جو بچپن میں ان سے بے حد محبت کرتی تھی اپنی فکروں میں پڑ گئی ہی اور اب اسے باپ سے کوئی مطلب نہیں۔ صبح شام سلام اور رسمی پیار کرنے کے سوا خاندان والوں کو ایک دوسرے سے اور کوئی سروکار نہیں اور بیچارے بوڑھے پروفیسر پر اس سرد مہری اور اغراض کے اختلاف کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہی کہ انھیں اپنے علم پر، اس محنت کے انجام پر جس میں اُنھوں نے زندگی صرف کی ہی اعتبار نہیں رہتا اور دنیا میں ان کا جو آخری سہارا تھا وہ بھی دغا دے جاتا ہی۔ خاندان میں بیوی بچوں کے علاوہ پروفیسر کے ایک دوست کی لڑکی کاتیا بھی ہی جس کا باپ مرتے وقت اسے پروفیسر کے سپرد کر گیا تھا۔ کاتیا سے پروفیسر کو بڑی محبت ہی، لیکن عمر کے تفاوت سے دونوں میں ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی

صلاحیت گم ہو جاتی ہے۔ کاتیا کو ناٹک کا بڑا شوق تھا، مگر شروع جوانی میں اسے ایسی ناکامی اور ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ وہ بیزار ہو کر گھر بھاگ آئی۔ جس زمانے کی بدمزہ کہانی پروفیسر صاحب ہمیں سناتے ہیں اس وقت کاتیا الگ مکان میں رہتی ہے، پروفیسر سے جب ملاقات ہوتی ہے تو وہ پوچھتی ہے کہ کچھ بتائیے کیا کروں اور پروفیسر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دیں۔ کاتیا اپنے غم میں ایسی مبتلا ہے کہ اسے پروفیسر کے غم کا خیال ہی نہیں آتا اور وہ ہر وقت اپنی زندگی کو کارآمد نہیں تو قابلِ برداشت بنانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ آخر میں جب کاتیا پروفیسر سے رخصت ہو کر کہیں چلی جاتی ہے اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ نہ بوڑھے پروفیسر کو کبھی کوئی ہمدم اور غم گسار ملے گا نہ جوان کاتیا کو، تو دل پر مایوسی کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں ہم کسی بے پناہ مصیبت کی داستان کے ورق اُلٹ رہے ہیں، حالانکہ واقعات کو دیکھیے تو اس قصے میں وہ چیز جسے آسمان کا جور و ستم کہتے ہیں بالکل ہے ہی نہیں۔ اسی طرح "اچھے لوگ" ایک بھائی بہن کا قصہ ہے جن میں محبت بہت ہے مگر ساتھ ہی مذاق اور خیالات کا ایسا اختلاف ہے کہ وہ حقیقت میں بیگانہ اور ایک دوسرے سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ آخر میں محبت کے باوجود ان میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے، بہن اپنے دل کے حوصلے پورے کرنے کو بستر کندھے پر رکھ کر کہیں غریبوں کی سیوا کرنے چلی جاتی ہے، بھائی گھر پر رہ کر مضمون نگاری کا شوق پورا کرتا رہتا ہے اور پھر دونوں نہ کبھی

ملتے ہیں نہ ایک کو دوسرے کی خبر ہوتی ہے۔ ایسے ہی ڈرامے کی تمہید "گھر پر" ہے، جس میں ایک ہونہار، حوصلہ مند اور سلیقہ شعار لڑکی کا تعلیم سے فارغ ہو کر گھر واپس آنا دکھایا گیا ہے۔ لڑکی گھر پہنچ کر اپنے عزیزوں سے بڑی محبت سے ملتی ہے اور اس کی بہت خاطر کی جاتی ہے، مگر چند روز بعد جب وہ ایک بچی کو جو گھر میں نوکر ہے پٹتے دیکھتی ہے اور آس پاس کے لوگوں سے ملاقات کرنے پر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی ذرا بھی مہذب اور دلچسپ نہیں تو اس کی کیفیت بالکل بدل جاتی ہے اور اپنی تنہائی اور زندگی کی یک رنگی سے نجات پانے کے لیے وہ ایک ڈاکٹر سے شادی کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں، نہ ڈاکٹر میں کشش پیدا کرنے والی کوئی خوبی ہے اور ایسے میاں بیوی کی زندگی جیسی ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے، خصوصاً جب جی بہلانے کو کوئی شغل بھی نہ ہو۔ بعد کی سرگزشت افسانے میں بیان نہیں ہوتی۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

"برسرِ راہ" کا موضوع روسی سیرت کا وہ نمونہ ہے جس کی مثال تورگنیف نے رودن کی شخصیت میں پیش کی ہے۔ رودن کی طرح چخوف کا ہیرو لیخارِف بھی بہت وجیہ آدمی ہے۔ اس کی جوشیلی طبیعت اور ایثار اسے تن دہی اور خود فراموشی کی انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی خوش کلامی لوگوں پر جادو کر دیتی ہے، اس کے ساتھ دوسرے بھی اس کے مقاصد کے فدائی بن جاتے ہیں۔ لیکن رودن کی طرح اس کی طبیعت میں بھی اس قدر تلون ہے، اس کی تن دہی

استقلال سے ایسی محروم ہو کہ ہر قسم کا نقصان، صدمہ اور ذلت اُٹھانے کے بعد وہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہو اور جب چالیس سال کی عمر میں وہ اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرتا ہو تو اسے تسکین دلانے کے لیے کوئی کامیابی، کوئی تکمیل کو پہنچا ہوا کام نظر نہیں آتا۔ چخوف کے ایجاز نے لیخارف کی سرگزشت کو رودِن کی سوانح عمری سے بہت زیادہ پُر تاثیر بنا دیا ہو اور اس کی داستان کا پس منظر بھی بہت زیادہ موزوں اور پُرمعنی ہو۔ جاڑوں کے موسم میں جب برف کے بھونچالوں اور طوفانوں سے زمین کانپ رہی ہو، لیخارف، جو کسی دور افتادہ مقام پر ملازم ہو گیا ہو اپنی چھوٹی لڑکی کو ساتھ لیے وہاں جا رہا ہو۔ رستے میں موسم کی ناسازگاری اسے ایک ادنیٰ سرائے میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہو اور یہیں ایک نوجوان لڑکی کو جو اپنے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جا رہی ہو رات بھر کے لیے قیام کرنا پڑتا ہو۔ لڑکی بہت ہوشیار، سلیقہ مند اور ہمت والی ہو۔ باپ اور بھائیوں کو نا اہل دیکھ کر اس نے جائداد کا انتظام اپنے ذمے لے لیا ہو اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی۔ جب لیخارف اس سے گفتگو چھیڑ کر اپنی ساری سرگزشت سناتا ہو اور اس کی گرم گفتاری کو اپنی تاثیر دکھانے کا موقع ملتا ہو تو لڑکی کے آنسو بہنے لگتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہو کہ ذرا دیر اور لیخارف کی شخصیت اس پر اثر ڈالتی رہی تو وہ بھی اس کی گرویدہ ہو جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آتی۔ جب دوسرے دن لڑکی

سلیج[1] پر بیٹھ کر روانہ ہونے لگی" تو اس نے گھوم کر لیخارف کی طرف اس طرح دیکھا کہ گویا اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیخارف اس کے پاس دوڑ کر گیا، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، بس اسے دیکھتی رہی .... معلوم نہیں لیخارف کے نکتہ رس ذہن نے اس نظر کی صحیح تعبیر کر لی تھی یا یہ محض ایک خیال تھا، مگر اسے یکبارگی محسوس ہونے لگا کہ اگر وہ لڑکی کے دل کے تاروں کو ذرا اور چھیڑ سکتا تو وہ اس کا بڑھاپا، اس کی بیکسی اس کی ناکامیابی سب معاف کر دیتی اور بغیر کسی سوال وجواب کے اس کے پیچھے ہو لیتی۔ وہ بہت دیر تک اسی جگہ کھڑا سلیج کی لیکھیں دیکھتا رہا۔ سلیج کے نشان برف میں چھپ گئے، وہ خود برف سے اس طرح اٹ گیا کہ ایک سفید چٹان معلوم ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں برف کے بادلوں میں کچھ تلاش کرتی رہیں۔"

لیخارف کی لاحاصل کوششیں جنھیں وہ کسی مقصد کے پورے کرنے میں استعمال نہ کر سکا تعلیم یافتہ روسیوں کی روحانی بے چینی کا ایک پہلو تھیں۔ اس بے چینی کی ایک اور صورت ان لوگوں کی جد وجہد میں نظر آتی ہے جو اپنی زندگی میں روسی عوام کے طرزِ معاشرت اور فلسفۂ حیات سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے، جن کا خیال تھا کہ اگر تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت یورپی اثرات کے میل سے پاک کر دی جاتے تو اس کے کل امراض کا ایک نسخے سے علاج ہو جائے گا۔

---

[1] بغیر پہیوں کی گاڑی جس پر روس میں جاڑوں کے زمانے میں سفر کیا جاتا ہے۔

انشا پردازوں میں "تالستائی کی زبردست شخصیت نے اس تصور کی نمائندگی اور اس کا پرچار کیا، اور چخوف کا افسانہ " میری سرگزشت" اسی کے اثر میں ڈوبا ہؤا معلوم ہوتا ہے۔ اس افسانے کی تصنیف میں بھی چخوف نے اپنا خاص طریقہ چھوڑ کر تالستائی کا طرز اختیار کیا اور در اصل وہ ایک مشق ہے، مگر اتنی کامیاب مشق کہ تالستائی کے بہترین افسانوں سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ "میری سرگزشت" کا ہیرو پولوزنف اپنے آپ کو مزدوری کرنے کے سوا اور کسی کام کے لایق نہیں سمجھتا اور مزدوری کرنے لگتا ہے۔ خاندان کی آبرو ریزی کی سزا میں اس کا باپ اسے عاق کر دیتا ہے، اس کی بیوی، ایک امیر انجینیر کی لڑکی جس نے آغوشِ فطرت میں زندگی بسر کرنے کے شوق میں اس سے شادی کی تھی کسانوں کی بے تمیزیوں اور دیہاتی معاشرت سے اُکتا کر بھاگ جاتی ہے، لیکن ان سب کے باوجود پولوزنف مزدوری کا پیشہ نہیں چھوڑتا۔ چخوف نے اپنے ہیرو کی سیرت، اس کے خیالات، جو سچ پوچھا جائے تو اس کی خلقی مجبوریوں کا نتیجہ ہیں، اس کے ماحول پر ان کا اثر، اس کے خود پرست باپ کا غصہ اس کی بہن کی چھپی ہمدردی، اس کے طبقے کے لوگوں کی حیرت اور حقارت آمیز سلوک، یہ سب نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز طریقے پر دکھایا ہے۔ معاشرت کے انقلاب کی اس سے بہتر اور معنی خیز شاید ہی اور کوئی تصویر ہو گی۔

چخوف کا خاص موضوع تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت اور ذہنیت

ہے۔ لیکن روسی عوام کی زندگی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہی۔ وہ افسانے جن میں اس نے کسانوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور ان کے اخلاقی فلسفۂ حیات کو بیان کیا ہے نکتہ چین نقادوں کے نزدیک فن کے اعتبار سے زیادہ کامیاب اور حقیقت نگاری کی رو سے بالکل صحیح نہیں ہیں۔ لیکن جہالت، درد کی کیفیتیں اور مفلسی کی مصیبتیں بیان کرنے میں اسے کمال ہے۔ "اندھیرا" چند صفحوں میں جہالت اور بے کسی کی ایک لمبی اور دل گداز داستان سُنا دیتا ہے۔ کسی ہسپتال میں ایک نوجوان کاشت کار ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور التجا کرتا ہے کہ میرے بھائی کو چھوڑ دیجیے، اس کی ماں اور بیوی بچے اسے بہت یاد کرتے ہیں، گھر پر کھانے والے بہت اور کماتے والا کوئی نہیں۔ اس کا بھائی ایک مجرم ہے جسے تین سال کی سزا ہوئی ہے اور وہ بیماری کی وجہ سے چند روز کے لیے ہسپتال بھیجا گیا ہے۔ نوجوان کاشت کار اور تمام افسروں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کے پاس آیا ہے اور ڈاکٹر اسے کسی طرح یقین نہیں دلا سکتا کہ اسے مجرموں کو چھوڑ دینے کا اختیار نہیں۔ کاشت کار ڈاکٹر کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور ڈاکٹر گھبرا کر ہسپتال کے اندر چلا جاتا ہے۔ کاشت کار سمجھتا ہے کہ یہ بے رخی محض رشوت وصول کرنے کا بہانہ ہے، رشوت دینے کو اس کے پاس روپیہ نہیں اس لیے ایک اور افسر کی خوشامد کرنے کے بعد وہ پھر اپنے بوڑھے باپ کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور دونوں ڈاکٹر کا دل نرم کرنے کے لیے اس کے قدموں پر گر پڑتے ہیں۔

"اندھیرے" کی طرح "مجرم" میں بھی کسانوں کی جہالت اور وہ ذہنی تاریکی جس میں وہ گھرے ہوئے تھے نہایت درد انگیز مگر ساتھ ہی مضحک صورت میں نظر آتی ہے۔ ایک کسان ریل کی پٹری کے

پیچ کھولنے کے جرم میں پکڑا گیا ہے۔ اس نے پیچ اس لیے کھولے تھے کہ مچھلی کی شست کے لیے لنگر کی ضرورت تھی اور اسے سخت حیرت ہوتی ہے۔ جب منصف کہتا ہے کہ تم نے ایسی حرکت کی ہے جس سے ریل گاڑی کے اُلٹ جانے اور سینکڑوں مسافروں کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ کسان کو اپنی حرکت سے انکار نہیں اور اسے قید کی سزا دی جاتی ہے، لیکن وہ آخر وقت تک اسی خیال میں رہتا ہے کہ کسی نے دراندازی کی ہے، کیوں کہ پٹری کے پیچ نکالنا اس کے نزدیک ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے کسی بے گناہ اور امن پسند آدمی کو سزا دی جائے۔

چخوف کے نسوانی کیرکٹروں میں سب سے مشہور "پیاری" کی ہیروین اولنکا ہے۔ وہ اپنے تروتازہ، مسکراتے ہوئے چہرے اور نیک، محبت بھری طبیعت کی بدولت شروع جوانی میں "پیاری" کے لقب سے مشہور ہوئی۔ پہلے اس کی ایک تھیٹر کے مالک سے شادی ہوتی ہے، جب تک وہ اس کے ساتھ رہتی ہے اس کے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور ہر وقت اور ہر شخص سے تھیٹر کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا شوہر مرجاتا ہے اور ایک لکڑی کا سوداگر اس سے نکاح کرلیتا ہے۔ دوسرے شوہر کو ناٹک سے مطلق دلچسپی نہیں، "پیاری" کبھی تھیٹر نہیں جاتی اور کوئی جانے کو کہتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ ایسی فضول باتوں کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے

نہ میرے شوہر کے پاس۔ اب اس کی گفتگو کا مستقل موضوع لکڑی کا بھاؤ اور تجارت کی دشواریاں ہو جاتی ہیں اور رات کو بھی اسے خواب میں لکڑیوں اور تختوں کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔ شادی کے چھ سال بعد "پیاری" پھر بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کی خبر گیری کے لیے سوائے ایک مویشیوں کے ڈاکٹر کے اور کوئی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر سے اس کی صرف کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے، لیکن یہ ذرا سا تعلق، "پیاری" کو مویشیوں کی بیماریوں سے واقف کرنے اور انھیں اپنی گفتگو کا موضوع بنانے کے لیے کافی ہے۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور پھر کئی سال تک "پیاری" بالکل اکیلی رہتی ہے۔ اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس کے خیالات وہ اختیار کر لے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں سے کیا باتیں کرے۔ آخر میں وہی مویشیوں کا ڈاکٹر ملازمت ترک کر کے اسی شہر میں بسنے کے ارادے سے آتا ہے۔ "پیاری" اسے، اس کی بیوی اور دس سال کے بچے کو اپنے مکان میں رکھتی ہے اور اس کی زندگی کا چراغ پھر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ بچے کی پرورش میں مشغول اور اس کی روزمرّہ زندگی میں بالکل محو ہو جاتی ہے، اسے کھلاتی پلاتی ہے، اسکول کے آدھے رستے تک اس کے ساتھ جاتی ہے اور جو کوئی ملتا ہے اس سے شکایت کرتی ہے کہ چھوٹے درجوں کے سبق بہت مشکل ہوتے ہیں اور لڑکوں سے ایسے سوال پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب انھیں کبھی بتلائے نہیں گئے۔

اس قصے پر تنقید کرتے ہوئے "تالستائی نے لکھا ہے کہ مصنف کا مقصد عورت کا مذاق اُڑانا اور یہ خیال پیدا کرنا ہے کہ عورت کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں، وہ مرد کی شخصیت کا محض ایک عکس ہے۔ تالستائی کی رائے میں چیخوف اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوا ہے، کیوں کہ ہم "پیاری" پر ہنسنے کی بجائے اس کے جذبۂ ایثار کے فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن چیخوف نے در اصل کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے، بس نسوانی سیرت کا ایک مرقع کھینچا ہے اور ہم اپنے مذاق کے مطابق "پیاری" کو مضحک یا محبت واحترام کی مستحق سمجھ سکتے ہیں۔ "پیاری" کے علاوہ نسوانی سیرت کی اور بھی قسمیں ہیں جن کے مثالی نمونے چیخوف نے "وولودیا"، "مددگار"، "بے بس مخلوق"، "پُر اسرار فطرت" میں پیش کیے ہیں۔ "پُر اسرار فطرت" فن کے اعتبار سے ایک کارنامہ ہے۔ چیخوف نے تین چار صفحوں میں ایک دولت پرست عورت کا روپیے پر اپنی جوانی اور حسن نثار کرنے کا قصہ خود اس کی زبانی سُنایا ہے اور نہایت ظریفانہ طریقے پر ایسی عورتوں کی خودستائی اور خود فریبی، بناوٹی حوصلہ مندی اور روحانیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

چیخوف کا فنی کمال، اس کے احساس کی نزاکت اور گہری انسانی ہمدردی سب سے بہتر ان افسانوں میں ظاہر ہوتی ہے جن کا موضوع دل کا درد ہے یا وہ چھوٹے بڑے صدمے جو ہم میں سے ہر ایک

کو پہنچتے رہتے ہیں یا وہ حسرتیں جو دل کو تڑپایا کرتی ہیں۔ اس طرز کے افسانے بہت ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ بے مثل ہے۔ چیخوف کے نقش نازک اور باریک ہوتے ہیں، اس کے اشارے اور کنایے پُر معنی، وہ قصے کو کبھی اس طرح نامکمل چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود بخود پڑھنے والے کے ذہن میں انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اسے آپ بیتی معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ ایک ذرا سے واقعے یا معمولی سی بات کے ذریعے سے کسی کی زندگی کی فضا، کسی کے درد کی داستان آنکھوں کے سامنے پھیر دیتا ہے اور وہ ہزار ہا نکتے جو زبان اور قلم سے بیان نہیں ہو سکتے اس کی آدھی کہی ہوئی بات میں بیان ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "تشخیص" میں ایک ڈاکٹر کسی امیر کی لڑکی کو دیکھنے کے لیے شہر سے کچھ دور بلایا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ ایک کارخانے کا مالک ہے۔ اس کا مکان بھی کارخانے کے احاطے میں ہے اور اس طرح لڑکی دلچسپیوں اور صحبت کے لطف سے اس قدر محروم رہتی ہے کہ اکتا اکتا کر وہ خواہ مخواہ بیمار پڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہتا ہے کہ تمھیں ایسی جگہ رہنا اور ایسی زندگی بسر کرنا اپنی قسمت کا لکھا نہ سمجھ لینا چاہیے۔ جب دوسرے دن سویرے ڈاکٹر رخصت ہونے لگتا ہے تو لڑکی سفید کپڑے پہنے اور بالوں میں پھول لگائے ہوتی ہے۔ یہ ذرا سی بات ہمیں بتا دیتی ہے کہ ڈاکٹر کے کہنے کا لڑکی کے دل پر کتنا گہرا اثر ہوا ہے،

اور اب وہ اپنی زندگی میں لطف اور دنیا سے لگاؤ پیدا کرنے کی
کوشش کرنے والی ہے۔ چخوف کا اندازِ بیان پڑھنے والے کو بھی
لڑکی کی امیدوں اور آرزوؤں کے میٹھے میٹھے جوش میں شریک کر
دیتا ہے، اور وہ بھی اس کی خوشی منانے لگتا ہے کہ ایک انسان کے
دل کو افسردگی اور غم سے نجات ملی اور اب آزادی کی خواہش
اسے دنیا کی سیر کرائے گی اور اس کی شخصیت نشو و پائے گی۔ اسی
طرح ایک اور قصے میں ایک عورت جسے اپنے شوہر سے بہت بجا
شکایتیں ہیں کسی صحت گاہ میں ایک صاحب سے آشنائی کر لیتی ہے۔
یہ آشنائی اخلاق کی رو سے درست نہیں، لیکن وہ بگڑی ہوئی
زندگی کو بنانے کی ایک آخری کوشش ہے اور اس وجہ سے بہت
جلد سچی محبت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کو
پرانے رشتے توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی امید نہیں، پھر بھی آخری
گفتگو کے بعد انھیں "معلوم ہونے لگا کہ بس اب تھوڑی سی دیر میں
ان کی ساری دشواریاں رفع ہو جائیں گی اور وہ ایک نئی اور
شان دار زندگی بسر کرنے لگیں گے"۔ اس قسم کے افسانے چخوف
عموماً ایک لطیف مایوسی کے انداز میں اور پڑھنے والے کے دل میں
ایک خوش گوار حسرت پیدا کر کے ختم کرتا ہے۔ وہ ایک مصور کی کہانی"
"اُمی او پنخ"، "وہ ے رو چکا"، "ایک خاتون کی سرگزشت" "محبت
کے رشتے کو قایم ہو کر ٹوٹتے دکھاتے ہیں اور محض اس سبب سے

کہ ان میں مبالغے اور جذبات پرستی سے بالکل پرہیز کیا گیا ہے داستان اور بھی زیادہ دل گداز ہو جاتی ہے۔ "جہیز کے سامان" میں مایوسی کا رنگ بہت گہرا ہے۔ یہ ایک فوجی افسر کی بیوہ کا قصّہ ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے سامان تیار کرتی رہتی ہے۔ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بیٹی کی شادی کبھی ہوگی نہیں اور اس لیے ماں بیٹی کا شوق اور انہماک دیکھ کر ہمارے آنسو بہتے بہتے رہ جاتے ہیں۔ "بوسہ" اور "دل لگی" اس طرز کے بہترین افسانے ہیں۔ "بوسہ" ایک بدصورت اور بدقطع فوجی افسر کا قصّہ ہے جو عورتوں کی توجہ سے بالکل محروم رہتا ہے اور اس کی ساری دلی آرزوئیں اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ کہیں کھانے اور ناچ کی دعوت ہوتی ہے اور چونکہ فوجی افسر کو ساتھ ناچنے کے لیے کوئی خاتون نہیں ملتی ہیں، وہ وقت کاٹنے کے لیے میزبان کے گھر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔ اتفاق سے وہ ایک کمرے میں پہنچتا ہے جو ذرا تاریک ہے اور یہاں ایک عورت یکبارگی آ کر اس سے لپٹ جاتی ہے اور اسے ایک بوسہ دیتی ہے۔ عورت اپنی غلط فہمی محسوس کرتے ہی چلا کر بھاگ جاتی ہے، لیکن فوجی افسر کو یہ ناگہانی پیار یاد رہتا ہے اور جب کبھی اس کا دل رنج سے بھر آتا ہے تو وہ اس واقعے کو یاد کر کے اپنا غم غلط کیا کرتا ہے۔ یوں ہی وہ لوگ جنھیں اپنی آرزوئیں پوری کرنے کی امید نہیں ہوتی کسی اتفاقی بات کو اپنا سہارا بنا لیتے ہیں اور اپنی روٹھی ہوئی قسمت کی کسی جھوٹ موٹ

کی مہربانی سے دل کو تسلّی دے لیتے ہیں۔ "دل لگی" میں ایک نوجوان اپنی کسی عزیزہ کو برف پر پھسلنے کے واسطے لے جاتا ہی اور اس وقت جب تختے کی گاڑی بہت تیزی سے نیچے کی طرف پھسلتی ہوتی ہی وہ چپکے سے ایک پیارہ کا لفظ کہہ دیتا ہی۔ لڑکی اس طرح پھسلنے سے بہت ڈرتی ہی لیکن وہ پیارہ کا لفظ اس کے کان میں پڑ گیا، بدحواسی میں وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ آواز کہاں سے آئی ہی، مگر پیار کا لفظ سننے کے شوق میں اور یہ معلوم کرنے کو کہ آواز کہاں سے آئی تھی وہ بار بار اپنے خوف کے باوجود دل کڑا کر کے اسی طرح پھسلنے پر راضی ہو جاتی ہی۔ لڑکا ہر دفعہ وہی شرارت کرتا ہی مگر لڑکی کو پتا نہیں چلتا اور پیار کا لفظ سننے کا اشتیاق اسے بے چین رکھتا ہی۔ یہی حرکت لڑکے نے ایک مرتبہ اس وقت کی جب لڑکی گھر کے باغیچے میں کھڑی تھی اور اس واقعے کے بہت دنوں بعد بھی وہ اس امید میں رہتی ہی کہ اسے وہ لفظ سنائی دے گا، اس لیے اکثر باغیچے میں جا کر چپ چاپ کھڑی رہتی ہی کہ شاید پھر سنائی دے۔ اس کی شادی ہو گئی، بچے ہوئے، مگر وہ پیار کا لفظ اسے نہیں بھولا اور اسے دوبارہ سننے کا اشتیاق باقی رہا۔

چخوف کے بہترین درد انگیز افسانے جن میں لطیف جذبات کی تصویر نہیں ہی "دشمن"، "مصیبت"، "آرزوئیں"، "رانکا" اور "ڈالیسٹر کی نشانی" ہیں۔ "دشمن" میں ایک جوان آدمی جس کی بیوی

بیمار ہے ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہے۔ اسی روز اس ڈاکٹر کے اکلوتے بچے کا انتقال ہوا ہے اور ڈاکٹر کی بیوی رنج میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر گھر چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا، لیکن جوان آدمی کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ اس کے گھر پہ پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی نے بیماری کا بہانہ کیا تھا اور شوہر کی عدم موجودگی میں اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جوان آدمی کو بیوی کے مکر و فریب پر غصہ آتا ہے اور اس کے بھاگ جانے کا غم ہے، ڈاکٹر کو اپنے بچے کی موت اور بیوی کی پریشانی کا خیال ستاتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے صدمے کا مطلق لحاظ نہیں کر سکتا، ڈاکٹر جوان آدمی کو بیہودہ اور خود غرض سمجھ کر اس پر خفا ہونے لگتا ہے، نوجوان آدمی ڈاکٹر کو لالچی اور بے حس فرض کر کے اس کی اور اس کے غم کی توہین کرتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مصیبت کے مارے جنھیں ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیے تھا خواہ مخواہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ "مصیبت" ایک بوڑھے گاڑی بان کی داستان ہے۔ اس کا نوجوان لڑکا جس سے اسے بہت محبت اور بڑی امیدیں تھیں مر گیا ہے۔ بیچارے کو کوئی ہمدرد نہیں ملتا اور اس لیے وہ ان تمام لوگوں کو جو اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہیں اپنے غم کا افسانہ سنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ سب اپنی اپنی فکروں میں مبتلا ہیں، بوڑھے گاڑی بان کی کوئی نہیں سنتا۔

آخر میں جب وہ گھر واپس ہوتا ہی تو اس کی حسرت ویسی کی ویسی ہی رہ جاتی ہی۔ گھر پر وہ اپنی تھکی ماندی گھوڑی کو پیار کرنے لگتا ہی، یہ ذرا سا پیار ان تمام جذبات کے پھوٹ نکلنے کا رستہ بن جاتا ہی جو اس کے دل میں اُمنڈ رہے تھے، اوران کے سیلاب کو روکنے کی اس میں تاب نہیں رہتی۔ وہ اپنی گھوڑی کو اصطبل لے جاکر اس کے سامنے چارا رکھ دیتا ہی اور اسے دل کھول کر وہ ساری رام کہانی سنا دیتا ہی جسے کوئی ہم جنس سننے پر راضی نہ تھا۔ یہی درد جس کی شدت ظرافت کے ذریعے سے کچھ کم کردی جاتی ہی، "وانکا" اور "آرزوؤں" کا موضوع ہی۔ "وانکا" ایک یتیم لڑکا ہی جسے اس کے سرپرست بڑی تکلیف سے رکھتے ہیں۔ اس کا بہت جی چاہتا ہی کہ اپنے گانو واپس چلا جائے جہاں اس کا خیال ہی کہ اس کا دادا رہتا ہی اور آخر میں وہ اپنی کل شکایتیں ایک میلے کاغذ کے پُرزے پر لکھتا ہی اور "میرے دادا کو، جو گانو میں رہتے ہیں" پتے کی جگہ لکھ کر کاغذ کو ڈاک کے ڈبے میں ڈال دیتا ہی۔ "آرزوؤں" میں ایک مفرور مجرم دو پولیس والوں سے جو اس کو تھانے پر لیے جا رہے ہیں اپنے ارادے بیان کرتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ اگر جیل خانے میں رکھنے کے بجائے مجھے سائبیریا بھیج دیا گیا تو مجھے امید ہی کہ مجھے کاشت کے لیے تھوڑی سی زمین مل جائے گی، میں اپنا چھوٹا سا باغ لگاؤں گا اور میرے دن بڑے مزے سے کٹیں گے۔ اس کی باتیں سنتے سنتے ایک پولیس والا بڑی بے دردی سے اس سے کہتا ہی کہ تمھاری صحت بہت خراب ہی اور

تم سائی بیریا میں چھ مہینے بھی زندہ نہ رہ سکوگے۔ یہ سُن کر مجرم کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر جاتا ہی، اس کی آنکھوں کی روشنی دھیمی پڑ جاتی ہی، کمر جھک جاتی ہی اور رستے بھر وہ منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا۔

مختصر افسانوں کے علاوہ چخوف نے چند لمبے قصے اور افسانے نما مضامین بھی لکھے۔ "ڈیوئل" اور "ستیپ" جو اس کے سب سے لمبے افسانے ہیں کوئی قابلِ ذکر خوبی نہیں رکھتے اور ان میں صرف یہ ظاہر ہوتا ہی کہ چخوف کا خاص طرز مختصر افسانے کے سوا اور کسی قسم کی داستان کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کے افسانے نما مضامین خصوصاً "حسین چہرے"۔ "بچے"، "گریشا" "نیند" وغیرہ بہت اچھے ہیں۔ "حسین چہروں" میں اس نے تین لڑکیوں کی صورتوں کا نقشہ کھینچا ہی جن کا اس پر بہت اثر ہوا تھا اور وہ میٹھا میٹھا درد بیان کیا ہی جو حسن کا دیدار دل میں پیدا کرتا ہی۔ "بچے" چار پانچ ننھے بچّوں کی داستان ہی جو شام کو والدین کی عدم موجودگی میں بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں اور پھر ایک ہی پلنگ پر لد کر سو جاتے ہیں۔ اسے وہی لکھ سکتا تھا جسے بچّوں سے محبت ہو اور جو ان کی ہر حرکت کا معصوم مگر شاعرانہ انداز سمجھ سکتا ہو۔ "گریشا" ایک دو برس کے بچّے کی سرگزشت ہی اور اس میں شعور کے آغاز کی کیفیت جس خوبی اور صحت سے بیان کی گئی ہی اس پر ہر ماہرِ نفسیات رشک کر سکتا ہی۔ فن کے اعتبار سے "نیند" کا درجہ ان سب سے بلند ہی۔ اس میں ایک آٹھ نو سال کی بچّی کی نیند کی

شدت اور وہ اثر جو نیند کی شدت کا نظر اور حواس پر ہوتا ہی دکھایا گیا ہی بیان کی صفت یہ ہی کہ پڑھنے والے پر بھی غنودگی طاری ہو جاتی ہی، بچی کی طرح اس کی نظر میں بھی فرق آجاتا ہی اور وہ تمام تکلیفیں اسے بھی محسوس ہوتی ہیں جو بیچاری بچی سہتی ہی۔

چخوف کی زندگی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہؤا اور بعض زبانوں میں کئی کئی مختلف ترجمے ہوئے۔ اسے یہ بے نظیر عزت بھی حاصل ہوئی کہ جرمنی کے شہر باڈن وائلر میں، جہاں اس کا انتقال ہؤا تھا اس کے مرنے کے چھ سال بعد اس کی مورت بطور یادگار کے نصب کرائی گئی۔ روس کے باہر اب بھی وہ اپنے فن میں کامل اور افسانہ نویسی کا بادشاہ مانا جاتا ہی۔ لیکن روس میں اب اس کی قدر نہیں رہی ہی۔ اس زمانے کے روسی اس دور کو جب چخوف کی شہرت عروج پر تھی پستی اور انحطاط کی انتہا سمجھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ روس میں پھر اس قسم کے لوگ پیدا ہوں۔ چخوف کو انقلاب کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ نئی زندگی کا بڑی عقیدت اور محبت سے خیر مقدم کرتا اور تب شاید روسی نوجوان اس کی یاد تازہ رکھنا اپنا فرض سمجھتے۔ ہم روس کی نئی پود پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، اس لیے کہ اس زندگی اور ان لوگوں پر جن کی چخوف نے جیتی جاگتی تصویریں کھینچی تھیں ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی جو حوصلہ مندی

اور جوانی کے لیے مہلک ہوتی ہی اور نئے دور میں اگر کچھ ہی تو جوش اور جوانی ہی۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ روسی چخوف کو ہمیشہ کے لیے بھول گئے ہیں۔ جب ان کی نئی زندگی اور نئی تہذیب تکمیل کو پہنچ جائے گی اور انھیں اس کی مہلت ملے گی کہ دائمی اخلاقی مسائل اور انسانی سیرت کے نہ مٹنے والے نقشوں پر غور کریں تو وہ چخوف کی تصانیف کے بجھے ہوئے چراغ کو پھر روشن کریں گے، جن تصویروں پر اب گرد جم رہی ہی انھیں صاف کر کے شوق سے دیکھیں گے اور کوئی تعجب نہیں اگر ان پرانی تصویروں میں انھیں اپنی ہی صورت نظر آئے۔

گیارھواں باب

ماکسِم گورکی (۱۸۶۹-۱۹۳۶)

جس طرح روسی زندگی کا ایک بڑا دور انقلاب پر آکر ختم ہوتا ہے ویسے ہی ادیبوں کا ایک سلسلہ ہے جو انقلاب کے طوفان میں غائب ہو جاتا ہے۔ گورکی اس سلسلے کا آخری رکن تھا اور اس کی ابتدائی زندگی اور ادبی خصوصیات کا بیان پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ روسی ناول نویسی کا ایک سلسلہ اس پر صحیح معنوں میں ختم بھی ہو گیا۔ ٹالسٹائی کے بعد فلسفۂ معاشرت دستہ ئفسکی کے بعد نفسیات اور روحانیات، چخوف کے بعد تعلیم یافتہ طبقے کی عام زندگی کو ناول کا موضوع بنانا استادوں کے کام میں اصلاح دینا تھا، جو کہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہوتی اور اس کا نتیجہ جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ گورکی نے عوام کی زندگی، ان کے جذبات اور احساسات کی تصویریں کھینچ کر روسی ناول کو قومی زندگی کا مکمل آئینہ بنا دیا۔ اس کے بعد یا تو زندگی بدلتی، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا، یا ناول لکھنا چھوڑ دیا جاتا۔ کوئی تیسری صورت نہ تھی۔

ماکسم گورکی کا اصل نام الک سے ئی ماکسی مووچ پیشکوف تھا۔ وہ شہر اشراغان میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ ادنے حیثیت سے شروع کرکے رفتہ رفتہ جہاز ران کمپنیوں کا ایجنٹ ہوگیا تھا۔ گورکی چار پانچ سال کا تھا جب اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اس کی ماں اسے لے کر اپنے باپ کے یہاں چلی گئی، جو نوف گورود میں رنگریزی کا کام کرتا تھا۔ اس وقت سے جوانی تک کی سرگزشت گورکی نے دو ناولوں میں بیان کی ہے، "بچپن" اور "غیروں میں"، اور ایسے ناولوں کے لیے اس کی سرگزشت سے بہتر موضوع ملنا بہت مشکل ہے۔ گورکی کے نانا کی حالت اس وقت کچھ اچھی نہ تھی، افلاس کے ساتھ اس کی بدمزاجی اور طبیعت کے اور بہت سے عیب اُبھر آئے تھے اور جن لوگوں پر اس کا بس چلتا ان پر وہ اپنا غصہ اُتارا کرتا تھا۔ لیکن گورکی کے لیے اس کا نواسا ہونا سراسر بدقسمتی نہ تھی، کہ اگر اسے ایک طرف نانا کی کمینی باتیں سُننا اور سختیاں برداشت کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف نانی کی محبت میں اس کے لیے ایک ایسا ٹھکانا تھا جہاں پہنچتے ہی دل کا دُکھ اور ظلم کا خوف اسی طرح دور ہوجاتا جیسے ڈراؤنے خوابوں کی وحشت آنکھ کھُل جانے سے۔ باپ کے یہاں تھوڑے دنوں رہنے کے بعد گورکی کی ماں نے دوسری شادی کرلی اور پھر جلد ہی دق کا شکار ہوئی۔ نانا نے موقع کو غنیمت جانا اور گورکی کو گھر سے نکال دیا۔

اب وہ "غیروں" میں پہنچ گیا۔ پہلے اسے ایک جوتے والے کی

دُکان پر نوکری ملی، جہاں طرح طرح کے گاہک آیا کرتے تھے۔ یہاں اس نے پہلے پہل دنیا کا حال دنیا والوں کی زبانی سُنا، عیاشی اور بدکاری کی داستانیں سنیں اور جیسے کُتّے گلی کوچوں میں غلیظ چاٹتے پھرتے ہیں ویسے ہی آدمیوں کو دوسروں کی گنہگاری کا فضلہ مزے لے لے کر کھاتے دیکھا۔ دُکان چھوڑنے کے بعد وہ کئی مہینے تک ایک جہاز کے باورچی خانے میں برتن دھوکر پیٹ پالتا رہا۔ باورچی پہلا شخص تھا جس نے نوجوان گورکی کی تعلیم پر توجہ کی اور یہ اسی کا احسان تھا کہ گورکی نے ذرا پڑھنا لکھنا سیکھ لیا۔ مگر برتن دھونے کا کام ایسا تھا کہ گورکی سے کیسے ہوتا نہ تھا، وہ اس کام سے پیچھا چھڑا کر کسی شہر میں ایک آوارہ عورت کے پاس نوکر ہوگیا جہاں شعروشاعری اور موسیقی کا خاصا چرچا رہتا تھا اور اسے ادب سے ایک لگاؤ ہوگیا جس نے تعلیم کے شوق کو بہت بڑھا دیا۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر شعر اور گیت کو اس طرح برہنہ دیکھ لیں جیسے کہ گورکی نے دیکھا تھا تو ان سے منھ پھیر لیں، لیکن گورکی نے اخلاقی تربیت پائی نہ تھی، اچھے اور بُرے کی اسے تمیز نہ تھی، اس کے لیے بس آدمی کی ذات تھی اور قدرت کی بے پرواصورت گری کہ آدمی کو جیسا چاہتی بنادیتی۔ اس کے علاوہ گورکی ابھی نابالغ بھی تھا، ورنہ شاید ایسی صحبت میں اس کی طبیعت اور زندگی کا رنگ بالکل بدل جاتا۔ ہاں اور ایک بڑا سہارا اس کی غریبی بھی تھی، جس نے بھوک اور سردی کی دو دیواریں رستے کے اِدھر اُدھر کھڑی کرکے اسے بھٹکنے سے اس طرح روکا کہ جیسے

اُستاد کی نصیحتیں اور طمانچے بھی نہ روک سکتے۔

پندرہ برس کی عمر میں گورکی نے شہر کازان کے ایک اسکول میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا اور تعلیم سے مایوس ہوکر اس نے ایک نان بائی کے یہاں ملازمت کر لی۔ جن لوگوں میں وہ یہاں رہتا تھا اُنھیں تو بھوک اور محنت کی زیادتی نے بے جان کر دیا تھا، لیکن گورکی کو چند ایسے طالبِ علموں سے ملنے کا اتفاق ہُوا جنھوں نے اس کے ذہن میں انقلاب پسندی کے بیج بو دیے۔ گورکی نے نان بائی کی دُکان کو خیرباد کہی اور جنوب اور جنوب مشرقی روس میں دو تین سال تک پھرتا رہا۔ ۱۸۹۰ میں وہ نوف گورود کے ایک وکیل کا محرّر ہوگیا اور وکیل کی ہمدردی اور ہمّت افزائی کی بدولت اس کی علمی اور ادبی قابلیت اتنی ہوگئی کہ وہ افسانے لکھنے لگا۔ ۱۸۹۲ میں اس کا پہلا افسانہ شایع ہُوا، اور اگرچہ اس وقت وہ پھر آوارہ گردی کرنے لگا تھا، اس نے افسانہ نویسی بھی جاری رکھی۔ تین سال کے اندر اسے اس ذریعے سے خاصی آمدنی ہونے لگی، ۱۸۹۸ میں اس کے افسانوں کا مجموعہ دو جلدوں میں شایع ہُوا اور تھوڑے دنوں کے اندر وہ صرف روس میں نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ غیر ملکوں میں مشہور اور ہر دل عزیز ہوگیا۔

ادبی حلقوں میں حیثیت بڑھی تو گورکی پیٹر برگ میں آکر رہنے لگا۔ یہاں اس کے انقلاب پسندوں سے تعلقات ہوگئے۔ وہ خود

کارل مارکس اور اشتراکیت کی تعلیم کا معتقد ہو گیا اور اس کی آمدنی کا بیشتر حصّہ سیاسی کاموں اور انقلاب انگیز خیالات کی اشاعت میں صرف ہونے لگا۔ ۱۹۰۰ میں وہ شہر بدر کر کے نوف گورود بھیج دیا گیا، مگر اس سزا کا اس کے طرزِ عمل پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ۱۹۰۲ میں وہ شاہی اکادمی کا رکن منتخب ہؤا اور سرکار کے حکم سے یہ انتخاب منسوخ کر دیا گیا تو چیخوف کو جو خود کچھ پہلے منتخب ہؤا تھا اتنا غصّہ آیا کہ اس نے رُکنیت سے استعفا دے دیا۔ تین سال بعد، جب 'پہلے' انقلاب کی تحریک اُٹھ رہی تھی تو گورکی قید کر دیا گیا، لیکن اس پہ یورپ بھر میں ایسی ناراضگی کا اظہار کیا گیا کہ حکومت کو مجبوراً اسے چھوڑ دینا پڑا اور اس نے انقلابی کارروائیوں میں پوری شرکت کی۔ انقلاب کا خاتمہ کر دیا گیا تو گورکی فنستان ہوتے ہوئے امریکہ گیا اور رستے میں ہر جگہ اس کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا۔ امریکہ میں بھی کچھ عرصے تک اس کی بڑی قدر رہی، لیکن جب لوگوں کو معلوم ہؤا کہ وہ بیوی جو گورکی کے ساتھ آئی ہے بیوی نہیں خالی "دوست" ہے تو سب اس سے بہت خفا ہو گئے۔ گورکی کو اپنی طرف یہ "قدامت پرستی" اتنی بُری لگی کہ اس نے امریکہ والوں کے خلاف ایک کتاب لکھ ماری۔ امریکہ سے گورکی روس واپس نہیں گیا بلکہ چند سال اطالیہ کے جزیرہ کاپری میں صحت کے خیال سے رہا۔ ادبی دنیا میں وہ کافی سراہا جا چکا تھا اور لوگ اس کے خاص طرز کے عادی ہو چکے تھے اور اس کی

اب وہ دھوم نہیں رہی تھی۔ اس دور کی دو ممتاز تصنیفیں "بچپن" اور "غیروں میں" اس کا چرچا بڑھا نہ سکیں، اگرچہ وہ پہلے کے ناولوں سے بہت بہتر ہیں۔

۱۹۱۴ میں یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس وقت گورکی کا رویّا وہی تھا جو کہ اکثر تعلیم یافتہ روسیوں کا، یعنی وہ کُشت و خون پر افسوس کرتا تھا، دونوں فریق میں سے کسی کے ساتھ اسے اخلاقی ہمدردی نہ تھی اور لڑائی کے انجام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ جب ۱۹۱۷ میں انقلاب کے آثار نظر آئے تو گورکی جاگ اُٹھا اور انقلاب کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گیا۔ لیکن انقلاب کے فلسفے کا وہ اتنا شیدائی نہ تھا، اور انقلابیوں کی سیاست سے اس کو ایسا اتفاق نہ تھا کہ وہ اس تحریک میں اپنی شخصیت کو محو کر دے اور اس کی حیثیت ایک اعلیٰ مرتبہ سرپرست اور نکتہ بیں ہمدرد کی سی رہی۔ انقلاب کے رہبروں کو یہ بات پسند نہ تھی اور وہ اس پر اکثر اُلجھتے تھے، لیکن اِس نے روسی ادب اور تہذیب کی آبرو رکھ لی اور ترجمے کے ان اداروں نے جو گورکی نے اپنا اثر ڈال کر قایم کرائے بہت سے انشا پردازوں کو فاقے سے بچا لیا۔ تصنیف کے لیے تو ظاہر ہے یہ زمانہ موزوں نہ تھا، گورکی نے صرف تین کتابیں اور لکھیں، جن میں سے ایک میں تالستائی، کورولنکو، چخوف اور آندریے یف وغیرہ سے اس کی جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے کچھ حالات ہیں، دوسری

کتاب "میری تعلیم گاہیں" اور تیسری "روزنامچہ" ہے۔ ان میں جگہ جگہ پر افسانے اور ناول کا رنگ دکھائی دیتا ہے، لیکن ہیں وہ متفرق مضامین، جن میں کمال دکھایا گیا ہے تو بڑھاپے کے آثار بھی بہت صاف نظر آتے ہیں
روس کے مشہور گویّے شلیاپن نے گورکی کے انتقال پر ایک مضمون لکھا جس میں اس نے گورکی سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے جو کسی حمام میں ہوئی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ میں گورکی سے پہلے بھی مل چکا تھا لیکن اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ میں کوبڑ نکلا ہوا ہے، سارے بدن پر گھٹے اور داغ پڑے ہیں اور زخموں کے گہرے نشان بنے ہیں۔ شلیاپن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ گورکی پر مصیبتوں کی بے طرح مار پڑی تھی، اس کی طبیعت نے فطرت کے مطابق تعلیم و تربیت کا سہارا لے کر نشو و نما نہیں پائی تھی، اسے اس طرح ٹھوک ٹھوک کر ایک شکل دی گئی تھی جیسے ٹھٹھیرا برتن بناتا ہے اور آدمی اور ادیب کی حیثیت سے اُس کی امتیازی خصوصیت یہی تھی۔ دوسرے غریب سب کچھ جھیلتے ہیں اور اس پر بھی ان کی زبان نہیں کھُلتی، گورکی کو گویائی نصیب ہوئی اور دنیا نے اس کی قدر اس سبب سے کی کہ ادب کے بازار میں ایسا مال آیا نہ تھا۔ روس میں ایسے انشا پرداز بہت کم ہوئے ہیں جنھیں چین سے رہنے اور پیٹ بھر کھانے کو ملا، لیکن ان سب کو تھوڑے بہت عرصے تک شائستگی اور تعلیم سے اثر لینے کا موقع ملا تھا اور تہذیب اور مہذب لوگوں سے

ان کا جو رشتہ قایم ہو چکا تھا اسے افلاس کی تکلیفیں توڑ نہ سکیں۔ وہ اپنی مصیبتیں برداشت کرتے گئے یا ان کے ہاتھوں مر مٹے، بہر حال وہ اس طبقے میں کبھی شامل نہ ہو سکے جس میں سے گورکی اُبھر کر نکلا تھا، ان کا معیار شائستگی کا معیار رہا، غریبی کی پستیوں میں ان کی نظر اخلاق اور تہذیب کی بلندیوں پر رہی۔ گورکی کے ابتدائی افسانے روس کے جاہل اور غریب طبقے کا حال اسی طرح بتاتے ہیں جیسے وہ مٹی اور گھونگھے جو جال کے ساتھ نکل آتے ہیں دریا کی تہ کا۔ اسے اگر شائستگی اور اخلاق کے کسی معیار کا احساس تھا بھی تو اس نے اسے الگ ہٹا کر رکھ دیا، ناظرین کو غریب کے گھر کا منظر دکھانے کے لیے چھت پھاڑ کر نہیں، اسی دروازے سے لے گیا جس سے غریب خود آتے جاتے ہیں، غریب کے دل کا حال بتانے کے لیے اسے شیشے میں رکھ کر نہیں بلکہ غریب کے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دکھایا۔ ایسی صداقت اور بے تکلفی میں بڑی کشش ہوتی ہے اور لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس سے ان کی اپنی آنکھوں کا نور بڑھتا ہے۔

"چلکاش" (۱۸۹۵)، "میرا ہم سفر" (۱۸۹۶) اور "مالوا" (۱۸۹۷) گورکی کے پہلے افسانوں کے مجموعے ہیں، اور یہ زیادہ تر اس آوارہ گردی کی یادگاریں ہیں جو گورکی نے اوڈیسہ اور جنوبی روس میں کی تھی۔ چلکاش ایک بڑا ڈھیٹ اور چلتا ہوا چور ہے۔ اس کے کارنامے اس کے ایک ماتحت اور مددگار کی وجہ سے اور بھی زیادہ شوخ رنگوں

ہیں نظر آتے ہیں، کیوں کہ اس کایہ مددگار ان لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہی جو چوری کرتے وقت مغفرت کی دعائیں بھی مانگتے جاتے ہیں: "مالوا" میں چلکاش کی روح نے معلوم ہوتا ہی کہ عورت کے روپ میں جنم لیا ہی، اور اس کایا پلٹ نے جرأت اور بیبا کی کو دوبالا کردیا ہی۔ "میرا ہم سفر" بالکل ہی الگ قسم کا آدمی ہی۔ وہ ہمّت کے بجائے ذہانت کے کرشمے دکھاتا ہی، طبیعت کی افتاد نے اسے فلسفی، تجربے نے اسے غضب کا مردم شناس بنادیا ہی، وہ اپنے ساتھی کا فلسفیانہ گفتگو سے دل بہلاکر رستہ کاٹنا آسان کردیتا ہی اور بھوک لگتی ہی تو کنجوس سے کنجوس کے یہاں سے بھی روٹی حاصل کرلیتا ہی۔ ان سیرتوں اور ان کے کارناموں میں خاص مزہ اس سبب سے پیدا ہو جاتا ہی کہ ان کی داستان میں گورکی نے آپ بیتی اور جگ بیتی کو ملایا ہی، ان کی دنیا تخیّل کی بنائی ہوئی نہیں ہی، آنکھ کی دیکھی ہوئی ہی اور اس میں اصلیت کا سارا رنگ روپ ہی۔

"مالوا" کے بعد "سابق انسان" کے عنوان سے افسانوں کا جو مجموعہ گورکی نے شایع کیا اس کا موضوع اور ہی، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کی دنیا اور ہی۔ اس میں ہمیں ایسی سیرتیں نہیں ملتیں جو ہمّت کرکے دشواریوں کا مقابلہ کرتی ہیں، کسی اور طرح سے ممکن نہیں ہوتا تو چوری اور بدمعاشی سے پیٹ پالتی ہیں اور ضمیر سے دبتی ہیں نہ پولیس اور قانون سے۔ سابق انسان وہ لوگ

ہیں جنھیں بھوک اور جاڑے نے انسانیت کی ہر صفت سے خالی کردیا ہی، مگر ان کا صبر اور بے حسی ایسی ہی کہ وہ بھوک اور جاڑے کے مارے بھی نہیں مرتے۔ گورکی خود بھی انھیں سابق انسانوں میں شامل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور ان کی سیرتیں اور حالات بیان کرتے وقت وہ تہذیبی اور اخلاقی حس کو اپنے ذہن میں اسی طرح معدوم کردیتا ہی جیسے کہ وہ اس زمانے میں واقعی تھا۔ وہ شکایت کا ایک حرف زبان پر نہیں لاتا، مظلوموں کی فریاد ہم تک نہیں پہنچاتا اور یہی انداز، جسے کوئی بے حسی کہے گا اور کوئی خودداری، دراصل اس معاشرتی نظام کو درہم برہم کردینے کی سب سے قوی دلیل بن جاتی ہی کہ جس میں انسان اس طرح آدمیت سے محروم ہوجائیں۔ گورکی نے غم کو آنسوؤں میں بہا دیا ہوتا، دل میں درد رکھنے والوں کو تڑپتے دکھایا ہوتا تو ہماری شرمندگی بہت کم ہوجاتی۔ لیکن سابق انسان رونے اور تڑپنے والوں میں نہیں۔ ان کی روحانی کیفیت کا نمونہ انھیں میں کی ایک لڑکی ہی جو دن بھر ایک ٹوٹی کشتی میں چھپی بیٹھی رہتی ہی اس لیے کہ اس کے پاس بدن ڈھکنے کو دو چار چیتھڑوں کے سوا کچھ نہیں، اندھیرے میں کتوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈھونڈھتی پھرتی ہی کہ زمین پر کوئی کھانے کی چیز پڑی ہو تو مل جائے اور آدمی کی آہٹ سن کر ایسی بھاگتی ہی کہ جنگلی جانور دیکھیں تو کھڑے رہ جائیں۔

گورکی کے پہلے دور کا کارنامہ "چھبیس اور ایک" ہی۔ یہ قصہ

اس وقت کا ہے جب گورکی نان بائی کے یہاں کام کرتا تھا۔ نان بائی کے چھبیس ملازم زمین کے نیچے ایک تاریک کمرے میں جہاں نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا صبح تڑکے سے رات کو دیر تک کام میں لگے رہتے تھے، ان کی تھکن نے بڑھتے بڑھتے آرام کے تصور ہی کو مٹا دیا تھا، زندگی سے انھیں کوئی امید نہ تھی اور وہ ہنسنا تو درکنار بولنا بھی قریب قریب بھول گئے تھے۔ لیکن روز صبح جب ایک لڑکی تازی روٹی خریدنے آتی تھی تو سب سمجھتے تھے کہ ان کی کال کوٹھری میں نور کی ایک کرن پہنچ گئی ہے، اور انھیں ایسی تسلی ہو جاتی کہ وہ دن بھر کی محنت کا خیال کر کے بھی گھبراتے نہ تھے۔ لڑکی بڑی نک چڑھی اور منچلی تھی، وہ بھلا ان بیچارے محنت کے مارے غریب اور بے حس جانوروں کو کیا خاطر میں لاتی، وہ جب کبھی آتی تو دو چار گالیاں دیتی، ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور چلی جاتی۔ اس پر بھی اس کی جوانی اور شوخی نے ان کے اُداس دلوں پر ایسا جادو کیا کہ وہ اسے عصمت اور پاکیزگی کا مجسمہ سمجھتے تھے، اس کی بے پروائی پر وجد کرتے تھے اور زبان سے چاہے کچھ نہ کہہ سکتے ہوں وہ حقیقت میں اسی کو دیکھ کر اپنی انسانیت کا یقین کر سکتے تھے۔ ان کی عمریں شاید اسی معصوم عقیدت مندی میں کٹ جاتیں اگر ایک رنگیلا آدمی جسے اپنی صورت پر ناز تھا اور جسے عورتوں کی اندھا دُھند قدر دانی نے بہت مغرور کر دیا تھا ان کا نگراں مقرر نہ ہوتا۔ یہ شخص ہر وقت اپنی فتوحات کا ذکر کر کے ان غریبوں کو طعنے دیا

کرتا تھا اور جب وہ اس کی باتوں سے عاجز آ گئے تو کسی کی زبان سے نکل گیا کہ عورتیں ہر طرح کی ہوتی ہیں، کسی کو اپنی عصمت کا خیال ہوتا ہے کسی کو نہیں ہوتا۔ یہ کہدینا غضب تھا، نگراں نے جرح کرکے پتہ چلالیا کہ وہ اس لڑکی طرف اشارہ کر رہا ہے جو روز صبح روٹی خریدنے آتی ہے، اور اس کا مطلب ہے کہ وہ اس کے جیسے آدمیوں کے فریب میں آنے والی نہیں۔ نگراں نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ لڑکی اسے کچھ خاص طور پر پسند نہ تھی، اور وہ تھی بھی حقیقت میں معمولی صورت شکل اور اوچھی طبیعت کی لڑکی۔ لیکن اب جو مردانگی کی آبرو کا معاملہ تھا تو نگراں نے داؤں پیچ کرنا شروع کردیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نگراں نے لڑکی کے چھبیسوں پرستاروں سے کہدیا کہ وہ فلاں جگہ پر فلاں وقت میرے پاس آنے والی ہے۔ ان لوگوں کو اس کی بات کا یقین نہ آیا، مگر وہ نکلی سچی، ایسی سچی کہ یہ بھولے بھالے لوگ بھی شک اور انکار نہ کرسکتے تھے۔ اس کا انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ یہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی غریبی اور بیچارگی کو بھول گئے، لڑکی جب خلوت کی جگہ سے نکلی تو انھوں نے دوڑ کر اسے گھیر لیا، منہ سے تو بول نہ پھوٹا، لیکن طرح طرح کے اشاروں سے اور آوازوں سے اُنھوں نے اپنا غم اور غصہ ظاہر کردیا۔ لڑکی ایسی ڈھیٹھ اور بے حس تھی کہ اس نے نصیحت اور ملامت کی اس بھدی اور مضحک کوشش سے ذرا بھی اثر نہ لیا، اور ان کے حلقے کو توڑ کر گالیاں دیتی ہوئی چلدی۔ اسے کیا معلوم تھا

کہ اس کی مراد پوری ہوئی ہی تو ان غریبوں پر آسمان پھٹ پڑا ہی، اور معلوم بھی ہوتا تو کیا وہ ان کی خاطر اپنی طبیعت بدل دیتی۔ اب یہ بیچارے چھبیسوں اپنے کام پر واپس چلے گئے، ہر ایک کی کمر اور زیادہ جھک گئی تھی، ہر ایک کو زمین پر سے نگاہیں اُٹھاتے اور ڈر لگتا تھا، اور دلوں پر ایسی مُردنی چھائی تھی کہ جس سے موت کا بھی دم اُلجھتا۔

اس طرح کی حقیقت نگاری چاہے جتنی ادبی خوبیاں اور اخلاقی مصلحتیں رکھتی ہو، انسان کبھی نہ کبھی یہ ضرور محسوس کرتا ہی کہ یہ ایک بند گلی ہی، اسی میں رہ جانا ہو تو خیر، ورنہ آگے جانے کے لیے تو کوئی دوسرا رستہ تلاش کرنا ہوگا۔ دنیا کے دُکھ درد کی داستانیں سُنا کر خاموش ہو جانا ممکن ہی، لیکن بار بار یہی کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ آہستہ آہستہ یہ رویّا ایک اخلاقی حبس پیدا کر دیتا ہی اور داستان سُننے سُنانے والے دونوں کی طبیعت چاہتی ہی کہ مذہب، فلسفے یا کچھ اور نہ ہو تو جنون کی ہوا آکر اس حبس کو دور کرے۔ گورکی کو پانچ چھ سال تک حقیقت نگاری کرنے کے بعد خود ہی ایسے فلسفے کی فکر دامن گیر ہوئی جو انسان کو مصیبت اور تکلیف کے دریا کے پار پہنچا سکتا ہی اور ممکن ہی اسے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ وہ زندگی جس کی تصویر اس نے اُتاری تھی بغیر کسی سہارے کے قائم نہیں رہ سکتی۔ ڈراما نویسی کی اس شاہ کار میں جس کا ذکر روسی ڈراما کے سلسلے میں آیا ہی اس نے پہلی دفعہ اخلاقی تسلّی کا ذریعہ ایک اَن پڑھ فلسفی کو بنایا اور پھر آپ اپنا فلسفی

بننے کی دُھن میں لگ گیا۔ اسی سلسلے میں اس نے افسانوں کے بجائے ناول لکھنا شروع کیا۔ لیکن "بچپن" اور "غیروں میں" کے سوا اس کے تمام ناول ابتدائی افسانوں کے مقابلے میں بہت گرے ہوئے تھے، اور ایک نئے خدا کو بنا کر کھڑا کرنے کی جو کوشش اس نے "شہرا وکوردف" میں کی وہ خاصی مضحک ثابت ہوئی۔ فلسفے اور شاعری کے لیے اس کی طبیعت بالکل موزوں نہ تھی، ناولوں میں بھی جہاں اس نے اس خاص میدان کو جس میں اس نے آوارہ گردی کی تھی چھوڑا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے: "فوما گوردے یف" (۱۸۹۹)، "تین آدمی" (۱۹۰۱) "ماتویئی کوزمیاکن" (۱۹۱۱) صرف ایک حد تک کامیاب ہیں اور یہ حد وہی ہے جو گورکی کی آپ بیتی کی ہے۔ "بچپن" اور "غیروں میں" وہ پھر اُسی دنیا میں واپس چلا گیا جس کے چپے چپے سے وہ واقف تھا، اور اس سفر سے وہ بڑی قیمتی یادگاریں ساتھ لایا۔

فلسفے کے ساتھ گورکی نے انقلابیات میں طبع آزمائی کی، اور اس کا ناول "ماں" (۱۹۰۷) ایک زمانے میں انقلابی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن جب انقلاب واقعی عمل میں آیا تو اندھا بھی دیکھ سکتا تھا کہ گورکی کے تخیل کو اس رستے کی منزلوں کا اور نشیب و فراز کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا، اور اب یہ ناول اُستاد کی غلطیوں میں شمار ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ادیب کی حیثیت سے گورکی کی

خاص خدمت یہ تھی کہ اس نے اس طبقے کی نمایندگی کی جو تہذیب اور مہذب لوگوں کی توجہ سے محروم رہا تھا اور انقلابی حلقوں میں وہ پُرانی تہذیب کی نمایندگی کرتا رہا۔ اس سے اس کی شخصی عظمت تو بڑھی لیکن اس ماحول سے جُدا ہوکر جس میں اس کے ذہن نے پرواز کی پہلی مشق کی تھی وہ افسانہ یا ناول نویسی کے کارنامے دکھا نہیں سکتا تھا اور تہذیبی رہبر بننے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ تھی۔ بیسویں صدی کے شروع سے جب اس کے انقلابی تحریک سے تعلقات قایم ہوئے اسے آدمی کی حیثیت سے ایک دنیا میں، ادیب کی حیثیت سے دوسری دنیا میں رہنا پڑتا تھا، اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ وہ انھیں ملاکر ایک نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ اس کا دنیا کا رہا نہ اُس کا، اور آخر میں اس نے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ انقلاب کے بعد کی زندگی کا رنگ ایسا تھا کہ کاغذ پر چڑھتا ہی نہ تھا، اور اُس وقت پُرانی زندگی کی یاد تازہ کرنا بے سود بھی تھا اور نامناسب بھی۔

گورکی کا سن بھی ایسا نہ تھا کہ افسانہ یا ناول نویسی کی کوئی نئی طرح ڈالے۔ وہ انشا پردازوں کا سرپرست تو رہا، لیکن ان کی رہبری کا اس نے حوصلہ کیا بھی تو اس قدر نہیں کہ انقلابی دور کی انشا پردازی میں اس کی شخصیت اور مذاق کا خاص اثر دکھائی دے۔ اور سب پہلوؤں کا خیال کیجیے تو یقین

بھی ہو جاتا ہے کہ حزیں کا رونا صحیح تھا۔ کیا معلوم قلم اور تلوار کا مقابلہ ہو جاتا، تصویر کا رنگ انقلابی تعلیم سے میل نہ کھاتا، اور بے موقع بات کہہ دینے سے انشا پردازی کی رسوائی ہوتی۔

اصطلاحات پیشہ وراں۔ جلد اوّل و دوم

یہ بہت ہی قابل قدر کتابیں ہیں۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا
کہ ہماری زبان میں کیسا کچھ خزانہ بھرا پڑا ہی جو ہماری غفلت سے ناکارہ اور
زنگ آلودہ ہو گیا ہی پہلے حصّے میں تیاری مکانات اور تہذیب و آرائش
عمارات کے ذیل میں بیس پیشوں کی اصطلاحات ہیں۔ دوسرے حصّے
میں تیاری لباس و تزئین لباس کے ذیل میں پچیس پیشوں کی اصطلاحیں
بیان کی گئی ہیں۔ ہر اصطلاح کی مناسب تشریح کی گئی ہی اور حسب ضرورت
ذہن نشین کرنے کے لیے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ باقی حصّے زیر ط
ہیں۔ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب نے سالہا سال ک
کی ہیں۔ ہر ادیب کی میز پر اور ہر کتب خا
قیمت حصّہ اوّل مجلّد عہ؍ غیر مجلد عہ ۱۲؍ ح

انجمن ترقی اُردو (ہ